سراج الاسلام

خصوصی اشاعت

بیاد: استاذ العلماء حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نور اللہ مرقدہ

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

مدیر تحریر: محمد عرفات اعجاز اعظمی

مدیر مسئول: مولانا محمد راشد اعظمی

معاون مدیر: مولانا محمد اشہد اعظمی

مرکز اشاعت

مدرسہ سراج العلوم، سراج نگر، چھپرہ، ضلع مئو (یوپی) 276129

EMAIL: arfatazmi89@gmail.com

مجلّہ سراج الاسلام غیر مؤقت

خصوصی اشاعت

بیاد: استاذ العلماء حضرت مولانا افضال الحق جوہرؔ قاسمی نور اللہ مرقدہ

بانی

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

مدیر تحریر: محمد عرفات اعجاز اعظمی

مدیر مسئول: مولانا محمد راشد اعظمی

معاون مدیر: مولانا محمد اشہد اعظمی

مرکزِ اشاعت:

مدرسہ سراج العلوم، سراج نگر، چھپرہ، ضلع مئو (یوپی) 276129

EMAIL: arfatazmi89@gmail.com

مجلّہ سراج الاسلام

سراج نگر
چھپرا
ضلع مئو

غیر مؤقت

بانی: عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ

زیر نگرانی: مولانا ابرار الحق قاسمی صاحب ناظم مدرسہ سراج العلوم

مجلس مشاورت
مولانا ابرار الحق قاسمی صاحب ناظم مدرسہ ہذا
مولانا قاری سیف الدین اعظمی صاحب استاذ مدرسہ ہذا
مولانا نوشاد احمد صاحب استاذ مدرسہ ہذا

قیمت خصوصی نمبر: ۱۱۰؍روپے

ترسیل زر کا پتہ: مولانا افتخار احمد صاحب
MADRASA SIRAJUL ULOOM SIRAJNAGAR
P.O. CHHAPRA DISTT: MAU (U.P.)
PIN:276129

ملنے کا پتہ
مولانا ڈاکٹر محمد رشاد احمد قاسمی صاحب
منتظم: مدرسہ دار العلوم رحیمیہ رگھولی گھوسی ضلع مئو
Mob-8004746643

Mob:9450732959-9936029463-9936391085

علم وفن کے لیے طائر نہیں شہباز ہے تو
دست قدرت کا عطیہ نہیں اعجاز ہے تو

جوہرؔ قاسمی

فہرست مضامین

نمونۂ نگارشات:

انتخاب نغمات:

اختتامیہ:

❑❑❑

ادار یہ

حرفِ چند

محمد عرفات اعجاز اعظمی

حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہرؔ قاسمی نوراللہ مرقدہ کے انتقال کو ساڑھے تین سال کے قریب ہو چکے ہیں مگر آج بھی ان کا ذکر زبانوں پر تازہ اوران کی یاد سے دل و دماغ معطر ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہیں، ان کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے بات کررہے ہیں، اپنے خاص انداز میں سمجھا رہے ہیں، ملی مسائل پر اپنی نپی تلی صائب رائے سے نواز رہے ہیں، واقعات ولطائف کی پھلجڑیاں چھوڑ رہے ہیں، ہنسنے پر، مسکرانے پر بسا اوقات قہقہہ لگانے پر آمادہ کررہے ہیں۔ ایک مجلس ختم ہوتی ہے تو دوسری مجلس میں بلاتے ہیں۔ احادیث کی تفہیم کرتے ہیں، تفسیری رموز بیان کرتے ہیں، تکوینیات کے ادق اور الجھے ہوئے مسائل کو اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں اور مشاہد روزمرہ کی مثالوں سے حل کرتے ہیں۔ ذرا طبیعت بوجھل ہوئی تو کلام موزوں کا سلسلہ چل پڑا۔ خوب سے خوب تر اشعار سے نوازا، طبیعت کھل گئی، انشراحِ قلب حاصل ہو گیا تو پھر علمی مجلس لگا دی اور علمی وتحقیقی رموز ونکات حل کرنے بیٹھ گئے۔ غرض آج کل شب وروز ان کی مجلس میں حاضری رہتی ہے اور وہ دامن مراد کو علم وجستجو اور تجربات کے موتیوں سے بھرتے رہتے ہیں۔

مولانا جوہر قاسمی ۹۰؍سال اس عالم رنگ وبو کی رونق بزم رہے ہیں، اور بامقصد، جہد و عمل سے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ ان کی خدمات کے وسیع کینوس پر ملت اسلامیہ کے تعلق سے خدمت کا ہر رنگ جھلکتا ہے۔ انہوں نے افراد سازی کرکے ملت اسلامیہ کو بہترین افراد بھی دیے اور سماجی خدمات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی خدمت کا دائرہ کسی خاص تنظیم یا پلیٹ فارم

تک محدود نہیں بلکہ ضمیر کے اطمینان کی شرط کے ساتھ انہوں نے ہر تنظیم اور پلیٹ فارم سے ملت اسلامیہ ہندیہ کی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے۔بعض سماجی وملی تنظیم کی انہوں نے سربراہی بھی کی، اور بعض جماعت کے لیے انہوں نے بنیاد کی اینٹ کا کام کیا ہے۔یعنی اس کی پوری عمارت کا ڈھانچہ مولانا ہی کے تیار کردہ خاکہ پر قائم تھا مگر افسوس کہ آج ان کے ساتھ بنیاد کی اینٹ جیسا ہی سلوک کیا جارہا ہے۔یعنی ان کو فراموشی کی سان پر چڑھا دیا گیا ہے۔ان کی بے لوث خدمات کا احساس تو ان کے جاننے والے جتنے ہیں سب کو ہے مگر یہ احساس ابھی تک تشنۂ اعتراف ہے۔ دیکھئے ہمارے زود فراموشی کے پتھر پر کب جونک لگتی ہے؟اور اس اونٹ کی کروٹ درست سمت میں کب ہوتی ہے؟۔

والدمحترم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ نے جب مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرا ضلع مئو کو اپنے قیام کے شرف سے نوازا اور مستقل یہیں سکونت اختیار کر لینے کا ارادہ کرلیا تو یہاں سے ایک سہ ماہی رسالہ ''سراج الاسلام'' کے نام سے جاری کیا،جس کا پہلا شمارہ حضرت مولانا زین العابدین معروفی نوراللہ مرقدہ پر خصوصی اشاعت کی صورت میں منظر عام پر آیا۔اس کے داریئے میں جو خاکہ والد صاحب نے پیش کیا تھا وہ یہ ہے:

''یہ پہلا شمارہ ہے جو استاذی واستاذ العلماء حضرت مولانا زین العابدین المعروفی علیہ الرحمہ پر خصوصی اشاعت ہے،اس خاص نمبر کی سب سے اہم اور خصوصی چیز حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی خودنوشت سوانح ہے جو پہلی مرتبہ شائع ہورہی ہے۔اس کے بعد دوسرا شمارہ ان شاءاللہ حضرت مولانا محمد ابوبکر صاحب غازی پوریؒ سے متعلق ہوگا۔اور تیسرا شمارہ استاذ محترم حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب جوہر قاسمی علیہ الرحمہ کی یادگار میں ہوگا۔اللہ تعالیٰ توفیق دیں اور قبول فرمائیں۔آمین''

والد صاحب کے اسی ارادہ کی تکمیل کی جانب یہ خصوصی شمارہ پہلی پیش رفت ہے۔ارادہ ہے کہ یہ رسالہ جس کی بنیاد والد صاحب نے ڈالی تھی،اس فرق کے ساتھ اسے بھی زندہ رکھا جائے گا کہ یہ پہلے سہ ماہی تھا،اب غیر مؤقت ہوگا۔جب بھی اسباب ووسائل مہیا ہوجائیں گے رسالہ

شائع کیا جائے گا۔اور جب ہر اعتبار سے اطمینان ہو جائے گا تو پھر اسے سابقہ حالت یعنی سہ ماہی کی صورت دیدی جائے گی۔ یہ کام محض خدا کے فضل اور آپ حضرات کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔

۶/ مارچ ۲۰۱۶ء کو مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرا میں بانی مدرسہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ کی یاد میں ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا تھا، جس میں خاص طور سے حضرت مولانا کے تلامذہ اور متعلقین کی ایک بڑی جماعت نے شرکت کی تھی۔اس جلسہ میں حضرت مولانا کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک کتاب بنام''سراپا اعجاز: حیات وخدمات حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔الحمدللہ جلسہ بھی بہت کامیاب رہا اور کتاب بھی بے حد مقبول ہوئی۔ حضرت مولانا کے تلامذہ اور متعلقین نے اس کام پر اپنی خصوصی دعاؤں سے نوازا۔**فللہ الحمد والشکر**

جلسہ کے موقع سے یہ تجویز پاس ہوئی کہ حضرت مولانا کے تشنہ تصنیفی سلسلہ کو آگے بڑھایا جائے اور اسے تکمیل تک پہونچایا جائے (تجویز کا خاکہ اس کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں) یہ خصوصی شمارہ اسی تجویز کی عملی صورت ہے۔اب اس تجویز کی توسیع کر کے حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نوراللہ مرقدہ کی تحریروں کو بھی ان کے وارثین کی اجازت سے اس میں شامل کرلیا گیا ہے۔فی الحال مولانا جوہر قاسمی کے شخصیات پر لکھے مضامین پر کام چل رہا ہے، جلد ہی ان شاءاللہ یہ مطبوع ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہوگا۔

اس سلسلہ میں ایک اہم گزارش یہ ہے کہ مولانا جوہر قاسمی کے رسالہ ''دانشور'' کے بہت سے شماروں تک ابھی تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی ہے۔آپ حضرات سے درخواست ہے کہ اگر کسی صاحب کے پاس دانشور کوئی بھی شمارہ ہو تو وہ ہمیں ضرور اطلاع کریں۔نقل حاصل کرنے کے بعد اصل بحفاظت تمام لوٹا دیا جائے گا۔یا اگر کسی صاحب کی نظر سے کسی پرانے رسالے میں مولانا کی کوئی بھی تحریر گزری ہو تو اس سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔آپ کا یہ علمی تعاون ہمارے اوپر احسان کے مترادف ہوگا۔

اس خصوصی شمارہ کو عملی صورت میں لانے میں جن حضرات نے تعاون کیا ہے،ہم ان کے شکر گزار ہیں، خاص طور سے حضرت مولانا جوہر قاسمی کے صاحبزادگان مولانا ڈاکٹر محمد رشاد قاسمی صاحب، مولانا محمد راشد قاسمی صاحب، مولانا کے حفید رشید مولانا ڈاکٹر محمد عمار قاسمی صاحب اور تمام مضمون نگار حضرات کے شکر گزار ہیں جن کے تعاون سے اس صورت میں یہ خصوصی شمارہ پیش کر سکے ہیں۔ **فجزاهم الله احسن الجزاء**

❑❑❑

ابتدائیہ:

حمد باری تعالیٰ

از: استاذ العلماء حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہرؔ قاسمی

حسن کے کوچہ و بازار میں جلوہ تیرا عشق کی وادئ کہسار میں سودا تیرا
زندگی کیا ہے؟ عمارت مری ، نقشہ تیرا رنگ میرا ہے ہر افسانے میں خاکہ تیرا
میرے مالک میری تقدیر بنانے والے
میں نے دیکھا ہے ہر ایک موڑ پہ جلوہ تیرا
مجھ گنہ گار پر اٹھ جائے محبت کی نظر حاصل عمر سمجھتا ہوں وہ لمحہ تیرا
غیرت علم تری آن نہ جانے پائے کسی فرعون سے دب جائے نہ موسیٰ تیرا
ہر اندھیرے میں چمک جاتی ہے چنگاری سی بے سہاروں کو جو ملتا ہے سہارا تیرا
بن ہی جاتے ہیں تراشے ہوئے اصنام خدا مجھ سے ہوگا نہ کسی اور کو سجدہ تیرا
زندگی میں کئی پیوند لگا کرتے تھے جانے کس ہاتھ سے لگ جائے تراشہ تیرا
دولت وعظمت وحکمت کے صنم خانوں سے اٹھ گیا جھاڑ کے دامن کوئی شیدا تیرا
کل کی باتوں سے بھی اٹھتا نہیں پردہ جوہرؔ
حل نہیں ہوگا زمانہ سے معمہ تیرا

❑❑❑

عکسِ ذات:

سوانحی نقوش

نام: محمد افضال الحق قاسمی ابن امین الحق ابن شاہ عبدالرحیم فضلی
تخلص: جوہر قاسمی
والد کا نام: مولانا امین الحق قاسمی
سن پیدائش: ۱۹۲۳ء
وطن: رگھولی ضلع مئو، اتر پردیش۔ مولانا کا آبائی وطن قاری سات ضلع مئو ہے، حاجی عبدالرحیم فضلی صاحب کے والد محترم واجد علی خان صاحب اپنے نانیہال یعنی رگھولی میں آباد ہو گئے تھے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا تھا۔

مکتب کی تعلیم:

مولانا کے دادا حاجی عبدالرحیم فضلی صاحب فیض آباد کی پولس لائن مسجد میں قیام پذیر تھے۔ مولانا نے انہیں کے زیر سایہ ابتدائی تعلیم یعنی مکتب و فارسی و عربی کی کافیہ تک تعلیم حاصل کی۔

متوسطات عربی کی تعلیم:

پھر دارالعلوم مئو چلے آئے اور یہاں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک تعلیم حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند چلے گئے اور وہاں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک رہے۔

فراغت:

۱۹۴۱ء مطابق ۱۳۶۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کی خدمت میں تفسیر پڑھنے کے لئے لاہور گئے۔

شادی:

۱۹۴۱ء مطابق ۱۳۶۰ھ میں دوران تعلیم ششماہی امتحان کے بعد آپ کی اور آپ کے بڑے بھائی مولانا ضیاء الحق صاحب قاسمی کی شادی ایک ساتھ ہوئی۔آپ کی شادی ماموں زاد بہن سے فتح پور تال نرجا ہوئی تھی۔جنوری ۱۹۶۶ء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہوا،اور آپ نے دوسری شادی اکتوبر ۱۹۶۸ءمیں بلولی ضلع مئو میں کی۔دوسری اہلیہ الحمدللہ ابھی حیات سے ہیں۔

تدریس کی ابتدا:

تدریس کی ابتدا جامع العلوم جین پور سے ہوئی۔فراغت کے بعد مولانا کے والدمحترم مولانا امین الحق قاسمی صاحب کے رفیق درس مولانا عبدالحکیم صاحب کے اصرار پر جامع العلوم پڑھانے کے لیے گئے اور ایک سال یعنی ۱۹۴۲ء تک وہاں رہے۔

نورالعلوم بہرائچ:

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک مدرسہ نورالعلوم بہرائچ میں مولانا حمیدالدین صاحب کی سرپرستی میں مختلف علوم کی کتابیں پڑھائیں۔

مدرسہ فرقانیہ گونڈہ:

۱۹۵۰ء میں مدرسہ فرقانیہ بحیثیت مہتمم تشریف لے گئے اور ۱۹۶۷ء تک وہاں رہے۔ ان سترہ سالوں میں مولانا نے فرقانیہ کو فرش سے عرش تک پہونچایا،اوراس مدرسہ کا ترقی کے بام عروج تک پہونچنا مولانا ہی کے رہین احسان ہے۔

دارالعلوم مئو:

فرقانیہ کے بعد ۱۹۶۷ء میں سات آٹھ ماہ گھر پر رہنے کا اتفاق ہوا۔اس مدت میں عارضی طور سے دارالعلوم مئو میں تدریس کی خدمت انجام دی۔

مدرسہ امدادالعلوم میرٹھ:

۱۹۶۸ء مطابق ۱۳۸۸ھ میں بحیثیت مہتمم مدرسہ امدادالعلوم میرٹھ تشریف لے گئے اور ایک سال یہاں رہے۔

مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ:

۱۹۶۹ء میں مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ میں شیخ الحدیث اور صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے اور ۱۹۷۱ مطابق ۱۳۹۱ھ تک یہاں رہے۔ امروہہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے تدریس کا سلسلہ منقطع رہا اور آپ جمعیۃ علما ہند سے متعلق رہے۔

دارالعلوم رحمانیہ حیدرآباد:

جمعیۃ علما کے کام سے فراغت کے بعد پھر تدریس کا سلسلہ استوار ہوا اور ۱۹۷۲/۷۱ میں بحیثیت صدر مدرس دارالعلوم رحمانیہ حیدرآباد تشریف لے گئے اور غالباً ایک یا دو سال وہاں رہے۔

مدرسہ انوارالعلوم مہوا بسم اللہ گونڈہ:

پھر مہوا بسم اللہ گونڈہ آئے۔ مہوا بسم اللہ کے بعد پھر جمعیۃ علما سے کچھ دنوں کے لیے متعلق ہو گئے۔ جمعیۃ کے کام سے فراغت کے بعد پھر مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ تشریف لے گئے۔

ریاض العلوم گورینی:

۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۹ء تک ریاض العلوم گورینی میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔

دارلعلوم گورکھ پور:

۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۹ء کے شروع تک دارالعلوم گورکھ پور میں بحیثیت مہتمم رہے۔ پھر گھر آ گئے اور تادم واپسیں گھر ہی قیام پذیر رہے۔

دارالعلوم دیوبند کا عبوری دور:

دارالعلوم دیوبند میں کیمپ کے زمانے میں آپ ناظم تعلیمات رہے ہیں اور مسلم شریف کا درس آپ سے متعلق رہا ہے۔

بیعت وسلوک: شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ

جمعیۃ علما ہند سے تعلق:

مولانا کو جمعیۃ علما ہند سے والہانہ تعلق اور اس سے وابستگی ابتدا ہی سے تھی۔ مولانا اسعد مدنی صاحب کے دور صدارت میں بعض اختلافات کی وجہ سے آپ نے جمعیۃ سے علیحدگی اختیار

کر لی۔ جمعیۃ علما سے علیحدگی کے بعد ملی جمعیۃ کا قیام عمل میں آیا، اور مولانا اس کے اہم ذمہ دار رہے۔

مرکزی جمعیۃ سے تعلق:

۱۹۹۲ء میں مرکزی جمعیۃ قائم ہوئی۔ مولانا تاحیات اس کے تیسرے صدر رہے ہیں۔

سفر حج:

مولانا نے کل تین حج کئے۔ پہلا حج ۱۹۷۹ء میں پانی کے جہاز سے کیا۔ ۱۹۸۸ء میں دوسرا حج فرمانروائے سعودی عرب کی دعوت پر کیا۔ اس حج میں آپ کے ساتھ مولانا اسرارالحق صاحب ممبر پارلیامنٹ تھے۔ تیسرا حج وزارت اوقاف کی طرف ۱۹۹۶ء میں کیا۔ اس حج میں مولانا فضیل قاسمی صاحب جنرل سکریٹری مرکزی جمعیۃ دہلی آپ کے ساتھ تھے۔

سفر عمرہ:

مولانا نے کل آٹھ عمرے کیے۔ ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۹۸۸ء میں وزٹ ویزے پر آپ سعودی عرب تشریف لے گئے اور رمضان المبارک میں عمرہ ادا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۳ء میں ایک عمرہ کیا۔ آخری عمرہ ۲۰۰۵ء میں کیا۔ ۱۹۹۳ء سے ۲۰۰۵ء کے درمیان کل سات عمرے کیے۔

تصنیفات وتالیفات:

(۱) اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کے عائلی مسائل کے حل کے لئے شرعی پنچایت یا قاضی؟

(۲) دلائل حنفیہ [احناف کی طرف سے غیر مقلدین کے جوابات]

(۳) یسریٰ [فن منطق کے بنیادی ابتدائی مسائل پر مشتمل]

(۴) زور بیان

(۵) حسن معانی

(۶) مساوات [کتابچہ]

(۷) نجم سحر [شعری مجموعہ]

(۸) دار ورسن تک [شعری مجموعہ]

مرتب کردہ کتب:

(۱)اسوۃ الحبیب عربی (دوجلد)[اخلاقیات کے لیے مختصر احادیث کا مجموعہ]

(۲)امالی شیخ الاسلام (مرتب غیر مطبوعہ۔تین جلدوں میں)[درس ترمذی کی تقریریں]

رسائل وجرائد کی ادارت:

(۱)ماہنامہ القاسم (۲) ہفت روزہ الجمعیۃ (۳)الریاض گورینی[اس پرچہ کی مجلس ادارت میں آپ کا نام شامل تھا اور اس پرچہ کے ابتدائی ایام میں سالوں تک ادارت کی جو ذمہ داری ہوسکتی ہے وہ آپ ہی نے نبھائی ہے۔گویا معنوی اعتبار سے آپ ہی اس کے مدیر رہے ہیں] (۴)ترجمان دارالعلوم دہلی (۵)دانشور گورکھ پور(۶) تذکیر غازی پور(اس رسالے کے آپ مدیر اعزازی تھے)

نسبی اولاد: آپ کی پانچ نرینہ اور دو مادینہ اولاد ہیں۔

(۱) مولانا ڈاکٹر محمد ارشد صاحب (۲۰/۱/۲۰۱۴کو ان کا انتقال ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون آپ نے علی گڑھ سے بی یو ایم ایس کیا تھا اور غازی آباد میں بال بچوں سمیت رہتے تھے)

(۲) ڈاکٹر محمد رشاد قاسمی صاحب (دارالعلوم سے فراغت کے بعد آپ نے علی گڑھ سے بی یو ایم ایس کیا اور یونانی میں ایم ڈی۔بنارس، غازی پور اور بلیا میں آپ کی پوسٹنگ تھی۔۲۰۱۵ء میں ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔مولانا کا قائم کردہ مدرسہ ''دارالعلوم رحیمیہ'' رگھولی جو کہ مولانا کے دادا حاجی عبدالرحیم فضلی صاحب کی یاد میں قائم کیا گیا تھا،اس کی نگرانی آپ ہی کے ذمہ ہے۔یہ مدرسہ ۱۹۸۸ء میں قائم ہوا۔اوراس کی بنیاد حضرت مولانا اور آپ کے شاگرد رشید حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کے ہاتھوں رکھی گئی)

(۳) مولانا محمد راشد قاسمی صاحب (ایک لمبی مدت تک معاش کے سلسلے میں ریاض سعودی عرب رہے۔اب علی گڑھ میں مقیم ہیں)

(۴) محمد عارف خان (علی گڑھ سے بی ایس سی کیا۔رگھولی میں سکونت پذیر ہیں اور دارالعلوم رحیمیہ رگھولی میں تدریس کی خدمت پر مامور ہیں)

(۵) محمد طارق خان (کافیہ تک عربی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ شادی کے بعد فتح پور سسرال میں اقامت اختیار کرلی)

(۶) قدسیہ خانم (جناب ریاض الدین صاحب خالص پوری کے عقد میں ہیں)

(۷) طیبہ خانم (یہ دوسری بیوی سے ہیں۔جناب غیاث الدین صاحب بلولی کے عقد میں ہیں)

وفات: ۳۰؍نومبر۲۰۱۲ءمطابق ۱۵؍محرم الحرام۱۴۳۴ھ۔جمعہ بعد نماز فجر۔چھ بج کر دس منٹ۔

جنازہ وتدفین:

جنازہ کی نماز مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد راشد قاسمی صاحب نے پڑھائی۔جنازہ میں علما،طلبہ اورعوام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔تدفین رگھولی گاؤں کی عوامی قبرستان میں دادا حضرت حاجی عبدالرحیم فضلی نوراللہ مرقدہ کی قبر سے متصل عمل میں آئی۔رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

حضرت مولانا کے اساتذۂ کرام:

(۱) حضرت مولانا ضرغام الدین صاحب مظفرنگری (۲) مولانا اسلام الحق صاحب کوپا گنجی (۳) مولانا میرک شاہ صاحب کشمیری (۴) شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب (۵) شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب (۶) حضرت مولانا مفتی شفیع عثمانی صاحب (۷) حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحب (۸) حضرت مولانا علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی (۹) حضرت مولانا سمیع الحق صاحب (۱۰) مولانا عبدالجلیل صاحب (۱۱) مولانا ریاض الدین صاحب بہاری (۱۲) شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری۔

حضرت مولانا کے رفقائے درس:

(۱) مولانا عامر عثمانی (ایڈیٹر تجلی) مولانا اخلاق حسین دہلوی (۳) مولانا مظہر بقا صاحب کراچی (۴) مولانا سعید صاحب سلطان پوری (۵) مولانا شریف الحسن صاحب (۶) مولانا شمس الدین صاحب مبارک پوری (۷) مولانا نظام الدین صاحب صدر امارت شریعہ

(۸) مولانا شیر محمد، مفتی دارالعلوم مئو (۹) مولانا احمد اللہ صاحب مفتاح العلوم مئو (۱۰) مولانا عبدالصمد صاحب فتح پوری۔

حضرت مولانا کے نامور تلامذہ:

(۱) مولانا عبدالحی چشتی صاحب انجان شہید (۲) مولانا عبدالمنان صاحب باسوپار (۳) مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب (۴) مولانا محمد احمد صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند (۵) مولانا شمس تبریز آروی لکھنؤ یونی ورسٹی (۶) مولانا عطاء اللہ صاحب دیوریاوی (۷) مولانا باقر حسین صاحب بستوی (۸) مولانا رشیدالدین صاحب (۹) مولانا محمد حسن صاحب بستوی (۱۰) مولانا فضل حق صاحب مہتمم احیاء العلوم گوراچوکی گونڈہ (۱۱) مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی۔

عہدہ ومناصب:

مدرسہ حسینیہ چلہ امروہہ اور ریاض العلوم گورینی میں شیخ الحدیث رہے ہیں۔ مدرسہ فرقانیہ گونڈہ، مدرسہ امدادالعلوم میرٹھ اور دارالعلوم گورکھ پور کے منصب اہتمام پر فائز رہے۔ مرکزی جمعیت کے تیسرے صدر رہے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے رکن رہے ہیں۔ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے صدر رہے ہیں۔ مسلم پرنسل لا بورڈ، مسلم کونسل، فقہ اکیڈمی، مسلم مجلس مشاورت کے پروگراموں میں مدعو خصوصی کے طور پر آپ کی شرکت ہوا کرتی تھی۔

❑❑❑

میرے استاذ، میرے محسن
حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب قاسمی نور اللہ مرقدہ

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نور اللہ مرقدہ

وہ عرصہ سے بیمار تھے، بہت دنوں سے صاحب فراش تھے، مدرسہ سے اٹھ کر گھر آ گئے تھے۔ نہیں وہ بیمار نہ تھے لمبی عمر کا ضعف تھا، نسیان کا غلبہ تھا، از خود اٹھنے بیٹھنے سے معذوری تھی۔ تکلم بہت کم ہو گیا تھا، پوچھئے کہ کوئی تکلیف ہے؟ تو فرماتے نہیں، خیریت سے ہیں؟ جی ہاں، بھوک لگتی ہے کھانا کھا لیتے ہیں؟ جی ہاں، جان پہچان کم ہو گئی تھی، ذہن اور دماغ کسی خاص رخ پر لگ گیا تھا، روح عالم دنیا سے کسی اور عالم کی طرف متوجہ ہو گئی تھی، قریبی لوگ بھی حاضر ہوتے تو ایسا لگتا کہ اجنبی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دیکھتے ہی پہچان لیتے، اللہ ہی جانتا ہے کہ کس دنیا میں ہیں، دنیا کی کسی چیز پر دھیان نہ تھا، دھیان دلایا جاتا تو کچھ ''ہاں نہیں'' کہہ لیتے۔ وہ میرے استاذ تھے، میرے محسن تھے، مجھ پر انھوں نے اس وقت دست شفقت رکھا تھا جب کہ میں ہر طرف سے دھتکارا گیا تھا۔ انھوں نے بغیر کسی علت کے مجھ پر مہربانی فرمائی اور میں ان کی محبت وشفقت میں جذب ہو کر رہ گیا۔ میں نے اپنا دستور بنایا تھا کہ ہر ماہ ایک بار خدمت میں حاضر ہوں گا اور پہونچتا تھا، کبھی بیماری کی وجہ سے، یا طویل سفر کی وجہ سے ناغہ بھی ہو جاتا، مگر جب پہونچتا کھل اٹھتے، خوش ہوتے، باتیں نہیں کرتے، میں کچھ کہتا تو ہاں یا نہیں کہتے یا مسکراتے، میں کچھ دیر بیٹھ کر رخصت چاہتا تو فرماتے بیٹھو، پھر میں بیٹھ جاتا، دیر تک بیٹھا رہتا، کچھ نہ فرماتے مگر چہرہ دمکتا رہتا۔

ایک مرتبہ حاضر ہوا تو اس وقت نسیان کا بڑا غلبہ تھا، صاحبزادۂ محترم ڈاکٹر محمد رشاد

صاحب نے تعارف کرایا کہ فلاں آئے ہیں، مسکرا کر فرمایا ''میں انھیں تم سے زیادہ پہچانتا ہوں۔''

اللہ ہی جانے کیا کیفیت تھی، کبھی کوئی اظہار تکلیف نہیں، کبھی کوئی شکایت نہیں، ایک سکینت جیسی سکینت، ایک اطمینان جیسا اطمینان!

میں ان کے پاس بیٹھا چائے پیتا ہوتا، انھیں کھانے پینے کی کوئی چیز پیش کرتا تو خوشی سے قبول کرتے ایک آدھ گھونٹ چائے بھی پی لیتے پھر بس! کھانے کی چیز منھ میں رکھ لیتے مگر وہ حلق سے نیچے نہ اترتی، دیر تک منھ میں لئے رہتے۔

مجھے سفر کرنا ہوتا تو جا کر انھیں دیکھ آتا، سفر سے واپس آتا تو پھر جا کر دیکھتا، برسوں یہی معاملہ چلتا رہا۔ حج میں جانا ہے، حاضر ہوتا، بتاتا، خوش ہوتے، کچھ نہ بولتے، دعا کے لئے کہتا تو دعا کرتے۔ عمرہ میں جانا ہے، جاتا، عرض کرتا، خوب مسکراتے۔ بیمار ہوتا، حاضری میں دیر ہوتی، پہونچتا، اپنی بیماری بتاتا، افسوس کے آثار چہرے پر ظاہر ہوتے۔

انھوں نے اپنے شاگرد سے بہت محبت کی، اپنے بیٹوں کی طرح مانا، بیماری کے آغاز میں دو پوتوں کا نکاح تھا، میرے پاس حکم بھیجا کہ تم آؤ اور نکاح تمہیں پڑھاؤ۔ میں نے پوچھا کہ برات جائے گی؟ اور کہاں جائے گی؟ کہلوایا کہ برات نہیں جائے گی دونوں جگہ سے لڑکی والے آئیں گے اور گھر پر نکاح ہوگا۔ میں گھر پر حاضر ہوا، معذوری شروع ہو چکی تھی، خود سے چل نہیں سکتے تھے سہارا دے کر لوگ مجلس نکاح میں لائے۔ اس دن بہت صاف ستھرا روشن کپڑا پہنے ہوئے تھے، چہرہ دمک رہا تھا۔ میں ان سے بہت ڈرتا تھا، میرے دل پر ان کا رعب بہت تھا، میں سوچنے لگا ان کی موجودگی میں خطبہ نکاح کیوں کر پڑھوں گا؟ ایجاب کے الفاظ کس طرح ادا کروں گا؟ حکم ہوا نکاح پڑھاؤ، میں نے بیٹھ کر خطبہ پڑھنا چاہا، آہستہ سے فرمایا کھڑے ہو کر پڑھو۔ میں نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اور بیٹھ کر ایجاب وقبول کرایا۔ مولانا نے دعا کرائی، صاحبزادۂ محترم ڈاکٹر محمد رشاد صاحب سے گراں قدر ہدیہ دلوایا۔

میں بھی کئی سال سے گردہ کی بیماری میں گرفتار ہوں، کھانا پینا عرصہ سے بند ہے، ہر وقت متلی کا زور رہتا ہے، ضعف بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کے علاج کے لئے بمبئی کا پروگرام بنا، ۱۴ رنومبر ۲۰۱۲ء کا ٹکٹ ہے، باوجود کمزوری اور بیماری کے میں سفر سے دو تین روز پہلے خدمت میں حاضر ہوا،

منھ پر کپڑا ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ میں قریب گیا، سلام کیا، سماعت جواب دے چکی تھی، صاحبزادۂ گرامی محمد عارف نے ذرا بلند آواز سے پکار کر میرا نام لیا، اندر ہی اندر حرکت شروع ہوئی، میں نے دیکھا کہ داہنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں، بڑی مشکل سے ہاتھ نکال پائے۔ میں نے مصافحہ کیا، آنکھیں کھولیں ایک نگاہ کی، پھر آنکھیں بند ہوگئیں، میں کچھ دیر ہاتھ تھامے بیٹھا رہا اور وہ بھی اسی حالت میں پرسکون رہے، کوئی بات نہ ہوسکی۔ میں دھڑکتے دل سے زیارت کرتا رہا، ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا، کچھ دیر کے بعد میں نے رخصتی مصافحہ کیا اور ان کے پاس سے اٹھ آیا۔ دل میں خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی، میں لمبے سفر پر جا رہا ہوں اور علاج طویل المیعاد ہے، اللہ جانے اب زیارت ہو یا نہ ہو۔

دل پر بوجھ لئے وہاں سے واپس آیا صاحبزادوں میں ڈاکٹر محمد رشاد، مولانا محمد راشد اور محمد عارف خدمت میں موجود تھے۔ میں ۱۴؍نومبر کو ممبئی آ گیا، یہاں میرے مرض نے شدت اختیار کی، بالکل ہی صاحب فراش ہوگیا لیکن دل مولانا کی طرف لگا ہوا تھا، جب کوئی فون اپنے علاقہ سے آتا تو دل دھڑک اٹھتا۔ ۳۰؍نومبر کو صاحبزادۂ محترم جناب مولانا محمد راشد صاحب کا فون آیا، کہا، ابا رخصت ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا کہ دل سینے سے باہر آ گیا ہو، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ ایمان کی قوت تھی کہ زبان پر تلقین ربانی انا للہ وانا الیہ راجعون کا وظیفہ جاری تھا۔ میں تڑپ رہا تھا، بہت دور ہوں، بہت بیمار ہوں، بظاہر حاضری کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کے غم کے ساتھ کئی غم یاد آنے لگے، پانچ چھ سال پہلے میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تھا تو میں دہلی میں تھا اور اسی روز عمرہ میں جانے لئے روانگی تھی، بہت بے قرار ہوا لیکن تسلی تھی کہ ایک مبارک اور مقدس جگہ جا رہا ہوں، دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اچھا موقع ملے گا۔ ابھی چند دن پہلے ۲۶؍نومبر کو میرے محبوب دوست مولانا محمد فاروق صاحب کا حیدرآباد میں انتقال ہوا، تو اس وقت بھی محروم رہا۔

ان غموں نے اور بھی دل کو نڈھال کر دیا، پھر اللہ کی مہربانی سے صبر کی کیفیت حاصل ہوئی تو میں نے اپنے بیٹوں کو فون کرنا شروع کیا کہ وہ جنازہ میں ضرور حاضر ہوں۔ میرے نہ ہونے کی تلافی میری اولاد سے ہو۔ مولانا میرے بیٹوں کو بھی بہت چاہتے تھے، بیماری کے دوران میرے

بیٹے بھی حاضری دیا کرتے تھے، جمعہ کا دن تھا میرے پانچ بیٹے حاضر جنازہ ہوئے، میرے تعلق والے، تلامذہ، دوست، احباب بکثرت اس سعادت میں شریک ہوئے۔

مولانا محمد راشد صاحب نے جنازہ کی نماز پڑھائی، میں سوچتا رہا کہ میں ہوتا تو میں یہ شرف حاصل کرتا، کیوں کہ مولانا کو جہاں اختیار ہوتا، میں موجود ہوتا تو امامت کے لئے مجھے ہی آگے بڑھاتے۔ سفر میں حضر میں ہمیشہ کا معمول تھا کہ نماز کی امامت کا شرف اسی شاگرد کو بخشتے۔ مولانا کے صاحبزادگان نے بھی ہمیشہ مجھے اپنا بڑا بھائی ہی سمجھا، باپ، بیٹوں نے میرے ساتھ ایسی محبت کی ہے کہ میں اس کے بیان سے قاصر ہوں۔ یہ حروف لکھتے وقت میری آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔

نماز جمعہ کے بعد ہزاروں کے مجمع نے نماز جنازہ ادا کی، اور دادا محترم، صاحب نسبت بزرگ، حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی کے مرید، حضرت حاجی عبد الرحیم صاحب فضلی قدس سرہ کے پہلو میں اس گنجینۂ خوبی کو لوگوں نے دفن کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

السلام علیکم یا اهل القبور یغفر الله لنا ولکم انتم سلفنا ونحن بالاثر وانا ان شاء الله بکم لاحقون

مولانا اب دنیا میں نہیں رہے، معلوم تھا کہ نہ رہیں گے مگر اس کا خیال کم ہی آتا تھا، جب کوئی مشکل پیش آتی تو ذہن میں رہتا کہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوں گا، ان کی ایک نگاہ لطف دل کو تسلی دے گی اور ان کا ناخن گرہ کشا عقدہ کو کھول دے گا۔ میں انھیں فون نہیں کرتا تھا، مجھے ہمت نہیں ہوتی تھی، ہاں حاضری کا بہت اشتیاق رہتا تھا۔ معمولی معمولی بہانوں سے خدمت میں حاضر ہوتا، گفتگو میں خاصی بے تکلفی ہوتی، ہمیشہ دلداری کرتے، دلنوازی کرتے، آج سوچ رہا ہوں کہ محبت کا یہ تخم کب سرزمین وجود میں بویا گیا تو ایک دھندلا سا نقش ۱۹۶۷ء کا یاد آتا ہے۔ ہم لوگ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں اپنے محبوب استاذ حضرت مولانا عبد المنان صاحب کی خدمت میں ''نور الانوار'' پڑھ رہے تھے کہ دروازہ کے باہر دیکھا کہ ایک دراز قد، بھاری بدن کے عالم شیروانی پہنے ہوئے، بالکل سیدھے قامت کے، چہرہ نہایت بارعب، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے دار الاہتمام کی طرف سے آ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کی نگاہیں

ان کی وجاہت سے بھر گئیں، مولانا بے اختیار اٹھے یہ کہتے ہوئے کہ میرے استاذ مولانا افضال الحق صاحب ہیں! ہم بھی ہڑ بڑا کر اٹھے، سلام کیا، مصافحہ کیا۔ بدن جتنا بھاری تھا آواز اتنی ہی باریک تھی، وہ مصافحہ کر کے آگے بڑھ گئے، مولانا سے کیا کہا آج کچھ یاد نہیں، ہم لوگ بھی سبق پڑھنے میں لگ گئے۔ ان کی اہمیت وعظمت کے لئے یہی بات کافی تھی کہ ہمارے مولانا کے استاذ ہیں۔ یہ پہلی جھلک ہے جو میں نے دیکھی تھی۔

ایک سال ہم طالب علموں نے اپنی حیثیت وحوصلہ سے بڑھ کر ایک منصوبہ بنایا، وہ یہ کہ طلبہ کی انجمن جمعیۃ الطلبہ کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے اس وقت کے عظیم شیخ الحدیث جو مرتبہ کی بلندی کے ساتھ عمر کے آخری مرحلہ سے گزر رہے تھے، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کے شاگردوں میں اس وقت آخری فرد تھے، یعنی دار العلوم کے جلیل القدر شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب علیہ الرحمہ کو دعوت دی گئی۔ ہم لوگوں کی نہ ہمت تھی نہ حوصلہ! یہ تو حضرت الاستاذ مولانا محمد مسلم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرم فرمائی تھی، پھر انھیں کی کوشش تھی کہ حضرت نے دعوت منظور فرمالی۔ حضرت شیخ الحدیث کی تشریف آوری کا جیسے ہی اعلان ہوا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم کا احاطہ وصحن علماء ومشائخ سے بھر گیا، ایک نورانی جلسہ ہوا، اتنا عظیم مجمع ہوا، عقیدت کی اتنی کہکشائیں زمین پر آگئی تھیں کہ پورا ماحول نہیں، پورا علاقہ نور کے جمال سے جگمگا گیا۔ اس نورانی کہکشاں میں پھر وہ علم وفضل کا تابندہ ستارہ نظر آیا جس کی زیارت پچھلے سال ہوئی تھی، حضرت مولانا افضال الحق صاحب کو اب کی اسٹیج پر دیکھا، وہ شیخ الحدیث علیہ الرحمہ کے بارے میں تعارفی کلمات ارشاد فرما رہے تھے، آواز باریک، لہجہ ناصاف، لیکن تعارف بہت مرتب اور سلجھا ہوا، کسی نے اعتراض کیا مگر ہم لوگوں کا سر عظمت سے جھکا رہا۔

معلوم ہوا کہ مولانا گونڈہ میں پڑھاتے ہیں، اس کے علاوہ اور کچھ جاننا یاد نہیں۔ ہم لوگ اسی سال عید کے بعد دارلعلوم دیوبند چلے گئے، وہاں چھ ماہ خیریت سے گزرے، چھ ماہ کے بعد ایک طوفان بلا خیز آیا جس نے ماحول کو الٹ پلٹ دیا۔ اس طوفان میں طلبہ کی ایک خاصی جماعت تلپٹ ہوگئی، دار العلوم سے اخراج ہوا، اور ہندستان کے ہر مدرسہ کا دروازہ ان پر بند کر دیا گیا۔ آندھی کے کوے کی طرح وہ پورے ملک میں چکراتے پھرتے تھے اور نگاہ رحم کو تلاش کرتے

مگر ہر طرف نظرِ گرم سے سابقہ پڑتا تھا۔ ان کی ہمدردی میں کہیں سے کوئی آواز نہ آتی تھی، ہر شخص غصے میں تھا، ہر طرف ملامت کے تیر چل رہے تھے۔ اخبارات طلبہ کے حق میں طنز وطعن کے تیروں سے بھرے آتے تھے، خود جہاں کہیں ان لوگوں کا گزر ہوتا گرم گرم نگاہوں کی حرارت سے سر چکرا جاتا۔ لوگ اس نظر سے دیکھتے جیسے یہ لوگ خونی، دہشت گرد، قزاق اور رہزن ہوں۔ واقعی غلطی تو ہوئی تھی اور بڑی غلطی ہوئی تھی، یہ لوگ مدرسوں کے مصلح نہ تھے، طالب علم تھے اور طالب علم کو علم کی طلب سے کام رکھنا چاہئے، انتظام کی گتھیوں میں خود کو نہیں پھنسانا چاہئے مگر مدرسہ والوں کو اتنا غصہ تھا کہ وہ اعتراف جرم کو بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اپنی غلطی ماننے کے اندر بھی انھیں سازش کی بو آتی تھی۔ اس وقت طلبہ کی ہمدردی میں کہیں سے کوئی آواز آئی تو وہ مولانا افضال الحق صاحب کی تھی، کسی اخبار میں ان کا مضمون آیا کہ یہ بچے ہیں، ان سے غلطی ہوسکتی ہے مگر ان پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہئے، اپنے انتظام کی خامیوں اور کمیوں کا جائزہ لینا چاہئے۔ اسی طرح کا مضمون تھا جو چار دہائیاں گزرنے کے بعد پورا کیوں کر یاد رہے گا۔

دارالعلوم کے اس طوفان بلا خیز کے بعد چھ ماہ تک یہ طلبہ کٹی پتنگ کی طرح چکراتے پھرے، پھر جب رمضان کا مہینہ گزر گیا تو چند طلبہ نے بڑی امیدوں، بڑی توقعات کے ساتھ وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ کے آستانہ مبارک کا رخ کیا، حضرت بہت اخلاق سے ملے، بہت دلجوئی فرمائی، بزرگانہ شان کرم سے ان میں سے زیادہ تر طلبہ کی جامع مسجد امروہہ میں سفارش کردی جس کے وہ سرپرست تھے، اس میں ان کا داخلہ ہوگیا، مگر ان سطور کا لکھنے والا اس سفارش سے محروم رہا۔ میرے ساتھیوں نے دس پندرہ دن جامع مسجد امروہہ میں وقت گزارا، وہاں کے مہتمم صاحب سے مجھ غریب کا تذکرہ کیا، انھوں نے ازراہ تلطف میرے ساتھیوں کو اجازت دی کہ اسے بھی بلوالو، اس کا بھی داخلہ ہم کرلیں گے۔ میرے دوستوں میں مولانا طاہر حسین گیاوی خوش ہوکر تشریف لائے اور مجھے لے کر چلے۔ میں نے دریافت کیا کہ امروہہ میں یہی ایک مدرسہ ہے جہاں دورے تک تعلیم ہوتی ہے یا اور کوئی مدرسہ ہے؟ انھوں نے بتایا کہ محلّہ چلہ میں بھی ایک مدرسہ ہے جس کے شیخ الحدیث وہ مولانا ہیں جنھوں نے اخبارات میں ہم لوگوں کے حق میں کلمہ خیر کہا تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا مجھے اسی مدرسہ میں

پہونچادو۔مولانا کی عظمت پہلے سے دل ودماغ میں جاگزیں تھی، میں نے اصرار کیا کہ مجھے انھیں کی خدمت میں لے چلو۔مولانا طاہر حسین صاحب نے مجھے ایک مسجد میں لے جاکر رکشہ سے اتارا،ایک متوسط درجہ کی پرانی مسجد !اس کے شمال وجنوب اورمشرق میں مدرسہ سائز کے چند حجرے! کہنے لگے یہی مدرسہ چلہ ہے،جنوب میں تین کمرے تھے،درمیانی کمرے میں مولانا نظر آئے۔میں نے اندر جاکر ملاقات کی،مولانا بہت اخلاق سے ملے،مولانا طاہر حسین صاحب نے تعارف کرایا،داخلہ کی درخواست کی۔مولانا نے بہت خندہ پیشانی اور بشاشت سے باتیں سنیں اور زبانی طور سے درخواست قبول فرمالی،کاغذی کاروائی سے پہلے کھانا منگوایا،صاحبزادۂ محترم حافظ محمد ارشد صاحب کوحکم دیا کہ کھانا کھلاؤ،ظہر کی نماز کے بعد میں پہونچا تھا،عصر کے پہلے تک ساری کاروائی ہوگئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

چھوٹا سا مدرسہ،چھوٹا سا ماحول،دورہ حدیث میں دوساتھی پہلے سے تھے تیسرا میں ہوا، مگر استاذ بہت بڑے، بہت ذہین، بڑی اونچی طبیعت کے، بہت وسیع الظرف تھے۔دوایک روز کے بعد اسباق شروع ہوئے،مولانا کی خدمت میں بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس تھے مولانا کی آواز مہین تھی اور لہجہ خوب واضح نہ تھا،اس لئے ابتداء میں بات سمجھنے میں دشواری ہوئی، اکثر جملے پورے الفاظ کے ساتھ ادا نہ ہوتے،ناتمام حروف،نامانوس لہجہ، بہت غور سے سننے کے بعد بھی کچھ مطالب رہ جاتے،مگر چند ہی دنوں کے بعد ذہن نے ان کے انداز گفتگو کو اخذ کرلیا، الفاظ گرفت میں آنے لگے جو حروف ناتمام رہ جاتے، ذہن ان کی تکمیل کرلیتا۔پھر ان کی تقریر، درس میں خصوصاً ترمذی میں اتنی مرصع، اتنی مرتب،اتنی مدلل معلوم ہوئی کہ طبیعت عش عش کرنے لگی جس حدیث پر کلام کرتے اس کے مالہ وماعلیہ پر اس قدر ترتیب،اور اتنی تفصیل سے کلام کرتے کہ ہر سوال کا جواب ہوجاتا اور نئے نئے فوائد حاصل ہوتے۔ہر سبق میں ایسا محسوس ہوتا کہ علم وفن کے تازہ تازہ پھول دامن مراد میں آرہے ہیں۔ہر سبق کے بعد طبیعت کو ایک خوشگوار آسودگی حاصل ہوتی۔مطالعہ میرا بھی خاصا وسیع تھا،کتابوں کا مجھ کو جنون تھا لیکن ذہانت کی وجہ سے جو نئے نکتے یا دلائل کی نئی ترتیب مولانا کے ذریعہ ملتی،وہ علم کے نادر ابواب تھے۔مولانا نے جو محبت کی، اخلاق کی جو بلندی ان کے یہاں ملی،طلبہ کے حق میں جو شفقت وہمدردی ان کے پاس پائی،طلبہ

کی معذرت کے قبول کرنے میں ان کے اندر جو وسعت ملی ،غلطیوں کونظر انداز کرنے کا جو حوصلہ ان کی خدمت میں پایا،طلبہ کی خوبیوں پر انداز شاباش وآفریں جوان کے یہاں دیکھا،وہ میرے لئے نادر تو تھا ہی لیکن صرف اتنا ہی نہ تھا،علم کی گیرائی وگہرائی ،ذہانت کی قوی گرفت ،دلائل کی قوت اور طلبہ کو مطمئن کرنے کا وہ سلیقہ بھی ملا کہ طبیعت کو کہیں سے بے اطمینانی اور کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ترمذی شریف کا درس بہت مفصل ہوتا، بخاری شریف کا درس اس کی بہ نسبت قدرے اختصار سے ہوتا مگر تشنگی باقی نہ رہتی تھی۔میرا جی خوب لگا، بہت پابندی اور بہت ذوق وشوق سے درس میں حاضر ہوتا،عبارت میں ہی پڑھتا۔دارالعلوم کے حادثہ کی وجہ سے طبیعت پڑھنے سے اچاٹ ہو چکی تھی مگر مولانا کے درس میں طبیعت کا رخ پھر مڑ گیا اور تعلیم ومطالعہ میں خوب جماؤ حاصل ہوا۔

مولانا بہت محنت سے مطالعہ کرتے ،رات گئے تک مطالعہ میں مشغول رہتے ،دیر تک کچھ لکھتے رہتے ،سبق بڑی محبت سے پڑھاتے۔میں تو خطا کار تھا،فرد جرم پختہ تھا مگر مولانا کے وسعت ظرف کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کبھی کسی موقع پر سابقہ غلطی کا حوالہ نہیں دیا،نہ بر سبیل تذکرہ نہ بطور طعن وطنز!

تعلیم کا یہ سال مولانا کی صحبت میں بہت اچھا گزرا،مولانا ہر جمعرات کو ہم لوگ سے مضمون لکھواتے۔جمعرات کو آخری گھنٹے میں کسی ایک موضوع سے متعلق چند سوالات لکھواتے اور فرماتے کہ اس کے جواب اس ترتیب سے لکھو کہ ایک مرتب مضمون تیار ہو جائے،پھر دیکھتے ، اصلاح فرماتے ،مولانا کے اس طریقہ کار کا مجھ کو بہت فائدہ پہونچا۔

سال کھسکتا رہا آہستہ آہستہ شعبان کا مہینہ آ گیا، کتابیں تمام ہونے کو آ ئیں ،امتحان کا وقت آ گیا،سالانہ امتحان کے معاً بعد مولانا نے دستار بندی کا جلسہ رکھا تھا۔اس جلسہ میں از راہ ذرہ نوازی اس حقیر سے علم کے موضوع پر تقریر کروائی اور بہت تحسین فرمائی۔دستار بندی کے لئے امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کے صاحبزادے حضرت مولانا عبد السلام صاحب کو دعوت دی تھی اور خطیب کی حیثیت سے اپنے رفیق درس حضرت مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی دہلوی کو زحمت دی تھی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا سے ربط وتعلق باقی رہا،مولانا کے آبائی گاؤں سے میرا

گاؤں بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ضلع مئو میں ہی ہے۔ چھٹیوں میں جب مولانا گھر پر ہوتے تو میں اکثر سائیکل سے ان کے گھر چلا جایا کرتا، ایک مرتبہ کسی مختصر چھٹی میں مولانا گھر تشریف لائے تھے، مجھے معلوم نہ تھا، میں کہیں گیا ہوا تھا، گھر واپس آیا تو والد صاحب نے بتایا کہ مولانا افضال صاحب تشریف لائے تھے۔ میں حیرت اور خوشی میں ڈوب گیا، مولانا کی یہ خردنوازی تھی، مجھے معلوم نہیں تھا کہ مولانا گھر تشریف لائے ہیں، تو خود ہی ملاقات کے لئے آگئے۔ والد صاحب نے بتایا کہ سائیکل سے آئے تھے، انھیں تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے عالم اور سائیکل چلا رہے تھے۔ یہ مولانا کی سادگی اور بے نفسی تھی۔ مولانا اس وقت مالی اعتبار سے خوشحال نہ تھے، آمدنی کم اور عیال کثیر تھے، فرماتے تھے کہ ضرورت پر اگر ہم سائیکل چلالیں تو کیا شان گھٹ جائے گی؟ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے یہاں عرفی شان ووجاہت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ مولانا سفر بہت کرتے تھے اور سفر میں کسی طرح کا تکلف ان کے یہاں نہیں تھا، کسی بھی سواری میں بیٹھ کر، کھڑے ہوکر بے تکلف اور بے تکان سفر کر لیتے تھے۔ بدن بھی اللہ تعالی نے بہت مضبوط اور تنومند عطا فرمایا تھا، تھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ لمبے سفر سے آرہے ہیں، سفر میں نہ جانے کن کن مشقتوں سے دو چار ہوئے ہوں گے مگر آتے ہی وقت ہوتا تو کتاب اٹھاتے طلبہ کو اطلاع ہوتی اور سبق شروع ہوجاتا، کبھی نہ فرماتے کہ تھک گیا ہوں یا بڑی مشقت کا سفر ہوا ہے، ایک عام حالت جیسی حالت ہوتی، ہاں سفر میں کوئی خاص سبق آموز یا عبرت انگیز بات ہوتی تو ذکر کرتے۔

مولانا کی یہ خاص شان تھی کہ اہل تعلق سے بغیر کسی غرض سے محض للہ فی اللہ ملاقات کے لئے پہونچ جایا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، فرماتے تھے کہ ضرورت وغرض پر ہر شخص تو ملتا ہی ہے لیکن جس سے تعلق ہو، محبت ہو، بغیر کسی دنیوی غرض کے بھی ملنا چاہئے، اس سے محبت استوار رہتی ہے۔

میں ۱۹۷۲ء میں جامعہ اسلامیہ بنارس میں مدرس تھا، یہ میری ملازمت اور مدرسی کا آغاز تھا، میں ابتدائی درجہ کا نوعمر مدرس تھا، ایک روز فجر کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا کہ ''السلام علیکم'' کی مانوس سی آواز آئی، دیکھا تو مولانا دروازہ پر کھڑے مسکرا رہے ہیں، میں ہڑبڑا کر اٹھا، مصافحہ کیا اور ادب واحترام سے بٹھایا۔ میں حیرت میں تھا، ادھر کئی ماہ سے

میری ملاقات نہ تھی، کیوں کہ میں درمیان میں کچھ دن میسور رہا تھا، اچانک بے وہم وگمان مولانا کو دیکھا تو میں سراپا خوشی کے ساتھ حیرت میں ڈوب گیا۔مولانا نے کرم فرمایا، میں حیرت کا اظہار کر رہا تھا، اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھ رہا ہوں کہ بیداری میں آپ کو دیکھ رہا ہوں یا خواب میں؟ مولانا ہنسے اور فرمایا بعض لوگ بیداری میں بھی خواب دیکھتے ہیں، پھر فرمایا میں فلاں جگہ جا رہا ہوں، بنارس پہونچا تو خیال آیا کہ تم یہیں ہو، جی چاہا کہ تم سے مل لوں، اس ملاقات سے محبت کا وہ گہرا نقش بیٹھا کہ اب تک جگمگا رہا ہے۔

فراغت کے بعد......ہم لوگوں پر جو تہمت لگی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ......ہم لوگوں کو کوئی بھی درس گاہ اپنے یہاں خدمت کے لئے لینے کے واسطے تیار نہ تھی، مولانا کو اس کی بہت فکر تھی، شعبان کی چھٹیوں میں، میں مولانا کے گھر حاضر تھا، مولانا نے فرمایا اب کیا کروگے؟ میں نے عرض کیا، آپ جو حکم دیں، وہ چاہتے تھے کہ کسی کام پر لگا دیں، فرمایا کہ مدرسوں کی جانب رخ کروگے تو مشکل پیش آئے گی، میں مولانا اسعد صاحب کو خط لکھے دیتا ہوں، رمضان میں وہ ٹانڈہ میں رہیں گے، ان کے پاس خط لے کر چلے جاؤ، وہ کہیں جمعیۃ علماء میں لگا دیں گے۔ میں نے مولانا سے خط لے لیا اور رمضان کے اخیر عشرہ میں ٹانڈہ گیا، حضرت مولانا اسعد صاحب سے ملا، انھوں نے فرمایا عید بعد دلی آجاؤ، میں نے مولانا سے ذکر کیا، مولانا نے تاکید کی کہ عید بعد ضرور چلے جانا۔

میں عید بعد گیا تو ضرور مگر حضرت مولانا اسعد صاحب کسی لمبے سفر پر گئے ہوئے تھے، میں ہفتہ بھر جمعیۃ علماء کے دفتر میں رہا، پھر میں تبلیغی مرکز میں کسی تقریب سے گیا، وہاں کئی اکابر نے حکم دیا کہ چلے میں جاؤ، مجھے اتنا موقع نہ مل سکا کہ مولانا سے دریافت کرتا اور میں چلے میں نکل گیا، چلے سے واپسی کے بعد مولانا سے ملاقات ہوئی، مولانا نے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا اور میری زندگی بھی ایک خاص رخ پر چل پڑی تھی جو رخ مولانا کو پسند تھا۔

تبلیغ سے واپسی کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ مجھے گھر پر رہنے کی مجبوری پیش آئی، میں ڈیڑھ دو سال تک گھر پر ہی رہا، اس دوران مولانا سے کبھی کبھار ملاقات کی توفیق ہوتی رہی۔

مئی ۱۹۷۲ء میں جمعیۃ علما ہند کا سالانہ اجلاس تھا، اس وقت جس مجبوری کی وجہ سے مجھے

گھر رہنا ناگزیر تھا، وہ مجبوری ختم ہوچکی تھی۔ مجھے فکر ہوئی کہ زندگی کے کسی عمل میں لگ جانا چاہئے کہ دین کی کچھ خدمت ہواور ماضی کی غلطیوں کی کچھ تلافی بھی ہو۔ مجھے پھر مولانا یاد آئے، مولانا دلی جمعیۃ علماء کے اجلاس میں یقیناً ملیں گے، یہ سوچ کر میں دلی چلا گیا، امید کے مطابق مولانا سے ملاقات ہوئی، بڑی محبت، بہت التفات سے ملے، حالات پوچھتے رہے۔ میں نے عزم ظاہر کیا کہ اب کسی مشغلہ میں لگنے کی نیت سے آیا ہوں، مولانا نے تحسین فرمائی، اجلاس کے دوران مولانا کی توجہ وعنایت سے میسور جانا طے ہوگیا لیکن ابھی وہاں جانے میں تھوڑا عرصہ درکار تھا، مولانا اس وقت بھی امروہہ میں شیخ الحدیث تھے، مجھ سے فرمایا کہ امروہہ چلو، درمیانی عرصہ وہاں گزارو، پھر میسور چلے جانا۔ میں ساتھ ہی امروہہ چلا گیا، وہاں میرے استاذ حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مظفر پوری طویل چھٹی پر گھر گئے ہوئے تھے، حضرت مولانا نے ان کی زیر درس ساری کتابیں میرے سپرد کردیں اور دو ماہ میرا اچھا وقت گزر گیا۔

حضرت مولانا اس وقت بھی جب میں طالب علم تھا اور اس وقت بھی جب عارضی طور سے وہاں پڑھا رہا تھا، تدریس اور مطالعہ کے اوقات کے علاوہ مسلسل قرطاس وقلم کی بزم سجائے رہتے تھے، رات کو عموماً ایک ڈیڑھ بجے تک لکھتے رہتے تھے، ان دنوں متفرق مضامین کے علاوہ جو وہ مختلف مجلّات کے لئے لکھا کرتے تھے، مستقل ایک تصنیفی پروگرام چھیڑ رکھا تھا۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے درس ترمذی کی کئی سال کی قلمی کاپیاں، جوانھوں نے جمع کررکھی تھیں، جو حضرت شیخ کے ذہین تلامذہ نے دوران درس نوٹ کررکھی تھیں، مولانا ان سب کو بغور پڑھتے، پھر ان سب کی روشنی میں ایک جامع اور مرتب تقریر تیار کرتے، الفاظ وکلمات حضرت شیخ ہی کے رکھتے، کہیں کہیں ترتیب درست کرنے کے لئے ضروری لفظ بڑھاتے۔ بہت محنت سے یہ کام کرتے اور درس ترمذی میں اس سے کام لیتے، اس کے لئے حوالہ اور مراجع کا مسلسل مطالعہ کرتے۔ کتاب الحج تک غالباً یہ سلسلہ مکمل ہوگیا تھا، اس کی ایک قسط مولانا نے شائع بھی کی تھی مگر باقی ماندہ حصہ چھپ نہ سکا۔ مولانا کے ذخیرہ کاغذات میں ان شاءاللہ محفوظ ہوگا، اخلاف کی ذمہ داری ہے کہ یہ گرانمایہ علمی خزانہ منصۂ شہود پر لایا جائے۔

مولانا ذہانت وذکاوت کے ساتھ موزونی طبع کے مالک تھے، طبیعت شعروادب کی

طرف مائل ہوتی تو ایک سے بہتر ایک شعر نکالتے ،لیکن مولانا جن علمی اور انتظامی کاموں میں مسلسل لگے رہتے ان میں شعر گوئی کی طرف نہ توجہ کرنے کا موقع ہوتا اور نہ اس کا تکلف کرتے۔ البتہ مولانا بکثرت سفر کرتے تھے،سفر کے دوران ٹرین اور بس پر طبیعت کو تھوڑی سی فرصت ملتی تو شعر گوئی کی طرف مائل ہوتے۔آپ کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں،ایک تو ''نجم سحر'' دوسرے ''دار ورسن''۔مولانا کا تخلص جوہرؔ تھا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ مولانا نے کسی سے اصلاح لی ہے یا نہیں؟البتہ یہ معلوم ہے کہ گونڈہ کے زمانہ قیام میں مشہور شاعر رئیس المتغزلین جناب جگر مرآدبادی کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

مولانا دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۰ء میں فارغ ہوئے،مولانا نے اپنی طالب علمی کی داستان کچھ نا تمام سی لکھی ہے،اس کی جگہ مولانا کی سوانح عمری ہے۔فارغ ہونے کے بعد کچھ دنوں جین پور ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ جامع العلوم میں تدریس کی خدمت انجام دی،حضرت مولانا عبدالمنان صاحب اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب چشتی خلیفہ حضرت مدنی قدس سرہ نے جین پور میں مولانا سے تعلیم حاصل کی ہے۔جین پور کے بعد بہرائچ مدرسہ نورالعلوم میں مدرس ہوئے، بہرائچ کے بعد گونڈہ مدرسہ فرقانیہ میں تشریف لے گئے۔یہی زمانہ مولانا کی بہترین کارکردگی کا ہے،اس وقت آپ تعلیم وتربیت کے موضوع میں فنا تھے،گونڈہ میں آپ کے اٹھارہ سال گزرے۔ مولانا کے حسن تعلیم وتربیت سے اور حسن انتظام سے مدرسہ فرقانیہ ایک نمونہ کا مدرسہ بن گیا تھا، وہاں سے مولانا کے بڑے اعلی اور جید تلامذہ تیار ہوئے۔

مولانا محمد احمد فیض آبادی استاذ دارالعلوم دیو بند،مولانا شمس تبریز آروی مرحوم لکھنو یونیورسٹی،مولانا عطاءاللہ صاحب دیوریاوی وغیرہ بکثرت علماء نے گونڈہ میں مولانا سے اکتساب فیض کیا۔

اٹھارہ سال کے بعد بعض حالات کی وجہ سے مولانا نے گونڈہ چھوڑ دیا،اس کا مولانا کی طبیعت پر بہت اثر تھا۔اس کے بعد متعدد جگہوں پر پڑھایا مگر گونڈہ چھوٹنے کا اثر تھا کہ طبیعت کو کہیں جماؤ نہیں ہوتا تھا۔مولانا کی طبیعت میں شان بے نیازی بہت تھی،انتظامی سیاست کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے،وہ مزاج یہ ہے کہ جو بھی اس انتظام میں داخل ہو،ہر مناسب اور نا مناسب پر

بلکہ ہر غلط اور صحیح پر سر جھکائے رہے، سر تسلیم خم کئے رہے، غلط کو اگر غلطی سے غلط کہہ دیا تو انتظامی سیاست کی پیشانی پر بل آجاتا ہے۔ یہ سیاست چالباز ہوتی ہے، اس کو اگر کسی کے اندر شجاعت کا شائبہ محسوس ہوتا ہے تو اسے اپنا مدمقابل سمجھ لیتی ہے اور مختلف حیلوں اور چالبازیوں سے اسے اپنی راہ سے ہٹانے کا منصوبہ سوچنے لگتی ہے۔ مولانا کی یہ غلطی بہت نمایاں تھی، مولانا طبیعت اور دل و دماغ کے اتنے مضبوط تھے کہ کسی طاقت اور کسی وجاہت کے سامنے دبنا جانا ہی نہیں اور عقل ورائے کے اتنے پختہ تھے کہ کسی کچی رائے اور عقل ودانائی سے منحرف کسی بات کو قبول کرنے سے انھیں مناسبت تھی ہی نہیں، اور کسی غلط بات کو کسی مصلحت اندیشی کی بنا پر درست کہنے کا انھیں یارا نہ تھا، اکثر پڑھا کرتے تھے:

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

دور حاضر کی انتظامی سیاست خواہ وہ ملکی پیمانے کی ہو یا کسی ادارہ وتنظیم چلانے کے پیمانے کی ہو، اس روشنی طبع کو برداشت نہیں کرتی۔ آج کی اصطلاح میں اس روشنی طبع اور شجاعت و بےخوفی کو خودداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ خودداری بسا اوقات کبر کی سرحد میں داخل ہوجاتی ہے، مگر مولانا کبر ونخوت سے بہت دور تھے۔ وہ شجاع تھے متکبر نہ تھے، وہ صاحب رائے تھے مگر ضدی نہ تھے، وہ حق بات بےتکلف کہہ دیتے تھے مگر دل میں کینہ بالکل نہ رکھتے تھے، وہ اپنی بات پر بڑے پختہ تھے مگر دوسروں کی بات بڑے حوصلے اور وسعت سے سنتے تھے لیکن بسا اوقات سیاست کو ان کی یہ پختگی ناگوار ہوتی تھی، وہ کبھی کبھی ہم لوگوں کو ماحول کی کشمکش سمجھانے کے لئے بتاتے تھے کہ ''انتظامی سیاست کی ناگواری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ تم اس کی خرابی پر اسے ٹوک دو بلکہ اسے یہ بات بھی ناگوار ہوتی ہے کہ اس کی خرابیاں اور کمزوریاں تمہارے علم میں آجائیں، اگر اسے شبہہ بھی ہوگا کہ تم اس کی خرابیاں اور بدنیتیاں جان گئے ہو تو وہ تم سے ناراض ہوجائے گی۔''

گونڈہ چھوڑنے کے بعد مولانا نے کہیں جم کر رہنے کا ارادہ نہیں کیا، فرماتے تھے کہ لائن نہیں بدلی جائے گی، جگہ بدلی جاسکتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے علم دین کی خدمت کو زندگی کا نصب العین بنایا اور زندگی اسی نصب العین پر بسر کر لے گئے مگر کسی خاص جگہ کو مطمح نظر نہیں بنایا کہ اسے چھوڑنا ہی نہیں ہے۔ فرماتے تھے کہ'' نماز تو پڑھنی ہے مگر اس کے لئے کوئی ایک خاص مسجد تو

ضروری نہیں کسی مسجد میں سجدہ کیا جا سکتا تھا۔''

چنانچہ گونڈہ کے بعد دارالعلوم مئو، میرٹھ، امروہہ، حیدرآباد، مہوا بسم اللہ، گورینی جونپور اور گورکھپور میں کچھ کچھ وقفہ تک قیام رہا۔ان جگہوں میں کچھ طویل قیام گورینی میں رہا اور گورکھپور میں، گورینی میں آٹھ سال اور گورکھپور میں تقریباً ۱۸/۱۹ سال۔

مگر ہر جگہ اس طرح رہے جیسے کوئی مسافر رہتا ہو، مقیم کی طرح کہیں نہیں رہے، گورکھپور کا قیام کسی درجہ میں مقیم کی طرح رہا مگر جب اٹھے تو اس طرح اٹھے کہ کوئی تعلق باقی نہ رہا۔

مولانا نے دینی تعلیم وتربیت کو اپنا نصب العین بنایا تو پوری زندگی مدرسوں میں گزار دی، کیوں کہ دینی تعلیم وتربیت کے مراکز یہی ہیں اور ابتدائی کتابوں سے لے کر دورۂ حدیث شریف تک سب درجوں کی کتابیں پڑھائیں۔مولانا کے پڑھانے کا انداز مجتہدانہ تھا، وہ فن کو طالب علموں کے ذہن کے بہت قریب کر دیتے تھے، فن کی اصطلاحیں سمجھانے کے لئے وہ سامنے کی روز مرہ استعمال آنے والی چیزوں میں سے مثالیں ڈھونڈ لاتے تھے۔فن منطق وہ اس طرح پڑھاتے تھے جیسے وہ انسانوں کے برتنے کی عام چیز ہو، اسی طرح فن نحو، فن صرف، اصول فقہ کو وہ زندگی سے بہت قریب کر دیتے تھے۔

حدیث پڑھانے کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں، قرآنی حکمت سے مولانا کو بہت مناسبت تھی، انھوں نے تفسیر کا خصوصی درس حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری مفسر قرآن کی خدمت میں لیا تھا۔قرآنی حکمت انسان کی روزمرہ زندگی میں کس طرح نافذ ہو؟ اس کی حکمت و جامعیت کن کن آفاق کو محیط ہے؟ مولانا کا ذہن بڑی سرعت سے اس تک پہونچتا تھا اور اس کی تعبیر بڑے اچھوتے انداز میں کرتے تھے۔

یہ حقیر مولانا کی خدمت میں امروہہ میں ایک سال ۱۹۷۰ء میں رہا، اس وقت مولانا استاذ تھے، صدرالمدرسین تھے، شیخ الحدیث تھے اور یہ بندہ ایک معمولی طالب علم تھا۔فراغت کے بعد گاہے گاہے مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی رہتی تھی، حضرت بھی کرم فرماتے رہتے تھے، میرے ساتھ معاملہ اولاد جیسا ہو گیا تھا، گھر پر بکثرت میری حاضری ہوتی تھی لیکن طویل یکجائی کا موقع نہیں ہوا تھا۔مولانا اپنے نظریہ کے مطابق دین کی خدمت کرتے ہوئے جگہ بدلتے رہتے

تھے۔میرا تعلق ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۵ء تک مدرسہ دینیہ غازی پور سے رہا، مدرسہ دینیہ کے مہتمم جناب مولانا عزیز الحسن صاحب صدیقی کو مولانا سے ذہنی مناسبت تھی، مولانا بھی جمعیۃ علماء ہند کے مخلص خادم تھے، صدیقی صاحب بھی جمعیۃ کے سرگرم رکن تھے۔ میں مدرس بن کر پہونچا تو میرا وجود مولانا کا ممنون کرم تھا، اس مناسبت سے مدرسہ دینیہ کی ہر تقریب میں مولانا کو دعوت دی جاتی اور مولانا کہیں ہوتے ضرور کرم فرماتے، وقت نکال کر آتے، رہنمائی فرماتے، مشورے دیتے۔

صدیقی صاحب بڑے سیال ذہن کے مالک ہیں، ان کا زرخیز ذہن عملی میدانوں میں نئے نئے پروگرام بناتا رہتا ہے۔ میرے پہونچنے کے بعد انھوں نے ایک نیا منصوبہ بنایا کہ فارغ التحصیل طلبہ کو تعلیم و تدریس کی ٹریننگ دی جائے، انھیں پڑھانے کا سلیقہ سکھایا جائے، تربیت کا انداز بتایا جائے، تا کہ جب وہ مدرس بن کر مدرسہ میں پہونچیں تو بہتر طریقہ سے خدمت انجام دے سکیں۔

اس کا انھوں نے پروگرام بنایا، اہل نظر کے سامنے پیش کیا، اس کے لئے ’’دائرۃ التربیت‘‘ کے نام سے مدرسہ دینیہ میں ایک شعبہ کا انعقاد کردیا، اس موضوع سے مولانا کو خصوصیت سے دلچسپی تھی۔ مولانا تشریف لائے اور کئی دن تک قیام کیا، طریقہ کار سمجھایا، اس میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ جن فارغ التحصیل طلبہ کی تربیت ہوگی، ان کے لئے ایک نصاب بنایا جائے، جسے وہ ایک سال میں سبقاً سبقاً اساتذہ سے پڑھیں۔ صدیقی صاحب نے اس نصاب کی تشکیل میرے ذمے لگائی، میں نے اپنی دانست میں بہت غور وفکر کرکے ایک نصاب بنایا۔ مولانا جب تشریف لائے تو میں نے وہ نصاب ان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے ایک نگاہ ڈالی اور اسے فیل کردیا اور فرمایا کہ جو بات ذہن میں ہے، سب نہیں لکھی جاتی، اس میں انتخاب کیا جاتا ہے۔ پھر انھوں نے اسے بہت مختصر کردیا اور زندگی بھر کے لئے ایک سبق دیدیا کہ ذہن بڑا زرخیز ہوتا ہے جو کچھ ذہن میں آئے نہ اسے بولنا چاہئے نہ لکھنا چاہئے بلکہ اس میں بہت غور وفکر کرکے انتخاب کرنا چاہئے جو مقصد سے ہم آہنگ ہو اور مخاطب کے حالات وظروف کے مناسب بھی ہو۔

مولانا اس طرح مختصر مختصر جملوں میں بڑی بڑی باتیں سمجھا دیا کرتے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب نعمانی علیہ الرحمہ کا مئو میں انتقال ہوا، تو اس کے کچھ دنوں کے

بعد مولانا کے گھر میری حاضری ہوئی، اس وقت مولانا کی وفات کا بہت چرچا تھا، مئوسونا سونا ہوگیا تھا، ہر بات میں لوگ مولانا کو یاد کرتے تھے۔ میں مولانا کی خدمت میں حاضر تھا، مولانا مرحوم کا تذکرہ چل پڑا، میں نے عرض کیا کہ مولانا کیا گئے، لوگ پریشان ہوگئے، فرمایا ہاں جی، میدان میں ایک عظیم سایہ دار درخت تھا، وہ نہ رہا تو ہر طرف دھوپ پھیل گئی۔

پھر فرمایا جانتے ہو آدمی کسے کہتے ہیں؟ میں خاموش رہا تو فرمایا، ''آدمی وہ ہے کہ جب وہ نہ رہے تو اس کی کمی محسوس ہو۔''

مولانا کے ساتھ طویل یکجائی امروہہ کے بعد مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور میں ہوئی۔ میں گورینی میں چار سال رہا، مولانا تین چار سال پہلے سے تھے، میرے وہاں پہونچے سے مولانا کو بہت خوشی ہوئی، گورینی میں بہت دنوں تک اور بہت قریب سے مولانا کو دیکھنے، برتنے اور معاملات کرنے کا موقع ملا، اس وقت مولانا کی خوبیاں اور نکھر کر سامنے آئیں، ان کی محبت سے خوب مستفید ہوا۔

مولانا کو قریب سے دیکھنے کے بعد ایک بات جسے میں مولانا کے بارے میں جانتا تھا اور واضح طور پر نکھر کر آئی، وہ یہ کہ اتنا تو معلوم تھا کہ مولانا بہت مخلص ہیں، منافقت سے پاک ہیں، ان کے یہاں زبان پر کچھ دل میں کچھ، کی پالیسی کبھی نہیں رہی، حالانکہ ان کا سابقہ کئی تنظیموں سے رہا اور بعض تنظیموں میں ان کی حیثیت اساسی رکن کی رہی ہے، اور دور حاضر کی تنظیموں کی بنیادی خصوصیات میں ایک بات عموماً یہ بھی ہوتی ہے کہ پالیسی کا اندرون وبیرون الگ الگ ہو، مگر مولانا اس فن سے ناواقف تھے۔ میں نے انھیں جمعیۃ علماء کے اجلاسوں میں، اس کی خصوصی میٹنگوں میں دیکھا ہے، جس بات سے انھیں اختلاف ہوتا بر ملا اس کا اظہار کرتے، تاہم اپنے امیر اور اپنے بڑے کی اطاعت میں بھی فرق نہ آنے دیتے۔ بارہا حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے اختلاف کرتے دیکھا مگر جب کوئی بات طے ہوجاتی تو خواہ وہ مولانا کی رائے کے خلاف ہی ہوتی، مولانا اسے دل سے تسلیم کرتے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک ہوتا جب تک تنظیمی امور میں اختلاف ہوتا، گورینی میں جب مولانا تھے تو ایک موقع ایسا آگیا کہ مسئلہ جمعیۃ میں کسی تنظیمی امر کے اختلاف تک نہیں رہا، بلکہ ایک اصولی اور دینی اور شرعی امر میں اختلاف پیدا ہوگیا، وہ مسئلہ ''امارت شرعیہ'' کا

تھا۔ یہ ایک علمی اور شرعی مسئلہ تھا، جس میں مولانا اپنے آپ کو حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب علیہ الرحمہ کی رائے اور موافقت تک نہ لا سکے تو باوجودیکہ مولانا مدنی سے مولانا کو قلبی تعلق تھا، ان کے ہر ارشاد کو حکم کا درجہ دیتے تھے لیکن امارت شرعیہ کے مسئلہ پر اتنا اختلاف ہوا کہ مولانا نے جمعیۃ علماء کی پالیسی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یہ مولانا کے لئے بڑا سخت مجاہدہ تھا، کیوں کہ چالیس پینتالیس سال تک مسلسل جمعیۃ کے ساتھ مولانا کی رفاقت رہی ہے، اس کا چھوٹا بڑا کوئی اجلاس ایسا نہ تھا کہ جہاں مولانا کلیدی کردار نہ ادا کرتے رہے ہوں۔ اب ایک شرعی مسئلہ میں مولانا کے نزدیک جمعیت کا قدم راہ مستقیم سے منحرف ہو رہا تھا تو یہ مولانا کی ہمت تھی اور ان کا خلوص تھا کہ انھوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر تنظیموں کا مزاج عجیب ہوتا ہے، مولانا کامیاب نہ ہوئے لیکن مولانا نے بھی اپنے ضمیر کا سودا نہ کیا۔ ان دنوں میں مولانا کے بہت قریب تھا اور اس موضوع پر کھل کر باتیں ہوتی تھیں، میں جتنا ان سے مباحثہ کرتا، ان کی ضمیر کی پاکیزگی، ان کے دل میں مسائل شرعیہ کی اہمیت وعظمت اور ان کا خلوص روشن سے روشن تر ہوتا رہا۔

دوسری چیز جو میں نے گورینی کے دوران قیام دیکھی، وہ مولانا کی ان تھک جدوجہد تھی، مولانا جب گورینی تشریف لائے تھے تو حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب علیہ الرحمہ سے یہ بات طے کر لی تھی کہ میں ہفتہ کے سات دنوں کی حاضری کا پابند نہ ہوں گا، مہینہ کا ایک ہفتہ یکجائی طور پر یا الگ الگ مجموعی طور پر میری مدرسہ سے رخصت کا رہے گا۔ مولانا جمعیت علماء ہند کے نظام کے تحت قومی وملی کاموں میں نہ صرف ذوق وشوق سے بلکہ ایک عبادت اور فریضہ سمجھ کر حصہ لیتے تھے، مولانا کا اصل مزاج علمی اور تعلیمی تھا مگر قومی وملی مسائل میں وہ بہت انہماک سے شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس موضوع پر اشکال کیا تھا تو فرمایا کہ ''موجودہ حالات میں مسلمانوں کے اجتماعی وقومی احوال میں شرکت کرنے کا حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ نے مجھے حکم دیا ہے، اسے میں اپنے حق میں فرض سمجھتا ہوں۔'' اس فریضہ کی ادائیگی میں مولانا کو بہت سفر کرنے پڑتے تھے۔ مولانا اطمینان سے پڑھاتے ہوتے جمعرات کو آخری سبق پڑھا کر کمرے میں تشریف لاتے بیگ میں سامان رکھتے، پوچھنے والا کوئی پوچھتا کہ حضرت کہیں کا سفر ہے؟ فرماتے کہ دلی جا رہا ہوں کھانا کھاتے، بیگ اٹھاتے، مدرسہ کے باہر سڑک پر آتے، جونپور سے شاہ گنج کوئی گاڑی جاتی

ہوتی، بھری ہوتی، گھسنے کی جگہ نہ ہوتی مگر مولانا اطمینان سے اس میں داخل ہو جاتے، بیٹھنے کی جگہ مل جاتی تو بیٹھ جاتے، ورنہ کھڑے ہی کھڑے شاہ گنج پہونچ جاتے۔ وہاں سے دلی جانے والی ٹرین ڈھائی بجے ملتی، کبھی ریزرویشن کا دردسر مول نہ لیتے، جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے، گنجائش ہوتی تو برتھ ریزرو کرا لیتے ورنہ بیٹھ کر دلی پہونچ جاتے۔ کبھی سیٹ پر، کبھی زمین پر۔ اللہ نے مولانا کو مضبوط جسم عطا کیا تھا اور ہمت ایسی کہ کبھی تھکنے کا نام نہ جانتی تھی۔ اس وقت مولانا کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز تھی مگر بڑھاپے کا ضعف واضمحلال ابھی پاس سے نہیں گزرا تھا، سستی اور کاہلی کا کوئی ہلکا سا نشان بھی نہ تھا، سنیچر کو اور کبھی اتوار کو واپس آتے، ظہر کی نماز کے بعد مدرسے میں داخل ہوتے، باوضو ہوتے اور اگر وضو نہ ہوتا تو وضو کرتے اور حدیث کی کتاب بخاری شریف اٹھاتے اور درس گاہ میں پہونچ جاتے، طلبہ میں خبر پھیل جاتی کہ مولانا آ گئے ہیں، بغیر کسی تمہید کے، بغیر کسی تکان کے تذکرے کے، سبق شروع ہو جاتا۔ سبق سے فارغ ہو کر اپنے روزمرہ کے معمولات میں مشغول ہو جاتے۔ آرام کرنے کا کوئی خانہ مولانا کی زندگی میں نہ تھا۔ ہر ہفتہ مولانا کا یہ منظر سامنے سے گزرتا، سب کے سامنے سے گزرتا، یہ بھی گویا روزمرہ کا ایک معمول تھا۔ میں چار سال کی مدت میں مسلسل ان کے ساتھ رہا، سفر میں کم حضر میں زیادہ، مگر مولانا سے یہ لفظ نہیں سنا کہ تھک گیا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ مدرسین کا ایک قافلہ ضلع بستی کے ایک گاؤں جانے والا تھا، مولانا کے شاگرد مولانا عتیق الرحمان صاحب معتمد مالیات تھے، ان کے گھر پر کسی شادی کی تقریب تھی، انھوں نے اپنے ہم عمر اور کم عمر اساتذہ کو دعوت دے رکھی تھی۔ سب بے تکلف تھے، ایک جیپ کے بقدر قافلہ تیار تھا، اتفاق ایسا کہ مولانا کا اس دن کہیں سفر نہ تھا، ان سے درخواست کی گئی، مولانا کو اپنے چھوٹوں کی دلداری کا بڑا اہتمام تھا، مولانا بھی شریک قافلہ ہو گئے۔ ایک خاص مسافت تک تو سڑک اچھی تھی، سفر بخیر گزرا، مگر ایک تہائی راستہ بہت خراب تھا، سڑک بنی نہ تھی، تمام دھول مٹی میں جیپ ہچکولے کھا رہی تھی، قافلہ ان ہچکولوں میں زیر وزبر ہو رہا تھا، جیپ کی حرکاتِ نشیب وفراز کے ساتھ دھول اتنی اڑ رہی تھی کہ نہ کسی کی صورت پہچانی جا رہی تھی اور نہ کسی کا لباس سمجھ میں آ رہا تھا، وقت کی ایک خاصی مدت قطع کرنے کے بعد جب منزل مقصود پر یہ کارواں پہونچا ہے تو ہر شخص دھول مٹی کا ایک مجسمہ بنا ہوا تھا، سفر کی ستم ظریفی کا شکوہ ہر ایک کی زبان پر تھا، سب رومال لے لے

کرا پنے اپنے اوپر سے گرد وغبار صاف کر رہے تھے،اس پورے قافلہ میں اگر کوئی بالکل پرسکون تھا نہ زبان پر کوئی شکوہ تھا، نہ کوئی غیر معمولی حالت محسوس ہورہی تھی ،تو وہ مولانا کی ذات تھی۔ مولانا بھی دھول مٹی کا مجسمہ بنے ہوئے تھے،مولانا کی شیروانی کہیں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی، چہرہ غبار میں اٹا ہوا، ڈاڑھی دھول میں چھپی ہوئی، میں نے مولانا کے قریب جا کر ایک شعر پڑھا:

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

دنیا کے ان خاکساروں کو حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو،تمہیں کیا پتہ کہ اس گرد وغبار میں کوئی سوار ہو۔

مولانا یہ سن کر صرف مسکرائے، زبان سے ایک لفظ نہ کہا، پھر میں نے اور دوسرے رفقا نے مولانا کے بدن سے گرد وغبار جھاڑی۔

مولانا سفر وحضر میں نہایت بے تکلف تھے،ایک روز میں شاہ گنج روڈویز پر پہونچا، مجھے اعظم گڑھ جانا تھا،بس پر چڑھا تو دیکھا کہ مولانا بھی تشریف فرما ہیں، مجھے دیکھتے ہی پوچھا ظہر پڑھ چکے ہو؟ میں نے عرض کیا جی،فرمایا بیٹھو میں پڑھ آؤں۔مولانا شیروانی پہنے ہوئے تھے،تیزی سے اترے، ہنڈ پائپ کے پاس گئے،ایک ہاتھ سے اسے چلانے لگے اور وضو کرنے لگے، میں نے اپنے رفیق کو بھیجا کہ تم جا کر نل چلاؤ، وہ بھی تیزی سے اترا لیکن جب تک پہونچتا ہے،مولانا فارغ ہوگئے، پھر روڈویز کی بنچ پر جو قبلہ رخ تھی،آپ چڑھ گئے،اور شیروانی نکال کر بچھادی اور نماز پڑھنے لگے۔

گورینی کے بعد مولانا نے گورکھپور کا رخ کیا، گورکھپور میں ''دارالعلوم گورکھپور'' کے نام سے حکیم وصی احمد صاحب مرحوم اور ان کے رفقا نے عربی کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا،حکیم صاحب مولانا کو گورکھپور لائے،اور مدرسہ ان کے حوالہ کردیا۔ میں بھی مولانا کے ساتھ ہی گورینی سے نکلا اور شیخو پور آ گیا،اب ظاہری اور جسمانی قرب نہ رہا،مگر آمد و رفت مسلسل قائم رہی، میں اکثر گورکھپور حاضر ہوا کرتا،اور مولانا بھی جب کبھی اعظم گڑھ کی طرف آتے تو کتنا ہی قلیل وقت ہوتا شیخو پور تشریف لاتے۔مولانا کی بڑی صاحبزادی جن سے مولانا کو بہت تعلق تھا،جین پور کے

قریب خالص پور میں ہیں، وہاں آتے تو شیخو پور بھی آجاتے۔

مولانا کے یہاں مدرسہ میں جب بھی کوئی تقریب ہوتی، یا جلسہ ہوتا، تو مولانا اس شاگرد کو ضرور یاد کرتے اور میں بھی بہر حال حاضری کو اپنی سعادت سمجھتا۔

مولانا کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا، اس وقت بھی دیکھا جب مولانا مالی اعتبار سے خوش حال نہ تھے، اور اس وقت بھی دیکھا جب اچھی خاصی خوش حالی آچکی تھی۔ مولانا کی طبیعت کا ایک ہی رنگ رہا، خرچ میں میانہ روی، طبیعت میں کشادگی، اپنی معاشرت میں جفا کشی، مزاج میں استغنا و بے نیازی۔ کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ غربت و تنگدستی ہے، اور خوشحالی کے بعد کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس میں اتراہٹ اور فخر و ناز کا اثر ہوتا۔ ابتدائی ملاقات میں بسا اوقات ملنے والے کو طبیعت میں تیزی اور تندی کا احساس ہوتا، لیکن وہ فطری ہیبت تھی جو اول نظر میں دیکھنے والوں پر چھا جاتی، مگر جب معاملہ پڑتا اور برتنے کا موقع ملتا تو مولانا بہت نرم، پانی کی طرح خوشگوار، زمین کی طرح متحمل، اور سورج کی طرح فیض رساں ہوتے۔ میں نے مولانا کو غصہ میں بھی دیکھا، اور غصہ سے ٹھنڈے ہوتے بھی دیکھا، بظاہر کسی غلط بات پر غصہ جلد آتا تھا، مگر ٹھنڈا اس سے جلد ہوتا تھا۔ میں نے چالیس بیالیس سال کی رفاقت اور برتاؤ میں کبھی کسی کے ساتھ کینہ رکھتے نہیں پایا، آدمیوں کو پہچانتے خوب تھے، اور ہر ایک کے بارے میں ان کی ایک پختہ رائے ہوتی تھی اور جب کوئی معاملہ کرنا ہوتا تو اسی کی روشنی میں کرتے، مگر سلوک اور برتاؤ سب کے ساتھ حسن اخلاق کا ہوتا، اور دل ہمیشہ صاف رکھتے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ان کے درس سے فارغ ہو کر دنیا کے عملی میدان میں اترنے کا وقت آیا تو انھوں نے اس وقت کچھ نصیحتیں کی تھیں، یہ نصیحتیں بڑی قیمتی تھیں، ان میں سے ہندستان کی چند بڑی شخصیات کے بارے میں بھی انھوں نے کچھ باتیں، ان کے مزاج، ان کے رویہ کے بارے میں بتائی تھیں کہ اگر کبھی ان سے معاملہ کا سابقہ پڑے تو ناواقفی میں کوئی دھوکہ نہ ہو، اور ایسا اتفاق ہوا کہ ان میں سے اکثر سے سابقہ پڑا، اور جس کے بارے میں جو فرمایا تھا، برتنے کے بعد انھیں ویسا ہی پایا۔ ان تجربوں کے بعد مولانا کی دانائی اور مردم شناسی کا نقش اور گہرا ہو گیا، اور بحمد للہ اس کی وجہ سے طبیعت کے فساد اور دل کے کینہ سے محفوظ رہا۔

مولانا اصطلاحی اعتبار سے بظاہر صوفیہ اور مشائخ کے زمرے میں نہ تھے، ایک عالمانہ وقار تھا، ایک بے تکلف سادگی تھی، نہ تو اضع کا مظاہرہ تھا، نہ کبر وغرور کا شائبہ تھا، وظائف کی کثرت نہ تھی، اوراد واشغال کا مشغلہ نہ تھا، نفلی عبادات کا زور نہ تھا، مگر ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے بات کر کے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ اللہ کی ذات پر بغایت یقین، اللہ کی حکمتوں پر انتہائی بصیرت، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے آخری حد تک شیفتگی، شریعت کی نہایت عظمت، اور صحابہ وائمہ کرام کے حق میں کمال ادب کا جذبہ قلب کی گہرائیوں میں ہے، اتنا کہ خود اپنا قلب بھی اس سے متأثر ہوتا تھا۔ خصوصیت سے قرآن کریم کی حکمتوں پر ایسی گہری نظر اور ایسی روشن بصیرت تھی کہ جب اس موضوع کو بیان کرتے یا لکھتے تو وہ حکمت غامض ہونے کے بعد بدیہی اور واضح حقیقت معلوم ہوتی۔ وہ کیفیت جسے اصحاب شرع، اور ارباب طریقت ''شرح صدر'' کہتے ہیں، مولانا کی گفتگو سن کر اور مولانا کے مضامین پڑھ کر بار بار خیال ہوا کہ مولانا کو شرعی علوم ومسائل پر شرح صدر حاصل ہے۔

مولانا کو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کا تلمذ اور ان کی صحبت کی سعادت حاصل تھی، مذکورہ صفات واحوال کے حصول کے لئے یہ بابرکت تلمذ وصحبت خود ضمانت ہے، اس کے ساتھ خاندانی اور وراثت کے اثرات بھی ایک موثر عامل رہے ہیں۔ مولانا کے دادا حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی علیہ الرحمہ ایک اعلی درجہ کے قلندر صفت، صاحب نسبت، درویش کامل تھے۔ ابتداء عمر میں انھوں نے حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی کی خدمت میں حاضری دی تھی اور ان سے بیعت ہوئے تھے، پھر ان پر ایک جذبی کیفیت طاری ہوئی اور انھوں نے تمام تعلقات دنیا کو توڑ تاڑ کر اور سب سے پر جھاڑ کر مدینہ طیبہ کا رخ کیا، اور پیدل ہی یہ طویل مسافت طے کر کے خدمت نبوی میں حاضر ہوگئے۔ بارہ سال انھوں نے اسی ذوق وشوق میں گزارے۔ یہی دور تھا کہ جب حضرت مدنی قدس سرہ کے والد گرامی حضرت سید حبیب اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے بھی اپنے پورے خاندان کے ساتھ مدینہ طیبہ ہجرت کی تھی، یہ بزرگ بھی حضرت گنج مراد آبادی کے مرید وخلیفہ تھے، حضرت مدنی علیہ الرحمہ اسی نسبت سے حاجی صاحب کو چچا کہا کرتے تھے۔

بارہ سال کے بعد بارگاہ نبوت سے مبشرات میں حکم ہوا کہ وطن جاؤ، وطن تشریف لائے اور حضرت گنج مرادآبادی کے خلیفہ و جانشین حضرت مولانا شاہ عبدالکریم صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضری دی، اوران سے اجازت وخلافت سے سرفراز ہوکر، ان کے حکم سے فیض آباد میں بیٹھ گئے، اور وہاں سے ان کا فیض جاری ہوا۔ مولانا کو اپنے دادا کی صحبت بھی خوب حاصل ہوئی، دادا نے طویل عمر پائی۔

ایک تیسرے بزرگ مولانا ضرغام الدین صاحب مظفرنگری تھے، جنھیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہ نے فیض آباد بھیجا تھا۔ یہ مولانا کے ابتدائی استاذ تھے، انھوں نے مولانا کو نصیحت فرمائی تھی ''بیٹا! جہاں تمہارا علم مطمئن ہو، بیعت وہاں ہونا''۔ مولانا نے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔

۱۹۴۰ء میں جب مولانا اوران کے بڑے بھائی دارالعلوم دیوبند سے حضرت مدنی کی درس گاہ سے فارغ ہوکر اٹھے، تو جو کچھ پڑھا تھا، اس کا اطمینان کامل استاذ کے یہاں ملا، اس وقت علماو مشائخ طریقت بہت تھے، خود مولانا کے دادا شیخ کامل تھے۔ مولانا کے وطن میں مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کا آغاز تھا، مگر مولانا استاذ محترم کی درس گاہ میں بیٹھ کر انھیں کی محبت وعقیدت میں جذب ہو چکے تھے۔ فراغت کے بعد انھیں سے بیعت ہوئے، مگر تصوف کے اشغال میں لگنے کا باقاعدہ موقع نہ ملا، علم ومطالعہ، تدریس وتصنیف، قومی وملی اوراجتماعی مسائل کی مشغولیت ایسی رہی کہ یکسوئی اور سکون جس کی ضرورت سلوک وتصوف کے مشاغل میں ہوتی ہے، انھیں اس کے لمحات میسر نہ آئے۔ بیعت اورابتدائی تسبیحات کے بعد حضرت نے پاس وانفاس کی مشق وتمرین تک پہونچایا تھا، اس کے آگے باقاعدہ بڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی، تاہم اس بیعت و صحبت کا اثر یہ تھا کہ دین وشریعت کے علوم واعمال میں مولانا کو انتہائی پختگی اور رسوخ کا ملکہ تھا، بزرگوں سے عقیدت ومحبت بدرجہ اتم تھی، طریقت وسلوک کی ضرورت محسوس کرتے تھے، اپنے شاگردوں کو کسی بزرگ کے دامن فیض سے وابستہ ہونے کا مشورہ ضرور دیتے تھے۔

فراغت کے سال مجھ سے فرمایا تھا کہ تم بھوپال مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی کے پاس چلے جانا، لیکن اسی سال میری فراغت سے پہلے ان کا وصال ہوگیا، تب مولانا نے مجھ کو بانس

کنڈی مولانا احمد علی صاحب خلیفہ حضرت مدنی علیہ الرحمہ کی خدمت میں جانے کا مشورہ دیا،مگر غالبًا بہت دور ہونے کی وجہ سے اور لمبے سفر سے اس وقت میری وحشت کی وجہ سے،اس پر عمل نہ ہوسکا۔

مولانا کے علمی و ذہنی کمالات کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک اور رخ عرصہ تک مولانا کی زندگی اور ان کی شہرت پر محیط رہا، یہ رخ ایسا تھا،جس کا تعلق عام حالات میں علم سے نہیں ہوتا،مگر مولانا کی ذہانت وفطانت نے اس میں علم وفن کے گل بوٹے کھلا رکھے تھے۔مولانا سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے یہاں تعویذات وعملیات اور جھاڑ پھونک کا زور تھا،حاجت مند بہت دور دور سے مولانا کی خدمت میں آتے اور فائدہ اٹھاتے تھے۔جب میں امروہہ میں ان کی خدمت میں پڑھتا تھا،اس وقت تعویذات وعملیات کا کچھ زیادہ مشغلہ نہ تھا،مولانا کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف،مطالعہ وتدریس اور سفر میں گزرتا تھا،کبھی کبھی کوئی حاجت مند تعویذات کے لئے بھی آنکلتا تھا مگر یہ عمل اتنا غالب نہ تھا کہ ان کی کوئی شناخت بن پاتا،البتہ یہ دیکھا کہ تعویذات وعملیات کی بعض کتابوں کا مطالعہ بہت انہاک سے کرتے تھے،مثلاً ایک ضخیم کتاب عربی میں ''شمس المعارف الکبریٰ'' کو دیکھا کہ مستقل ان کے مطالعہ میں رہتی، یہ تعویذات وعملیات پر ایک مفصل اور ضخیم دائرۃ المعارف ہے،دوسرے امام جلال الدین سیوطی کی کتاب ''الرحمۃ''۔ان دونوں کتابوں کا بکثرت مطالعہ کرتے،ان سے نقل واقتباس کرتے،اس دور میں بھی کبھی کبھی حاضرات کا عمل کیا کرتے تھے مگر ہم طالب علموں کو اس سے ذرا بھی مناسبت نہ تھی،اس لئے مولانا کے اس رخ کی جانب کبھی دلچسپی نہ ہوئی۔یہ بات ۱۹۷۰ء کی ہے۔

اس کے بعد مولانا جہاں جہاں رہے معلوم ہوتا رہا،دیکھتا رہا،سنتا رہا کہ مولانا کا انہاک اس موضوع پر بڑھ رہا ہے،پھر تو یہ حال ہوا کہ مولانا کے اوقات کا روزانہ ایک بڑا حصہ اسی کے نذر ہوتا۔۱۵؍سال کے بعد گورینی میں دوبارہ جب مولانا کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو یہ مشغولیت بہت بڑھ چکی تھی،تعلیم کے اوقات میں تو اہتمام تھا کہ اس مشغلہ کو ہاتھ نہ لگاتے،اس کی وجہ سے درس کا نقصان نہ ہوتا،لیکن دوپہر میں جہاں اسباق سے فارغ ہوتے،اہل حاجت کی بھیڑ لگ جاتی۔مولانا کی لغت میں نہ آرام کا لفظ تھا نہ معنی،وہ اس وقت ایسا مشغول ہوتے کہ کھانے کا وقت

مشکل سے ملتا، دو پہر میں آرام کرنے یا سونے کا مسئلہ ان کی کتاب زندگی میں درج نہیں تھا کہ اس کا اہتمام کرتے، ایسے ہی عصر کے بعد، مغرب کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہتا، عشاء کی نماز کے بعد یہ کام بند ہوجاتا، پھر کتابوں اور تصنیف وتالیف میں لگ جاتے، اور اس میں رات کا ایک بج جاتا، دو بج جاتے۔ شاید ارادہ کر کے نہیں سوتے تھے، جب نیند کا غلبہ ہوا سو گئے، بستر وغیرہ کی قید سے عموماً آزاد رہتے، فجر سے پہلے اٹھ جاتے، پھر تمام دن سونے کی نوبت نہ آتی۔

مجھے اس موضوع سے بالکل دلچسپی نہیں ہے، اس لئے مولانا جب اس مشغلہ میں ہوتے تو میں وہاں سے اٹھ جاتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ باوجود مناسبت نہ ہونے کے میں بھی اس میں مبتلا ہوں، اور اس موضوع پر اچھا خاصا بدنام ہوں۔ مولانا نے کبھی کبھی مجھ سے فرمایا کہ اس طریقہ کو سیکھ لو، بالخصوص حاضرات کا عمل مگر اس میں وقت بہت لگتا ہے، اور نہ جانے اس میں کون سی مخلوق دکھائی دیتی ہے؟ اس کے معتبر اور نامعتبر ہونے کا کیا معیار ہے؟ اس سے کام لینے کے اثرات خود عامل پر کیا ہوں گے؟ عامل قوی ہو تب تو خیر، ورنہ اپنا بچاؤ مشکل ہوگا۔ انھیں خیالات کی وجہ سے میں معذرت کر لیتا، بعض تجربوں کی بنیاد پر میں یہ سمجھتا تھا کہ حاضرات کے عمل کا دار ومدار قوت خیال پر ہے، اور قوت خیال پر اعتماد کرنا گویا اپنے ہی خیال پر اعتماد کرنا ہے۔ اس کو معیار بنانا، اس کو بیماری، سحر، آسیب کے جاننے کا ذریعہ بنانا کتنا مناسب ہے؟۔

مولانا کبھی حاضرات کا ذکر کرتے تو میں بطور لطیفہ کے کہتا کہ حضرت! ہم لوگ اس لئے نہیں ہیں کہ جنات وغیرہ کو حاضر کریں، بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ انھیں غائب کریں، مولانا اسے سن کر خوب مسکراتے، اور از راہ مہربانی کوئی جواب نہ دیتے۔

بعض دفعہ مولانا کے ساتھ رہ کر عجیب عجیب تجربات ہوئے، ایک بار مولانا گورینی سے جونپور تشریف لے جارہے تھے، میں بھی ساتھ ہولیا، جونپور میں ایک صاحب اپنے گھر لے گئے، ان کا پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا بیمار تھا، بظاہر صحت مند تھا، مگر حس وحرکت سے بے نیاز چادر اوڑھے پڑا تھا۔ مولانا نے اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا تو اچانک اٹھ کر بیٹھا، اور پھر گھر کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔ ہم لوگوں کی خدمت کرتا رہا، کھانا کھلانے میں شریک رہا، ظہر کا وقت ہوا تو ہم لوگ قریب کی مسجد میں گئے، وہ بھی گیا۔ ہم لوگ نماز سے فارغ ہو کر آئے تو یہ ہوا کہ وہ پہلے آگیا تھا اور

اب وہ اللہ جانے گھر کے کھپریل پر کس طرح پہونچ گیا تھا؟ اور اس پر ہنگامہ کر رہا تھا، مولانا نے پھر کچھ پڑھا تو وہ کھسکتا ہوا نیچے آگیا، میں سمجھ رہا تھا کہ گرے گا تو سخت چوٹ آئے گی، مگر وہ اس طرح سے آہستہ سے نیچے آیا جیسے کسی نے اسے سہارا دے کر زمین پر رکھ دیا ہو۔ اب اس کے دونوں پاؤں بیکار تھے، بالکل مفلوج، اس سے اٹھنے کے لئے کہا گیا تو حرکت بھی نہ کرسکا، پاؤں بالکل ڈھیلے اور بے جان تھے، گھر والوں نے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ مولانا نے کالی مرچیں منگوائیں، ان پر معوذتین پڑھ کر دیر تک دم کرتے رہے، اور ایک برتن میں پانی منگوا کر ان میں ان مرچوں کو گھستے رہے، پھر گھر والوں سے کہا کہ اس پانی کو مریض کی آنکھ میں لگاؤ، پانی کا لگانا تھا کہ اس کے پاؤں درست ہوگئے، اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں حیرت سے دیکھ رہا تھا، میں نے مولانا سے پوچھا کہ یہ کیا تھا؟ فرمایا کہ اس پر جنات کا اثر ہے، جنات اس پر سحر کر کے بھاگ گئے تھے، اب یہ ٹھیک ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ہم لوگ وہاں رہے، وہ بچہ ٹھیک ٹھاک رہا، پھر ہم لوگ جامعہ حسینیہ جونپور چلے گئے، جہاں ہمیں جانا تھا۔

مولانا کے یہاں اس طرح کے آسیبی اور سحر زدہ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور مولانا ان کا علاج کرتے تھے، علاج زیادہ تر کامیاب رہتا۔

لیکن اس علاج کا ایک مضر پہلو یہ تھا کہ جو ساحر یا جن اس علاج کی زد میں آتا تھا، وہ علاج کرنے والے کا دشمن ہوجاتا تھا۔ مولانا نے کئی بار بتایا کہ کسی ساحر نے یا جن نے پلٹ کر مولانا پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ مدرسہ دینیہ غازی پور میں مولانا تشریف لائے، دیکھا کہ دائیں ہاتھ کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی ہے، اور مولانا لکھنے کا کام بائیں ہاتھ سے کر رہے ہیں، میں نے پوچھا تو ٹال گئے، میں اصرار نہیں کرسکتا تھا۔ رات کو جب کاموں سے فراغت ہوئی تب انھوں نے بتایا کہ ایک روز رات کو نیند سے بیدار ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ غسل کی حاجت ہے، میں اٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا، تو ایسا لگا کہ کسی نے مجھے زور سے ڈھکیل دیا، میں بے تحاشہ گر گیا، اور کلائی ٹوٹ گئی، بعد میں ایک جن نے بتایا کہ فلاں جن کو آپ نے ایک مریض سے ہٹایا تھا، وہ آپ کے پیچھے پڑا ہے، آج اسے موقع مل گیا تو بدلہ لے لیا۔

مولانا نے بتایا کہ وہ تحفظ کے لئے فلاں فلاں دعائیں پڑھتے ہیں، مگر جنابت کی حالت

میں اجنہ کو کسی قدر موقع مل جاتا ہے اور وہ قریب آجاتے ہیں۔مولانا بہت طاقتور تھے، اس لئے موذی اثرات ان پر کم آتے تھے، لیکن خطرہ رہا کرتا تھا۔

اس موضوع پر اب سے پہلے مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہاں پوری بھی بہت کامل تھے، اور غالبًا مولانا نے ان سے بھی اس فن کو کچھ حاصل کیا تھا۔مولانا سے اکثر میں نے مولانا شاہجہاں پوری کا نام اور تذکرہ سنا ہے، بعض تعویذ و عملیات میں ان کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

مولانا سے اس میدان میں بہتوں کو فائدہ پہونچا ہے، حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی، اور مولانا افضال الحق صاحب قاسمی اس موضوع پر دو مستند نام تھے، جن کی خدمت میں لوگ اپنی حاجات کے لئے بے تکلف جاتے تھے، اور کامیاب ہوتے۔ان حضرات نے خدمت بہت کی مگر اس خدمت کا کبھی معاوضہ نہیں لیا، معاوضہ تو درکنار کبھی معاوضہ کا تصور بھی نہیں کیا، کسی طرح کا تکلف نہیں کیا۔سچائی اور سادگی دونوں بزرگوں کا شعار تھا، چلتے پھرتے، سفر و حضر ہر جگہ مخلوق خدا کو فائدہ پہونچاتے، اور اس کا خود کوئی فائدہ نہ اٹھاتے تھے۔

مولانا کی داستان طویل ہے اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی مجھ کو محسوس ہو رہا ہے کہ کئی چیزیں نہیں لکھ سکا، اور وہ چیزیں نہیں لکھ سکا جو مولانا کی خصوصیات خاصہ تھیں۔میں تلاش کر رہا تھا کہ کسی نے کچھ لکھا ہو تو اس کو اپنی اس تحریر کا حسن خاتمہ بناؤں، مولانا عزیز الحسن صدیقی غازی پوری نے مولانا کی یاد میں ''تذکیر'' کا ایک خصوصی نمبر شائع کیا ہے، اس کی ایک تحریر کا اقتباس ''تذکیر'' کے شکریہ کے ساتھ حسن اختتام بناتا ہوں:

> ''ہمارے ممدوح ومکرم مولانا افضال الحق جوہر قاسمی علماء کی اس صف سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ملک کی آزادی اور قومی تعمیر و ترقی کے محاذ پر زبردست قربانیاں دیں، اور جام شریعت اور سندان عشق دونوں کو سنبھالے رکھا۔وہ جہاں بھی رہے، جس حال میں رہے، دونوں منصب کا حق ادا کرتے رہے، درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے، طلبہ کی تربیت اور کردار سازی میں بھی مصروف رہے، اور ساتھ ہی ساتھ سیاسی مشاغل سے بھی سروکار رکھا۔مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔وہ مولانا آزاد کے اس قول کو رہنما سمجھتے تھے کہ:

''مسلمان کاسہ لیسی کی زندگی اختیار نہ کریں''

وہ اس بات کو مانتے تھے کہ:

''اس ملک میں ہم جو اجلے نقوش دیکھتے ہیں وہ ہمارے ہی اسلاف کے لائے ہوئے تھے، اور یہ کہ اس ملک کے دروبست پر مسلمانوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا ہوسکتا ہے۔''

مولانا مرحوم کے دل میں جو کچھ ہوتا تھا، وہی زبان پر بھی ہوتا تھا، وہ ہمیشہ خدالگتی کہتے، کون ان کی باتوں سے خوش ہوتا ہے؟ کون ناک بھوں چڑھاتا ہے؟ اس کی انھوں نے کبھی پرواہ ہی نہیں کی، حتی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اپنوں نے ہی انھیں حق گوئی کی پاداش میں کنارے لگادیا، مگر ان کے اندر جو ''جوہر'' تھا وہ کسی انسان کا عطا کردہ نہیں بلکہ عطیہ الٰہی تھا، وہ اپنے مقام ومنصب سے آگاہ تھے، اور آخری دم تک اس کا حق ادا کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے عزیزوں، جاں نثاروں، شاگردوں اور معتقدوں کی ایک اچھی خاصی جماعت چھوڑی ہے، جو صرف درس وتدریس ہی کا کام نہیں کررہی ہے، بلکہ قیادت وسیادت کا بھی فریضہ انجام دے رہی ہے۔''

اعجاز احمد اعظمی
۱۵؍رجب المرجب ۱۴۳۴ھ
۲۶؍مئی ۲۰۱۳ء

❑❑❑

کیا لوگ تھے جو راہ وفا سے گزر گئے

مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب
مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور

مولانا افضال الحق جوؔہر قاسمی (۱۹۲۲۔۲۰۱۲) ایسے منفرد وممتاز عالم دین تھے جو بیک وقت مدرس بھی تھے اور مربی بھی۔ مصنف ومفکر اور صحافی وادیب بھی، بلند پایہ شاعر بھی۔ ان ساری صلاحیتوں کے ساتھ سوجھ بوجھ رکھنے والے سیاسی رہنما بھی۔ وہ ہر مسئلہ پر اپنی ایک الگ رائے رکھتے تھے اور اس کا برملا اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ نپی تلی بات کہتے اور چند فقروں میں جو کچھ کہہ دیتے دوسرے لمبی لمبی تقریروں میں بھی نہیں کہہ پاتے تھے۔ شاعر ایسے کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سفر ہو یا حضر ان کے ذہن کے ٹکسال سے مرصع غزلیں، نظمیں اور قصیدے ڈھل ڈھل کر نکلا کرتے تھے۔ مولانا جوہر ایک فطری شاعر تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان پر اشعار کا نزول ہوا کرتا تھا۔ ان کی شاعری بے کاری کا مشغلہ نہیں بلکہ ایک حیات بخش پیغام تھی۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتے تب بھی بہت کچھ ہوتے۔ وہ اپنے تعمیری افکار کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ ملک کی آزادی سے قبل اگر انہوں نے انقلابی شاعری کی تو آزادی کے بعد وطن کی ترقی و خوش حالی کے ترانے بھی گائے مگر فرقہ واریت کے ناگ نے انسانوں کو ڈسنا شروع کر دیا تو انہیں کہنا پڑا:

چمن پر آگ برسانا غلامانہ بغاوت ہے
غلامی سے مری فطرت کو شاہانہ بغاوت ہے

تمہاری راجدھانی میں لہو کے اتنے فوارے
میں باغی ہوں اگر یہ راج ٹھکرانا بغاوت ہے

مقالات ومضامین کا تو کہنا ہی کیا تھا، بس قلم کاغذ سنبھالنے کی دیر تھی۔ تصنیف وتالیف کے لیے انہیں پرسکون ماحول اور پرفضا مقام کی خواہش اور جستجو نہیں بلکہ ''جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی مے خانے بنے'' والی کیفیت تھی۔ اسی کیفیت اور اسی حال میں انہوں نے نہ جانے کتنی کتابیں لکھ ڈالیں۔ جتنی کتابیں چھپ سکیں، چھپ گئیں جو نہ چھپ سکیں ان کا کچھ پتا نہیں۔ انہوں نے شعر کہہ دیا، مضمون لکھ دیا، بس ان کا کام پورا ہو گیا، نہ کتاب جمع کرانے کی فکر، نہ اس کے اجرا کے لیے بے چینی۔ آج تو ماخوذات چھپوا کر لوگ مصنف بن جاتے ہیں اور کتاب کے اجرا پر ایسی شاندار تقریب کا اہتمام کرتے ہیں جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔

مولانا افضال صاحب قاسمی کس پایہ کے استاذ ومربی تھے اس پر روشنی ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں، بس ان کے ایک لائق وفائق شاگرد مولانا اعجاز احمد اعظمی علیہ الرحمہ (۱۹۵۱ء۔ ۲۰۱۳ء) کی گواہی کافی ہوگی۔ شاگرد سے زیادہ معتبر شہادت کس کی ہوسکتی ہے۔ لیجیے مولانا کی زبانی سنیے:

''مولانا (افضال الحق قاسمی) کی خدمت میں بخاری شریف اور ترمذی شریف کے درس تھے۔ مولانا کی آواز مہین تھی اور لہجہ خوب واضح نہ تھا، اس لئے ابتداء میں بات سمجھنے میں دشواری ہوئی، اکثر جملے پورے الفاظ کے ساتھ ادا نہ ہوتے، ناتمام حروف، نامانوس لہجہ، بہت غور سے سننے کے بعد بھی کچھ مطالب رہ جاتے، مگر چند ہی دنوں کے بعد ذہن نے ان کے انداز گفتگو کو اخذ کر لیا، الفاظ گرفت میں آنے لگے جو حروف ناتمام رہ جاتے، ذہن ان کی تکمیل کر لیتا۔ پھر ان کی تقریر، درس میں خصوصاً ترمذی میں اتنی مرصع، اتنی مرتب، اتنی مدلل معلوم ہوئی کہ طبیعت عش عش کرنے لگی جس حدیث پر کلام کرتے اس کے مالہ وماعلیہ پر اس قدر ترتیب، اور اتنی تفصیل سے کلام کرتے کہ ہر سوال کا جواب ہو جاتا اور نئے نئے فوائد حاصل ہوتے۔ ہر سبق میں ایسا محسوس ہوتا کہ علم وفن کے تازہ تازہ پھول دامن مراد میں آرہے ہیں۔ ہر سبق کے بعد طبیعت کو ایک خوشگوار آسودگی حاصل ہوتی۔ مطالعہ میرا بھی خاصا وسیع تھا، کتابوں کا مجھ کو جنون

تھا لیکن ذہانت کی وجہ سے جو نئے نکتے یا دلائل کی نئی ترتیب مولانا کے ذریعہ ملتی، وہ علم کے نادر ابواب تھے۔ مولانا نے جو محبت کی، اخلاق کی جو بلندی ان کے یہاں ملی، طلبہ کے حق میں جو شفقت و ہمدردی ان کے پاس پائی، طلبہ کی معذرت کے قبول کرنے میں ان کے اندر جو وسعت ملی، غلطیوں کو نظر انداز کرنے کا جو حوصلہ ان کی خدمت میں پایا، طلبہ کی خوبیوں پر انداز شاباش و آفریں جو ان کے یہاں دیکھا، وہ میرے لئے نادر تو تھا ہی لیکن صرف اتنا ہی نہ تھا، علم کی گیرائی و گہرائی، ذہانت کی قوی گرفت، دلائل کی قوت اور طلبہ کو مطمئن کرنے کا وہ سلیقہ بھی ملا کہ طبیعت کو کہیں سے بے اطمینانی اور کمی کا احساس نہیں ہوا۔'' (سراپا اعجاز ۴۵۰-۴۵۱)

مولانا مرحوم جمعیۃ علما کے فدائی تھے اور اس کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ آس پاس کے قصبات و قریات کا سفر درپیش ہو یا دور دراز مقامات کا، وہ بلا توقف رخت سفر باندھ لیتے تھے۔ وہ جمعیۃ علما کے شارح اور پالیسی ساز سمجھے جاتے تھے۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے چند فقرے بڑے بڑے مسائل کی گرہیں کھول کر رکھ دیتے تھے۔ کسی مجلس کا ایجنڈا لکھنا ہو، تجاویز مرتب کرنی ہوں یا جماعت کی تاریخ اور خدمات پر روشنی ڈالنے کا سوال ہو تو ذمہ داروں کی نگاہ انہی کی طرف اٹھتی تھی۔ لیکن جماعت کی تاریخ میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جب مولانا جیسی باصلاحیت اور عبقری شخصیت کو باہر کا راستہ دکھایا گیا تب تو انہیں کہنا پڑا:

حق کو جب ٹھیس لگے گی تو میں یاد آؤں گا
سونی محفل کی اداسی کو بھی گرماؤں گا

فی الاصل وہ علما کی انقلابی جماعت کی تاریخ اور کردار کا RESTORATION (بحالی) چاہتے تھے اور بدلتے ہوئے حالات میں وقتی و ہنگامی سیاست سے اس کو دور رکھنا چاہتے تھے۔ جب کہ اس جرم بے گناہی کی سزا انہیں ہی نہیں بلکہ ان کے ہم خیال ساتھیوں کو بھی دی گئی۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی علیہ الرحمہ نے کیسی خدا لگتی بات کہی ہے:

''دور حاضر کی انتظامی سیاست خواہ وہ ملکی پیمانے کی ہو یا کسی ادارہ و تنظیم چلانے کے پیمانے کی ہو، اس روشنی طبع کو برداشت نہیں کرتی۔ آج کی اصطلاح میں اس روشنی طبع اور شجاعت و بے خوفی کو خودداری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ خودداری بسا اوقات کبر کی سرحد میں داخل ہو جاتی

ہے، مگر مولانا کبر ونخوت سے بہت دور تھے۔ وہ شجاع تھے متکبر نہ تھے، وہ صاحب رائے تھے مگر ضدی نہ تھے، وہ حق بات بے تکلف کہہ دیتے تھے مگر دل میں کینہ بالکل نہ رکھتے تھے، وہ اپنی بات پر بڑے پختہ تھے مگر دوسروں کی بات بڑے حوصلے اور وسعت سے سنتے تھے لیکن بسا اوقات سیاست کو ان کی یہ پختگی ناگوار ہوتی تھی۔'' (سراپا اعجاز: ص ۴۵۶)

ایسا بھی نہیں کہ جماعت کو خیرباد کہنے کے بعد انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہو یا اس کو سب وشتم کا نشانہ بنایا ہو یا اپنی ڈگر سے ہٹ گئے ہوں بلکہ وہ بدستور سرگرم عمل رہے اور جہاں بھی رہے اپنے منصب ومقام کا حق ادا کرتے رہے۔

مولانا کی آخری کارگاہ گورکھپور کی سرزمین بنی جہاں انہوں نے آسن جمایا اور بنجر زمین کو کاشت کے قابل بناڈالا۔ ابھی انہوں نے وہاں داغ بیل ڈالی تھی کہ علالت اور معذوری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے وطن رگھولی (ضلع مئو) میں جا کر پڑ گئے۔ سیماب صفت بزرگ جنہوں نے ملک کی وسعتوں کو ناپ ڈالا تھا اب چھوٹے سے گاؤں میں بستر پر دراز تھے، اب نہ مسائل پر غور وخوض تھا، نہ مباحث کا سلسلہ، نہ باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ۔ چند لوگ تھے جو کبھی کبھار ملنے کے لیے چلے جاتے تھے لیکن وہ محبین جھانکنے بھی نہیں آئے جن کی محبت میں انہوں نے خدا جانے کیسے کیسے ہفت خواں طے کر ڈالے تھے۔

راقم کو مولانا کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی اور کبھی کبھی ملاقات کی غرض سے ان کے پاس چلا جاتا تھا لیکن مولانا بات نہیں کر پاتے تھے۔ سلام ودعا کے بعد مکمل سکوت ہوتا تھا۔ اس وقت مولانا عثمان ساحؔر کا وہ مشہور شعر جو انہوں نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد علیہ الرحمہ کی موجودگی میں پڑھا تھا۔ مجھے بے اختیار یاد آجاتا اور میں زیر لب گنگنانے لگتا۔ ابھی پھر یاد آگیا ہے اس لیے یہاں نقل کیے دیتا ہوں تاکہ قارئین بھی شیئر کر لیں:

نہ کچھ کہنے کی ہمت ہے نہ کچھ کرنے کی طاقت ہے
انہیں بس دیکھتے رہیے کہ یہ موقع غنیمت ہے

مولانا سے پہلے ہم نے کئی ایسے بزرگوں کی کس مپرسی دیکھی ہے جو صف اول کے قائد سمجھے جاتے تھے۔ قوم نے دوسرے انداز سے ان کی بے توقیری کی تھی لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ

اس جماعت نے بھی ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جس کے لیے انہوں نے جان کھپائی تھی۔ یہاں صرف ایک نام مولانا محمد قاسم شاہ جہاں پوری کا لوں گا، تاکہ دعوی بے دلیل نہ رہ جائے۔ حکایتیں بھی بہت ہیں شکایتیں بھی بہت، پر کس کو سنائی جائیں، جب سننے کا یارا نہ ہو۔ مولانا جو ہر بستر علالت پر دراز تھے تب بھی اور جب دنیا سے کوچ کر گئے تو اس وقت بھی ہمارے قدآور رہنما رگھولی کے پاس سے گزر گئے مگر قائد مرحوم کی عیادت کو آئے، نہ پرسہ دینے کی نوبت آئی۔ یہ ہمارا قومی المیہ ہے۔

مولانا سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ وہ کسی متعین پروگرام کے بغیر بھی بلا تکلف اور بلا اطلاع چلے آتے تھے، ایک دو دن قیام فرماتے بات چیت ہوتی، مشورے ہوتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مولانا نے جانے کا ارادہ کیا، ہم نے رکنے کے لیے کہا، پھر کسی ضرورت سے تھوڑی دیر کے لیے کہیں چلے گئے اور جب لوٹ کر آئے تو معلوم ہوا کہ مولانا چلے گئے۔ ان کے پیچھے دوڑے دوڑے گئے مگر مولانا حسب عادت تیز قدموں سے گلی پار کر کے مین روڈ تک پہونچ گئے اور رکشہ پر بیٹھ کر روڈویز چل دیے۔ کبھی ہماری درخواست پر تشریف لائے اور ہم نے وقت رخصت زادسفر پیش کرنے کی جرأت کی تو مسکراتے ہوئے چل دیے اور معذرت کر لی۔ اسی بنا پر کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا موجودہ دور کے آدمی نہیں لگتے تھے۔ صحیح معنوں میں وہ نمونہ اسلاف تھے۔ ان کی یہی ادائیں تھیں جنہوں نے دوست دشمن سب کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

کسی بھی میٹنگ میں انہیں شرکت کی دعوت دینے کے بعد ہمیں زیرباری اور پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ گھر کے ایک فرد کی طرح آتے اور خوشی خوشی لوٹ جاتے تھے۔ ان کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ اپنے ڈھب کے آخری آدمی تھے۔ وہ سانچے کبھی کے ٹوٹ گئے جن میں مولانا افضال الحق جوہر قاسمی جیسی شخصیتیں ڈھلا کرتی تھیں۔ اب تو مردم سازی کے کارخانے بھی مضمحل ہوتے نظر آرہے ہیں۔ ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آتی ہے۔ سارے پیمانے بدل گئے، کیفیات بدل گئیں، طور طریق بدل گئے۔ دل جیتنے والے گزر گئے۔ للّٰہ فی اللہ محبت کرنے والے جا چکے۔

کیا لوگ تھے جو راہ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

جوہر نایاب

مولانا ڈاکٹر محمد رشاد قاسمی صاحب
ابن حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

والد محترم حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی نوراللہ مرقدہ ایک نایاب شخصیت تھے۔علم وعمل ،تقوی، سادگی صبر وقناعت کے پیکر مجسم تھے۔آپ کی ولادت ۱۹۲۳ء میں ہوئی اور نومبر ۲۰۱۲ء مطابق ۱۵ محرم ۱۴۳۴ھ کو رب حقیقی سے جا ملے۔انا اللہ وانا الیہ راجعون

والد صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا امین الحق صاحب کے یہاں رگھولی میں اور پھر فیض آباد میں حضرت حاجی عبدالرحیم شاہ فضلی کے زیر سایہ رہ کر حاصل کی۔پھر دارالعلوم مئو گئے اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد درس وتدریس کا آغاز مولانا امین الحق صاحب کے ہم سبق مولانا حکیم الدین صاحب کے اصرار پر مدرسہ جامع العلوم جین پور سے کیا۔

والد صاحب جس زمانے میں جین پور میں تھے ،جمعرات کی شام میں چھٹی ہونے کے بعد اکثر اپنے نانیہال اور سسرال پیدل ہی تشریف لے جاتے ،جو تقریباً ۲۲ رکلومیٹر کی دوری پر ہے۔اور سنیچر کی صبح مدرسہ پہونچنے میں کبھی تاخیر نہیں ہوئی۔جین پور کے بعد پھر نورالعلوم بہرائچ تشریف لائے اور مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ وہاں تدریس میں مشغول ہوگئے۔پھر وہاں سے مدرسہ فرقانیہ گونڈہ تشریف لائے۔مدرسہ فرقانیہ میں ۱۷ رسال تدریس واہتمام کی خدمات انجام دیں۔اس وقت وہاں علاقے میں خاص طور سے دیہاتوں میں بدعت وجہالت اور غیر مقلدیت کا غلبہ تھا۔ہر جمعرات کو پیدل پانچ دس کوس کے اندر کسی نہ کسی علاقے کا دورہ کرتے۔

پیدل اس قدر تیز چلتے تھے کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ ساتھ چلنے والوں کی آدھی تعداد دوڑ کر ان کے پیدل کا ساتھ دے پاتی تھی۔ واپسی مغرب بعد یا عشاء کے بعد ہوتی۔ آخر میں کسی بات کے پیش آنے پر مدرسہ فرقانیہ کو جسے آپ نے خون پسینے سے سینچا تھا، الوداع کہہ کر چل دیئے۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکایت۔ مجھے یاد ہے کہ جب والد محترم ریلوے اسٹیشن پر تھے تو پورا پلیٹ فارم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رخصت کے وقت صرف ریل کی سیٹی سن کر مجمع آبدیدہ ہوگیا۔ اگر آپ چاہتے تو دوسرا ادارہ قائم کر لیتے، کچھ لوگوں نے اس کے لیے کہا بھی مگر واہ رے آپ کی عزیمت! گردن اقرار نہیں ہلائی اور مدرسے اور محلے اور شہر کے لوگوں کو روتا ہوا چھوڑ کر خود بھی آبدیدہ چلے آئے۔

گونڈہ سے آنے کے بعد والد محترم جمعہ کی نماز کے لیے گھوسی تشریف لے گئے تو جمعہ میں ایک شخص زار و قطار روتا ہوا ملا۔ والد صاحب نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے؟ تو اس بوڑھے شخص نے اپنی کہانی سنائی۔ والد صاحب نے فرمایا کہ میں تو دعا تعویذ نہیں جانتا لیکن وہ آدمی بضد رہا۔ پھر حضرت مولانا نے کچھ دعائیں اور ترکیبیں بنادیں۔ اس کے بعد بہت غور وفکر کے بعد خدمت خلق کی نیت سے یہ کام بھی شروع کر دیا جس کا لاکھوں لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس درمیان عام عادت کے مطابق بہت سے لوگوں نے نذرانہ پیش کرنا چاہا، جسے سختی سے منع فرمادیا۔ نہ کبھی نذرانہ لیا، نہ بڑکپن اور کبھی سرکاری رعب قبول کیا۔

حضرت مولانا کے دادا حضرت حاجی عبدالرحیم فضلی صاحب جو حضرت شاہ فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے مرید تھے اور شاہ صاحب کے داماد وخلیفہ حضرت مولانا عبدالکریم صاحب سے خلافت واجازتِ بیعت حاصل تھی۔ منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی توجہ باطنی سے ذکر الٰہی میں اس قدر منہمک ہوئے کہ سروس چھوڑ کر پیدل مدینہ منورہ چلے گئے، پھر امام مسجد نبوی کے حکم پر ہندوستان واپس تشریف لائے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ آنا جانا دونوں پیدل ہی ہوا۔

والد صاحب کی تربیت حضرت حاجی صاحب ہی کے زیر سایہ ہوئی ہے۔ والد صاحب جب پہلی بار حج کے لیے تشریف لے جارہے تھے تو ان کے پاس چار جوڑے کپڑے تھے۔ فرمانے لگے کہ اتنے کپڑے کیا کروں گا؟ گھر کے لوگوں نے کہا کہ وہاں کہاں دھوئیں گے؟ تو کہنے لگے کہ

ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے چلو رکھ دو۔اس کے بعد فرمایا کہ دادا ہم لوگوں کو کپڑے پر پیوند لگانے کے لیے کہا کرتے تھے، کسی صاحب نے اس پر ٹوکا تو فرمانے لگے کہ اچھی عادت ہے، بنی رہے گی تو کام آئے گی۔ والد صاحب نے پوری زندگی اسی سادگی کے ساتھ گزاری ہے۔

سادگی اور قناعت کا مظاہرہ حضرت حاجی صاحب کی عادت میں داخل تھا، والد صاحب خود بیان فرماتے تھے کہ دادا مرحوم کے یہاں لوگ اپنی ضرورت کے لیے آتے اور گھر لے جانے پر اصرار کرتے، دادا صاحب ہامی بھر لیتے تو کبھی کبھی گاڑی دروازے پر آ کر کھڑی ہو جاتی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اکا دکا گاڑیاں ہوا کرتی تھیں، اور گاڑی میں بیٹھنا ایک فخر اور شان کی بات ہوتی تھی۔ دادا صاحب گاڑی میں بیٹھنے سے پرہیز کرتے تھے اور فرماتے کہ آپ چلیں میں رکشہ سے آجاؤں گا۔ والد صاحب نے ایک مرتبہ ان کی اس عادت کے بارے میں پوچھ لیا کہ گاڑی آنے کے باوجود آپ رکشے کو کیوں ترجیح دیتے ہیں؟ دادا صاحب فرمانے لگے کہ ”شان وشوکت اور دوسروں کے احسان سے بچنا چاہئے۔“

اس عظیم فکر اور شان وشوکت اور دکھاوے سے دور رہنے والی ہستی نے والد صاحب کی تربیت کی جس کی جھلک تادم آخر تربیت یافتہ عظیم شخصیت میں موجود رہی، جس کا نمونہ والد صاحب کی زندگی میں ہم نے اور پوری ایک دنیا نے دیکھا کہ اگر والد صاحب فرماتے تو ان کے لیے ان کی اولاد اور ان کے چاہنے والوں کو گاڑی رکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن سلام اس مرد مجاہد کو جس نے اپنی آمد ورفت کے لیے ایک رکشہ رکھ لیا اور اسی سے گورکھ پور آنا جانا ہوتا تھا۔ یہ وہی تربیت تھی جسے حاجی صاحب نے فیض آباد میں اپنے پوتے کو دی تھی، جو ان کی رگ رگ میں اس طرح بسی رہی کہ دوران سفر رکشہ، سائیکل، موٹر سائیکل کے ذریعہ اپنے اسفار مکمل کر لیتے۔

والد صاحب جب بھی تعطیل میں گھر آتے تو دروازے پر چارپائی قلم کاغذ اور کتابوں کے ساتھ تشریف فرما ہوتے۔ ہر دم ان کا قلم چلتا رہتا درمیان میں کوئی آ گیا تو علیک سلیک، اور پھر وہی قلم اور کاغذ۔

سفر والد صاحب کا بے تکلف مشغلہ تھا، عام لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ بار بار آنے جانے میں تکلف محسوس کرتے ہیں۔ والد صاحب بس اٹھے اور چل دیے، نہ کوئی ریزرویشن، اور نہ

کوئی سفر کا اہتمام۔ بارہا تو میں نے دیکھا ہے کہ اپنے بیگ پر ہی بیٹھ کر چل دیتے اور رات میں اسی پر بیٹھے بیٹھے ٹیک لگا کر سو لیتے۔

والد صاحب ایک بار مدرسہ قاسمیہ گیا جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے، وہاں ٹرین سے اتر کر مدرسہ نہ جا کر اپنے گاؤں کے خاص دوست بچپن کے ہم سبق اور بہار ٹریفک پولس میں تعینات مولوی عبدالحی صاحب کے یہاں چلے گئے۔ مدرسہ کے لوگ اسٹیشن پہونچے تو والد صاحب کو نہ پا کر تشویش میں پڑ گئے۔ اس وقت فون وغیرہ کی سہولیات تھیں نہیں، انتظار و تلاش کے بعد مدرسہ واپس ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد والد صاحب بھی مدرسہ پہونچ گئے۔ لوگوں نے پوچھا تو فرمایا کہ گیا آ کر عبدالحیؒ سے نہ ملوں، یہ گوارا نہ ہوا۔ اور مدرسہ والوں سے فرمایا کہ ایک نہیں دو مولوی آ گئے ہیں۔ یہ تھا بچپن کے تعلق کا لحاظ اور اپنائیت کا قرینہ اور سادگی کا نمونہ جسے والد صاحب نے کر دکھایا۔

والد محترم نے کبھی بھی اپنے لڑکوں سے کوئی چیز طلب نہیں کی، ہاں ایک بار گورکھ پور جاتے ہوئے فرمانے لگے کہ کچھ روپئے ہیں؟ زہے نصیب والد صاحب نے کچھ کہا تو۔ میں فوراً بھاگا ہوا گھر میں گیا اور جتنے روپئے تھے لا کر سامنے رکھ دیا۔ اس میں سے صرف دو ہزار لیے اور فرمانے لگے کہ آج مدرسہ کے مطبخ میں بچوں کے لیے کچھ تھا نہیں۔ ایسا تھا طلبہ کے ساتھ ان کا خلوص اور ان کی فکرمندی۔

اپنے بچوں کی تربیت میں والد صاحب نے اپنا رنگ، دادا میاں کی جھلک اور شریعت کا پورا پاس و لحاظ رکھا۔ والدہ محترمہ کی سخت علالت جو مرض الموت ثابت ہوئی، کو بھی تعلیم کی راہ میں تاخیر کا سبب نہیں بننے دیا۔ گونڈہ جانا تھا، وقت کی پابندی اور بچوں کی تعلیم کی خاطر لے کر چل دیئے حالانکہ ایک ہفتہ بعد ہی والدہ محترمہ کا وقت موعود آ پہونچا اور ہم کو بن ماں کا کر کے چل دیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اطلاع ملنے پر ہم لوگوں کو لے کر والد صاحب فتح پور تال نرجا کے لیے روانہ ہوئے، راستے میں بس پر کشتی پر اور گھوسی سے بذریعہ رکشہ فتح پور پہونچے۔ مجھے یاد ہے کہ اس سفر میں ہم لوگوں کو رکشہ پر بٹھا کر خود بالو بھری پگڈنڈی پر رکشہ کو پیچھے سے دھکا دیتے ہوئے لگ بھگ سات

کلومیٹر کا سفر طے کیا۔عشا کے وقت ہم لوگ پہونچے، ہم بھائیوں نے بہت تلاش کیا لیکن ماں کو نہ پا سکے، والد صاحب کی طرف دیکھا تو خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں مل سکا۔ چند دنوں کے بعد پھر وہی زندگی، تعلیم کے لیے گونڈہ روانہ ہوتے وقت ماں کے بغیر وطن سے روانہ ہونے کا وہ منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے تازہ ہے، اور اب تو باپ کی رفاقت بھی نہ ہونے کی وجہ سے یتیمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ خدا ان دونوں روحوں کے درجات سنوار دے جنھوں نے ہم لوگوں کو سنوارنے کے لیے تن من دھن آخری سانس تک لگائے رکھا۔

میں نے اپنے ایم ڈی کے تحقیقی مقالہ میں ان حضرات کا ذکر کر کے اپنی تحقیق کو ان الفاظ میں معنون کیا:

> ''والدہ مرحومہ کے نام جو مرض وفات میں بھی تعلیم کے لیے جدا کرتے وقت علم کی راہ میں آنسوؤں کو پی لینے کا درس دے گئیں۔ والد محترم کے نام جو سایۂ علمی ہونے کے ساتھ ساتھ تمام مسائل اور تعلیم کے درمیان ایک دیوار بن کر تعلیم اور صرف تعلیم کی تلقین کرتے رہے۔ اپنی ہمشیرہ محترمہ کے نام جس کا دست شفقت ممتا کا آئینہ دار ہے۔''

تو ہمارے ممتحن ڈاکٹر جمیل احمد پرنسپل یونانی وآیورویدک کالج دہلی نے میرے محترم استاذ حکیم رفیق الدین صاحب ریڈر اجمل خان طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے فرمایا کہ میں نے تو جب انتساب دیکھا تبھی اس طالب علم کے بارے میں حسن انتخاب کی داد دیدی۔

والد صاحب مدرسہ دارالعلوم رحیمیہ رگھولی گھوسی مئو کے بانی اور آخری سانس تک اس کے سرپرست رہے۔ اور ہم لوگوں کی سرپرستی بھی فرماتے رہے۔ اس مدرسہ کی بنیاد والد صاحب نے اپنی خاندانی زمین میں رکھی۔ اس مدرسہ کے قیام میں والد صاحب کے ہم جولی سید حسن صاحب کا خاص عمل دخل رہا ہے۔ سید چچا مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ بابا یعنی شاہ عبدالرحیم فضلی کے نام پر مدرسہ کھولو، ان کی برابر تاکید، ضد اور اصرار نے مدرسہ کا قیام کرایا۔ تاسیسی پروگرام میں حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ تشریف لائے اور والد صاحب اور مولانا نے مل کر اس مدرسہ کی بنیاد رکھی۔

مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب والد صاحب کے خاص شاگرد تھے، استاذ وشاگرد کے درمیان تعلق ومحبت مثالی تھی۔ایک صبح مدرسہ کی بنیاد رکھنے کا پروگرام بنا تو والد صاحب نے برادر خورد محمد عارف سلمہ کو موٹر سائیکل سے مولانا کو لانے کے لیے بھیج دیا، اور مولانا حاضر ہوئے۔میں نے از راہ مذاق مولانا سے کہا کہ حضرت! آج تو ولید پور بھیرہ سے موٹر سائیکل کے ذریعہ رگھولی آنے میں کافی پریشانی ہوئی ہوگی؟ سنیے اس عظیم شاگرد کا جواب۔''ابے! یہ تو موٹر سائیکل تھی اور عارف گیا تھا، رگھولی کے نام پر اگر کتا بھی چلا جاتا تو اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آجاتا۔'' قربان جائیے اس خلوص پر، جان نچھاور کیجیے ایسی شاگردی پر، اور داد دیجیے ایسے رشتے کی۔خدا غریق رحمت کرے اس عظیم شخصیت کو۔آمین

افسوس کہ والد صاحب کی رحلت کے ایک سال بعد یہ سایہ بھی ہم لوگوں کے سر سے اٹھ گیا اور ہم لوگ اس علمی بادل سے بھی محروم ہوگئے۔

والد صاحب کے مضامین، رسالے، کتابیں شائع کرنے اور ان کے جواہر پاروں کی ترتیب وتدوین کا کام ان شاء اللہ جلد شروع کیا جائے گا۔والد صاحب کے انتقال کے بعد یہ کام ان کے شاگرد خاص اور ہمارے سرپرست ومربی حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نے شروع کیا تھا مگر ان کی رحلت کی وجہ سے ممبئی، اعظم گڑھ اور رگھولی میں بکھرے اوراق کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔اللہ تعالی اس کام میں ہماری مدد فرمائے۔آمین

اللہ تعالی مجھے اور سبھی وارثان حضرت مولانا جوہر قاسمی اور خاندان رحیمی کو حضرت حاجی عبدالرحیم فضلی اور حصرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کے نقوش قدم پر چلنے اور پابند رہنے کی سعادت بخشے۔آمین

❑❑❑

ڈھونڈیں اب نقوش سبک رفتگاں کہاں

مولانا محمد راشد صاحب قاسمی
ابن حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

اللہ تعالی نے مادر علمی دارالعلوم دیوبند کو ان نورانی شخصیتوں کا مرکز بنایا تھا جنہوں نے اپنے علم و فضل، سیرت و کردار، جہد و عمل، ورع و تقوی، سادگی و انکساری اور خشیت و انابت میں قرون اولیٰ کی یاد تازہ کردی تھی۔ ان نورانی شخصیتوں میں ہمارے شیخ الاسلام حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ بہت نمایاں تھے۔ والد صاحب انہیں کے تربیت یافتہ تھے۔ شریعت و طریقت کا حسین امتزاج، نیز اسلامی تعلیمات کی خوشبو جو حضرت نے چہار دانگ عالم میں پھیلائی تھی، اس سے وہ پوری زندگی معطر رہے اور اس کی عطر بیزی میں مشغول رہے۔

والد صاحب فرماتے تھے کہ ''حضرت مدنی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شفقت و رحمت نے مجسم ہوکر انسانی وجود اختیار کرلیا ہے۔'' سبحان اللہ

حضرت مدنی سیاسی طور پر متحدہ ہندوستان کے قائد اور رہنما تھے۔ فراغت کے بعد والد صاحب متحدہ ہندوستان، کانگریس اور حریت پسند پارٹیوں کے پر جوش حامی اور مؤید بن گئے۔ بہرائچ میں قیام کے دوران (۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک) پاکستان کا نعرہ بلند ہونے لگا تھا۔ لیگی سبز وردی میں ملبوس زوردار جلوس اور دھرنے دینے لگے تھے۔ ان کا نعرہ تھا:

مرجائیں گے مٹ جائیں
پاکستان بنائیں گے

یہ پاکستان اردو نہیں بلکہ P پنجاب، A آسام، K کشمیر، S سندھ سے مل پاکستان کر بن گیا۔ مولانا محمد میاں دیوبندی نے اپنی کتاب ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' میں اس کی حقیقت یعنی فلسفہ دوقومی نظریہ کو خوب اچھی طرح عیاں کیا ہے۔ بہرکیف والد صاحب بھی حضرت مدنی، مولانا آزاد، ڈاکٹر مختار انصاری، مہاتما گاندھی اور نہرو اور حریت پسند تنظیموں کے جلسوں میں شرکت کے لیے دور دراز علاقہ کا سفر کرتے تھے اور دوقومی نظریے کے سخت مخالف تھے۔ والد صاحب گرفتار ہوئے پھر چھوٹ گئے۔ بڑے ابا ہنسور میں گرفتار ہوئے پھر چھوٹ گئے۔ بڑے ابا سے کسی نے کہا کہ تم بھی تھانے سے سارٹیفیکٹ لے لو۔ فرمایا کہ حضرت مدنی نے ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز واپس کر دیا تو میں سارٹیفیکٹ کیسے لے لوں؟۔

خصوصی اوصاف:

و اذا قلتم فاعد لوا و لو کان ذا قربیٰ و بعهد ا الله او فوا. والدصاحب مذکورہ آیت کے عملی نمونہ تھے۔ افرادخانہ، بیرون خانہ سماجی ارکان، اساتذہ کرام اور طلبہ بخوبی جانتے ہیں کہ والدصاحب اعتدال پسندی، غیر جانب داری، ایفاء عہد اور صدق وصفا کے پیکر تھے۔ اور اس کی انوکھی تربیت بھی فرماتے تھے۔ امانت داری ان کی امتیازی خصوصیت تھی۔ چنانچہ اختلاف کے باوجود ۷۰ر سال اپنی مستعار زندگی مدارس اور تنظیمی اداروں میں فنا کرنے کے بعد بھی ماشاء اللہ مالیاتی امور میں بالکل صاف ستھرے نکلے۔ مولانا باقر حسین صاحب دارالعلوم بستی نے ۱۹۹۵ء میں ریاض میں قیام کے دوران ایک مجلس میں فرمایا کہ: ''حافظ اقبال صاحب سابق مہتمم مدرسہ فرقانیہ گونڈہ نے کہا کہ ایک مرتبہ ارادہ ہوا کہ مولانا کا پرانا ریکارڈ دیکھا جائے، تو میں نے اور منشی صاحب نے چیک کیا تو ۱۶/۱۸ سال میں کہیں کوئی خرد برد، نقص وکمی اور حساب کتاب میں ہیرا پھیری نہیں ملی۔ مجھے مولانا کی امانت داری پر رشک آنے لگا اور شدید حیرت ہوئی۔'' مجھے یہ سن کر بہت فرحت ہوئی اور ایک انبساطی کیفیت چھا گئی۔ فرحت کیوں نہ ہوتی، ہمارے نبی مکرم ﷺ کی امتیازی صفت صداقت وامانت ہی تو تھی۔

والد صاحب ۱۹۶۵ء میں مدرسہ فرقانیہ کے مہتمم تھے اور اس وقت ان کی تنخواہ ۱۶۵ر روپے تھی۔ اگر کہا جائے کہ والد محترم اپنے وقت کے ابوذر غفاری تھے تو غلط نہیں ہوگا۔

۱۹۷۸ء میں والد صاحب جمعیۃ کے منیجر تھے۔ یومیہ تنخواہ بیس روپے تھی مگر مہمانوں کی آمد کی وجہ سے بیس روپے کی چائے آجاتی تھی۔ دو روپے کیتلی اس وقت چائے ملا کرتی تھی۔ دفتر الجمعیۃ سے پیشگی رقم لے کر کام چلتا تھا۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ دفتر کے مہمان زیادہ ہوتے ہیں، اسی میں ڈال دیا کریں تو سخت ناراض ہوگئے۔ والد صاحب آئی، ٹی، او، پر نہیں بلکہ گلی قاسم جان میں رہتے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں سال بھر میں ان کے ساتھ رہا۔

شجاعت، فراخی اور سخاوت:

والد صاحب کی سخت مزاجی کا بعض لوگ پروپیگنڈا کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خلاف شرع، ناحق جانب داری، مداہنت، رواداری اور مصالح کو مقدم رکھنا سخت معیوب سمجھتے تھے۔ اور ان عادات کو برداشت کرنا بھی ان کے لیے مشکل ہوا کرتا تھا۔ طبیعت میں سخاوت، فراخی، غیرت اور خودداری نیز شجاعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب کہ لوگ اس کے خواہاں رہتے ہیں کہ مجالس میں صرف مدح سرائی ہو۔ سخت مزاجی اور سخت گیری جس کا لوگ رونا روتے ہیں، اس کے باوجود ان کا عفوودرگزر بے مثال تھا۔ معافی مانگتے ہی ان کا غصہ کافور ہوجاتا تھا۔ ان کے تلامذہ اور مدارس کے اساتذہ اس کا اعتراف کرتے تھے۔ یہ خوبی استاذ محترم مولانا وحید الزماں صاحب کے یہاں بھی تھی کہ مولانا کے کمرے میں قدم رکھنا ان کے غصے کے ازالہ کے لیے کافی ہوتا تھا۔

مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی ۷؍اکتوبر ۱۹۹۴ء میں ابنائے قدیم کی دعوت پر ریاض تشریف لے گئے تھے۔ ابنائے قدیم کی مجلس میں فرمانے لگے کہ ''تمہارے ابا تو جمعیۃ کی میٹنگ میں بعض مرتبہ اتنی جرأت کا مظاہرہ کرتے تھے کہ سب کو حیرت ہوتی تھی۔ صدر محترم تمہارے ابا کی حق گوئی گوارہ نہیں کرپاتے تھے، میں دنگ رہ جاتا تھا۔ اتنی ہمت تو میں بھی نہیں کرپاتا تھا۔''

یہی وجہ ہے کہ وہ عاملہ کے رکن نہیں بن سکے اور مدعو خصوصی کا خط جاتا تھا اور پھر وہ بھی کچھ سالوں کے بعد بند ہوگیا۔

والد صاحب نے یوپی جمعیۃ علما ہند کی صدارت کے لیے انتھک کوشش کی، جبکہ شاہد

فاخری الٰہ آبادی بھی اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔انہوں نے ایک مرتبہ والد صاحب سے سوال کیا کہ مولانا اسعد صاحب کے لیے آپ کیوں اتنی محنت کر رہے ہیں؟ والد صاحب نے بے ساختہ جواب دیا کہ ''شیخ زادہ واستاذ زادہ پر میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔'' اس طرح حضرت مولانا اسعد صاحب یوپی جمعیۃ کے صدر بن گئے اور شاہد فاخری نے جمعیۃ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

امارت شرعیہ کے قیام کے بارے میں مولانا اسرارالحق صاحب نے فون کیا۔والد صاحب نے مولانا تھانوی کا حوالہ دیا کہ وہ شرعی پنچایت کے قائل ہیں۔مولانا نے والد صاحب کی رائے صدر جمعیۃ علما ہند کو بتلائی، جو کہ ان کے منشا کے خلاف تھی۔لہٰذا پھر انہوں نے والد صاحب کو مشورے میں نہیں بلایا اور اس طرح رفتہ رفتہ دوریاں بڑھتی گئیں۔آخر کار ۱۹۸۸ء کے شروع میں والد صاحب، مولانا وحید الزماں صاحب، مولانا عبداللہ مغیثی صاحب، مولانا سید احمد ہاشمی صاحب مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب، مولانا صادق صاحب اور ناز انصاری صاحب کی جمعیۃ علما کی رکنیت چھ سال کے لیے منسوخ کر دی گئی۔کانگریس کی عاملہ میں اس طرح کے فیصلے ہوتے رہتے تھے۔

نظم وضبط اور تربیت کے اصول:

والد صاحب طبیعتاً منتظم مزاج واقع ہوئے تھے، سفر وحضر میں ڈائری ساتھ رکھتے تھے جس میں آمد ورفت اور دیگر اخراجات کا اندراج ہوتا تھا۔ضرورت کے سامان کے لیے جو رقم دیتے تھے اس کا حساب لکھ کر دینا پڑتا تھا۔مدرسہ اور اندرون خانہ ایک ہی اصول تھا یہ الگ بات ہے کہ چار آنہ آٹھ آنہ الگ سے عنایت کر دیں۔نیز پیسے دیتے وقت یہ تاکید فرماتے تھے کہ راستے یا بازار میں حتی کہ بیرون خانہ قطعاً کوئی چیز نہ کھائی جائے، جو چیز کھانا ہو وہ خرید کر گھر لائی جائے۔بیرون خانہ اگر کوئی چیز کھاتے ہوئے دیکھ لیتے تو تنبیہ فرما کر تربیت کا حق نقد ادا کرتے تھے۔طلبہ میں ترفع وخود پسندی کا شائبہ محسوس کرتے تو ہمدردانہ انداز میں تنبیہ وتربیت فرماتے۔اکثر خود بھی یہ دعا پڑھتے تھے: **اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا واجعل فی اعین الناس کبیراً.** اور اس دعا کی تلقین بھی کرتے رہتے تھے۔

یہ بھی ان کا مزاج تھا کہ خود پیچھے رہ کر دوسروں کو صف اول میں رکھا جائے۔ تربیت کا یہ انمول موتی ہاتھ آجائے تو بہت سے اخلاقی مسائل حل ہوجائیں۔ ویسے بھی کسی کو آگے بڑھا کر عظمت دینا بڑا کام ہے۔ اور یہ بڑا کام صرف بڑے ہی لوگ کر پاتے ہیں۔

دارالعلوم گورکھ پور میں والد صاحب ۱۹/سال رہے۔ اور عجیب شان فقیری کے ساتھ رہے۔ مٹی کے حجرے میں خود رہتے تھے اور پختہ کمروں میں طلبہ کی رہائش تھی۔ مولانا عمید الزماں صاحب ۲۰۰۵ء میں شاہی مہمان کی حیثیت سے سعودی عرب تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع سے دو تین روز میں بھی ان کے ساتھ رہا۔ ایک دن کہنے لگے کہ ''صدر ابنائے قدیم اور مہتمم دارالعلوم گورکھ پور کا کمرہ دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ وہی دفتر بھی ہے، چائے خانہ بھی ہے اور فراش خانہ بھی۔ اس طرح کیسے رہتے ہیں؟'' میں نے کہا کہ انہوں نے پوری زندگی اسی طرح گزاری ہے۔ ان کی پوری زندگی اس حدیث کی مصداق تھی ''**کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل.**''

تم کیا گئے کہ رونق ہستی چلی گئی:

باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، دنیا کی ہر شخصیت خواہ کتنی ہی دلکش، کتنی ہی پُر بہار اور کتنی ہی زندگی افروز ہو، بالآخر اسے ایک نہ ایک دن جانا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں یہ مسلم حقیقت عموماً نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے جیسے یہ کوئی حقیقت نہیں۔ پھر یہ دنیا مسافر خانہ ہے، ہمیشہ رہنے کے لیے کوئی نہیں آتا مگر ان کے وجود سے ڈھارس بندھی رہتی تھی۔ ذاتی، خاندانی، سماجی اجتماعی اور دقیق سے دقیق ملی مسائل منٹوں میں سلجھا دیتے تھے۔ وہ اعتدال وتوازن اور رعایت حقوق اب کہاں میسر ہوگی۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد خاندانی مسائل جو پیدا ہوئے وہ الجھتے ہی چلے گئے اسی لیے میں نے علی گڑھ میں قیام کو مناسب سمجھا۔ یاالٰہی! یہ کیسی آزمائش ہے۔ **ان هذا لبلاء عظيم .اللهم لا ملجا ولا منجا الا اليك**

والد صاحب چار سال تک مستقل صاحب فراش رہے۔ اپنے جسم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ لیکن اس وقت بھی ہم لوگوں کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اب بھی بڑے سے بڑا پہاڑ اٹھا سکتے ہیں۔

اللہ تعالی والد صاحب پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے۔ اپنے اخلاص مجاہدانہ عزم وعمل اور پر خلوص خدمات کی وجہ سے علمی وملی حلقوں میں ہردلعزیز شخصیت کے مالک تھے۔ میرا خیال ہے کہ جو بھی علم ودین کی کچھ قدر اپنے دل میں رکھتا ہے اس کے لیے بھی ان کی وفات عظیم سانحہ ہے۔

ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب

ربنا اغفرلی وللمومنین والمومنات الاحیاء منهم والاموات

❑❑❑

وہ مرد قلندر

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی
استاذ جامعۃ الفلاح بلریا گنج

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی کا ننھیال اور سسرال دونوں ہمارے گاؤں فتح پور تال نرجا میں ہے۔ وہ ہمارے یہاں بکثرت آیا کرتے تھے اور اہل فتح پور کے لیے ان کی شخصیت غیر معروف نہیں تھی، بلکہ بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ یادداشت کو کریدنے کے باوجود مجھے یہ یاد نہیں آرہا ہے کہ کب انہیں سب سے پہلے دیکھا ہے، بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ کب سے انہیں نہیں دیکھا۔ یہ اس وقت کی بات جب کہ میرے قدم شعور کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔

میری ابتدائی عربی تعلیم ریاض العلوم گورینی میں ہوئی ہے اور میرا خیال ہے کہ مدرسہ کا وہ دور اس کے شباب کا زمانہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ آسمان سے آفتاب و ماہتاب اور کہکشائیں زمین پر اتر آئی ہیں۔ اساتذہ میں علم و تحقیق کے شہسوار بھی تھے اور عبادت و ریاضت کے تاجدار بھی۔ ان کا دن طلبہ کی تعلیم و تربیت میں گزرتا اور رات تحقیق و جستجو اور رب کے حضور راز و نیاز میں بسر ہوتی۔ وہ خلوص وللّٰہیت کے پیکر تھے اور محبت و شفقت کے ایک تناور درخت کے مانند تھے جس کی گھنیری چھاؤں میں اجنبیت اور غربت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے کہ اپنی صلاحیت، صالحیت اور سوز دروں کو طلبہ میں منتقل کردیں۔ ان کی محبت و شفقت اور لگن اور تڑپ آج بھی یاد آتی رہتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ کاش زندگی کا پہیہ پیچھے کی طرف گھوم جائے اور دوبارہ اسی

ماحول میں پہونچ جاؤں۔

''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو!''

یہاں جو ہر قاسمی میری مربی وسرپرست تھے مگران کی شخصیت اس درجہ پر رعب تھی کہ ان سے ملنے کے لیے جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔تعلیم کے ابتدائی دوسالوں میں ان کے یہاں بہت کم جانا رہا۔کبھی والدصاحب تشریف لے آتے تو ان کے ساتھ میں بھی حاضر ہوجاتا۔عربی دوم میں پہلی مرتبہ ان سے منطق پڑھنے کا شرف حاصل ہوا،جس کے بارے میں یہ چرچا رہتا تھا کہ بہت مشکل اور بے مصرف فن ہے۔لیکن پہلے ہی دن یہ معلوم ہوا کہ یہ تو بہت آسان علم ہے اور ہر شخص اسے استعمال کرتا ہے اور روزمرہ کی بول چال میں شامل ہے۔انہوں نے اس موقع پر جو مثال دی تھی وہ ان کی کتاب''یسری''میں موجود ہے، جسے انہیں کے الفاظ میں نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''خیالات دماغ میں اس طرح آتے جاتے ہیں جیسے سڑک پر سواریوں کی دوطرفہ بھیڑ۔ ارسطو نے اس بھیڑ میں گھس کر ایک ایک تصور،ایک ایک ادراک اور ایک ایک فیصلہ کا جائزہ لیا۔ ان کے الگ الگ نام رکھے،ان میں آپس کا خط امتیاز کھینچا،ان کا تعارف کرایا اور پھر ان میں جہاں کہیں تصادم ہوسکتا ہے،ان کی نشان دہی کی اور تصفیہ وفیصلہ کے گر بتائے۔حتی کہ ظن ویقین کی بنیادیں ابھار دیں۔ارسطو کی اس ذہانت اور محنت کا نام''منطق''پڑ گیا۔یہ محنت اتنی کارآمد ایسی فطری اور اس قدر زوردار تھی کہ ہوا اور پانی کی طرح ہزاروں برس میں بھی اس کی تازگی، توانائی اور ضرورت میں فرق نہیں آیا۔

چنانچہ کوئی بچہ بازار سے ٹماٹر لا رہا ہے،آپ اس سے پوچھئے تمہارے تھیلے میں کیا ہے؟ وہ کہہ دے گا کہ ٹماٹر ہے۔لیکن اگر اس کے ساتھ آلو بھی ہے گوبھی بھی ہے تو جواب دے گا کہ سبزی ہے یا ترکاری ہے۔اسی طرح کسی کے تھیلے میں سبزی بھی ہے مصالحہ بھی ہے تو اس کا جواب ہوگا سامان ہے۔آخر ٹماٹر کی نوع چھوڑ کر ترکاری کی جنس کیوں لایا؟ یا اسے چھوڑ کر سامان کی جنس بعید کیوں استعمال کی گئی؟ اسی وجہ سے تو کہ ہر ایک کا نام لینا دشوار تھا۔اس وجہ سے جزئیات سے کلیات تک اس کو آنا پڑا۔اسی کا نام منطق ہے اور یہی استقراء ہے اور غور وفکر کی

یہی راہ ہے۔

معلوم ہوا کہ منطق ضروریات زندگی میں سے ہے اور اسے بچے بوڑھے جوان سب بے تکلف استعمال کرتے ہیں اگر چہ علمی زبان میں اس کے اصطلاحی نام، اس کی تعریف اور اس کے مسائل کا ایک حرف بھی نہ جانتے ہوں۔ ایسے میں ہمارا کام ہے کہ ہم ان کے استعمال کی مدد لے کر اپنی اصطلاحیں سمجھادیں تا کہ روزمرہ کی زندگی میں شامل ہو جائیں اور باتوں کی گہرائی تک اترنا آسان ہو جائے۔ البتہ یہ فرق ضروری ہے کہ ارسطو کے مخاطب حکماء یونان تھے، فارابی اور ابن سینا کے مخاطب بھی علما اور حکما تھے۔ کیوں کہ انہوں نے اسے ایجاد کیا تھا اور اس ایجاد کو جن کے سامنے پیش کرنا تھا وہ اہل علم تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنا مفہوم ادا کرنے کے لیے اپنے مخاطب کی بلند پروازی کی سطح سے گفتگو کی تھی۔ مگر ہمارے مخاطب بچے ہیں اور بچہ ہمیشہ مادری زبان بولتا اور سمجھتا ہے، اس کو مخاطب کرنے کے لیے اس کی بولی بولیے تو وہ باغ باغ ہو جائے گا اور آپ کی بات براہ راست اس کے دماغ کو چھیڑے گی۔ خصوصاً جب ایسی مثالیں بھی دیجیے جو بچوں کے ذہن کے قریب ہوں، سہل ہوں، دل چسپ ہوں تو اس کا دماغ آپ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہو جاوے گا اور وہ مسکرادے گا۔ اب جو بیج ڈالنا ہو ڈال دیجیے، وہ جم جاوے گا اور اس بچے کی جتنی بڑی شخصیت ہوگی اتنا ہی بڑا وہ درخت ہو جاوے گا۔ لیکن اگر آپ بچے کو علمی زبان میں مخاطب کریں گے تو وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہوگی اور وہ مجبور کیا جاوے گا تو اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرے گا اور پھر اسی صحیح یا غلط ترجمے کی مدد سے اس کو طوطے کی طرح رٹ لے گا۔

اگر غور کیجیے تو بچہ کی ساری ذہانت ترجمہ میں کھو جاتی ہے اور ذہین سے ذہین بچے اس طریق تعلیم سے غبی نظر آنے لگتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا دماغ ایک غیر دل چسپ مشغلے میں چلنے سے گھبراتا ہے تو وہ بھاگتا ہے اور آپ بھاگنے نہیں دیتے۔ اس کشمکش میں بچے کی شخصیت دب جاتی ہے، اس کا نشو ونما رک جاتا ہے۔ سوچیے اس میں قصوروار کون ہے؟''

یہ اقتباس قدرے طویل ہے مگر جوہؔر کی تعلیمی جد وجہد اور نقطہ نظر کو جاننے کے لیے یہ ضروری ہے۔ اور ان سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ اس بھاری بھرکم جسم میں ایک دردمند اور

بے ضرر دل موجود ہے، اس لیے ان سے خوف کھانا بے جا ہے، اس لیے ان سے قربت بڑھتی گئی اور ہر صبح وشام ان کی خدمت میں حاضری ہونے لگی۔ اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ دوسرے سال ان سے ''مختصر القدوری'' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ عبادات کی عملی شکل کسی نہ کسی حد تک ہماری زندگیوں میں موجود ہے۔ اس لیے ان سے متعلق مسائل کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی ہے۔ لیکن معاملات خصوصاً خرید وفروخت کے مسائل سے سابقہ نہیں پڑتا، اس لیے سمجھنے میں پریشانی اور دقت محسوس ہوتی ہے، اور پڑھنے میں دل چسپی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جوہر کا یہ امتیاز تھا کہ وہ اس طرح کے مسائل کو بھی روز مرہ کی مثالوں کے ذریعہ طلبہ کے ذہن سے اس درجہ قریب کر دیتے کہ وہ زندگی سے بھرپور، دلکش اور ایک چلتی پھرتی تصویر نظر آتی جو اس قدر خوشنما ہوتی کہ ہر شخص توجہ دینے اور دل چسپی لینے میں خود کو مجبور پاتا۔ ان سے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوا کہ مجھے اس فن سے مناسبت ہے اور پھر اس میں میری دل چسپی بڑھتی گئی۔

منطق پڑھانے کے دوران وہ جمعرات کے دن مضمون نگاری سکھایا کرتے تھے جس کا طریقہ یہ ہوتا کہ وہ شروع میں کوئی محاورہ دیتے اور کہتے کہ اسے بول چال میں استعمال کرو، جیسے ''میری بلی مجھ ہی سے میاؤں''، ''بیٹھوں تیری گود میں اور نوچوں تیری داڑھی''۔ ان کی طرف سے دیئے گئے اس جیسے بہت سے محاورے آج بھی یاد ہیں۔ اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد کہتے کہ اپنے گاؤں شہر یا مدرسہ کے تعلق سے مضمون لکھو۔ پھر دیکھ کر دو چار جگہ اصلاح کرتے اور خوب حوصلہ بڑھاتے بلکہ انعام بھی دیتے اور مزید لکھنے کے لیے ابھارتے۔ یہ اس دور کا قصہ ہے جب کہ ہم ابتدائی جماعت میں تھے۔ اور جب دیو بند سے فضیلت اور حیدرآباد سے تخصص فی الفقہ کے بعد گورکھ پور میں ان کی خدمت میں چار ماہ رہنے کا موقع ملا تو رنگ بالکل بدلا ہوا تھا۔ معمولی معمولی غلطیوں پر سخت ناراض ہوتے۔ کبھی پورے مضمون پر صرف ایک نظر ڈال کر واپس کر دیتے کہ دوبارہ لکھ کر لاؤ، اور کبھی خوب کانٹ چھانٹ کرتے جسے دوبارہ لکھتے ہوئے بڑا غصہ آتا لیکن اس طرز اصلاح سے مجھے بڑا فائدہ ہوا اور آج اس کی افادیت سمجھ میں آرہی ہے۔

دیو بند سے فضیلت کے بعد تکمیل ادب کے لیے دوبارہ میں دیو بند پہونچا لیکن مقصد یہ تھا کہ اس درجہ میں داخلہ لے کر باہر ٹائپ رائٹنگ سیکھوں گا، اور اس کے ذریعہ کسی خلیجی ملک میں

جانے کی کوشش کروں گا۔لیکن حسن اتفاق اور خوبی قسمت کہ انہیں دنوں مولانا دیوبند تشریف لائے۔ملاقات کے لیے مہمان خانے پہونچا،اسی دوران کوپا گنج کے رہنے والے مولانا نورالعین قاسمی صاحب بھی ان سے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔اور دیوبند آنے کا مقصد بیان کیا کہ ہم یہاں تخصص فی الفقہ کے خواہش مند طلبہ کو حیدرآباد لے جاتے ہیں۔مولانا نے میری طرف اشارہ کرکے کہا کہ اسے بھی لے جایئے،اسے فقہ میں نے پڑھایا ہے،اس کو اس علم سے مناسبت ہے۔یہ مغرب بعد کی گفتگو ہے اور پھر اسی شب عشا کے بعد ان کے ہمراہ دلی اور پھر وہاں سے حیدرآباد پہونچ گیا اور مولانا کی بروقت رہنمائی اور دستگیری سے ’’ٹائپ رائٹر‘‘ بننے سے محفوظ رہا۔

گورینی کی تعلیم اور گورکھ پور کی تدریس کے دوران مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس سے ان کی تواضع،سادگی اور بے نفسی،خودداری،بے باکی اور حق پسندی،مال و دولت سے بے نیازی اور عالمانہ وقار کے بہت سے واقعات سامنے آئے۔

گورکھ پور میں قیام کے دوران ان کی عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور مال و دولت کی فراوانی تھی۔سیم وزر ان کے قدموں کو چوم رہے تھے لیکن سادگی اور بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ اس عمر میں بھی بے تکلف سائیکل پر سوار ہو کر آیا جایا کرتے تھے۔کبھی میں نے دبے لفظوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو فرمانے لگے کہ ’’سائیکل پر سوار ہونے سے پہلے بھی افضال تھا اور اب بھی افضال ہوں،دیکھو اس کی وجہ سے میرے اندر کوئی کمی تو نہیں آئی۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اپنے جسم کی طرف اشارہ کرتے۔مولانا کی اس کیفیت کو یاد کرکے وہ حدیث نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے جس کو بجا طور پر محدثین نے رسول اللہ ﷺ کی تواضع کے باب میں رکھا ہے کہ آں حضور ﷺ بے تکلف گدھے پر سواری کیا کرتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ بعض چیزوں کو عالمانہ شان کے خلاف سمجھتے ہیں،حالانکہ وہ تواضع کے خلاف اور اندر چھپی ہوئی کبر کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

مولانا کا جو دوسرا نمایاں وصف تھا وہ حق گوئی اور بے باکی ہے۔وہ خود اپنے متعلق لکھتے ہیں:

’’.......اس لیے ہم دارالعلوم سے نکلے تو بے لاگ قلم،بے باک زبان اور بے پناہ جد و جہد کا شوق لے کر نکلے......ہم نے ہر بات سمجھنے کی کوشش کی اور ہر غلط بات کی تردید کی ضرورت

پر کمر بستہ رہے اور بحمد اللہ اپنی کوئی پرواہ نہیں کی۔'' (ترجمان دارالعلوم دہلی، جون ۲۰۰۲ء)

وہ کہا کرتے تھے کہ میں غلط بات کو غلط کہوں گا اور اس راہ میں مجھے اپنی ملازمت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں موجود بیگ کی طرف اشارہ کر کے کہتے ''میرا یہاں کیا ہے، جو کپڑے وغیرہ ہیں اسے بیگ میں رکھوں گا اور چلتا نظر آؤں گا۔'' واقعہ یہ ہے کہ ان کی اس صفت نے انہیں بہت نقصان پہونچایا اور وہ بالکل یکہ وتنہا ہو کر رہ گئے تھے۔ نہ ان کا کوئی رفیق رہا، نہ دم ساز اور غم گسار اور کوئی ہم نوا۔ لیکن جس ہستی کی رضا جوئی کے لیے انہوں نے یہ سب کچھ گوارا کیا یقینی طور پر وہ اب اس کی خوشنودی سے شاد کام ہو رہے ہوں گے اور انہیں حق پرستوں کے زمرہ میں شامل کر لیا گیا ہوگا اور رب کریم کی طرف سے یہ صدا آئی ہوگی:

یا ایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

اے نفس مطمئن! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے نیک انجام) سے خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

مدارس میں عام طور سے اساتذہ طلبہ سے جسمانی خدمت لیتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سے مفاسد سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس لیے مولانا اس کے سخت خلاف تھے۔ ایک مرتبہ پھسل کر گر جانے کی وجہ سے پیر میں چوٹ لگ گئی تھی، میں نے دیکھا کہ اپنے ہاتھ سے تیل مالش کر رہے ہیں۔ عرض کیا کہ مجھے دیجیے، مالش کر دوں۔ یہ سن کر خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہا کہ ''اللہ نے مجھے دو دو ہاتھ دیے ہیں، یہ کس کام کے لیے ہیں۔'' مولانا کی اس صفت نے مجھے بہت متاثر کیا اور اپنے لیے بھی میں اسی کو پسند کرتا ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ انسان خود پسند واقع ہوا ہے اس لیے دوسرے کی وہی چیز پسند آتی ہے جو خود اس کو پسند ہو۔

بے نیازی اور خودداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ شاگردوں کی خدمت سے بے نیاز تھے، کسی کی طرف سے مدحت اور مذمت سے بے نیاز تھے، مالداروں کے آستانوں پر جبہ سائی سے بے نیاز تھے یہاں تک کہ صاحبزادوں کی دولت وثروت سے بھی بے نیاز تھے کہ:

نہ لالچ دے سکیں ہرگز تجھے سکوں کی جھنکاریں
تیرے دست توکل میں تھیں استغنا کی تلواریں

بایں ہمہ شان بے نیازی وہ ہر ایک سے بہت پرتپاک انداز میں ملتے، سلام کرنے میں پہل کرتے، رحم وکرم کے پیکر تھے۔ چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آتے اور بڑوں کے احترام میں کوئی کمی نہ آنے دیتے۔ وہ ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کے یہاں دولت کی فراوانی تھی مگر کبھی بھی ان کے لباس و پوشاک، رفتار وگفتار اور اخلاق وکردار سے بڑائی، اتراہٹ، خودرائی اور خودنمائی کا اظہار نہ ہوتا۔ منہ پر بات کہہ دینے کے عادی تھے مگر دل کے بہت صاف اور کینہ وکپٹ سے بہت دور بلکہ نفور تھے، اور شاعر کے الفاظ میں:

وہ واقف اسرار محبت تھا سدا سے ۔۔۔ غیروں سے تھی الفت اسے اپنوں سے محبت
دشمن کو بھی سینے سے لگا لیتا تھا بڑھ کر ۔۔۔ اپنوں سے بھی رکھی نہ کبھی اس نے عداوت

وہ بڑے متحمل مزاج تھے اور دشمنوں کو بھی معاف کردینے کے ہنر سے واقف تھے۔ دعا و تعویذ کے لیے اہل حاجت کا تانتا بندھا رہتا تھا مگر کسی کے ساتھ ترش روئی سے پیش آنے یا انکار کردینے سے واقف ہی نہیں تھے۔ اس کی وجہ سے انہیں بڑا علمی خسارہ برداشت کرنا پڑا لیکن یہ گوارہ تھا اور کسی کے دل کو توڑ دینا گوارا نہیں تھا۔ ان کے اس مومنانہ کردار نے بہت سے غیر مسلموں کو اسلام سے قریب کردیا اور ان میں سے بعض اس دولت سے سرفراز ہوگئے۔

''رہ قلندر'' ایک خاص اصطلاح ہے۔ ''قلندریہ'' ایک طبقہ اولیاء اللہ میں ہوتا ہے جو ایک خاص مذاق اور ایک مخصوص رنگ نسبت سے مشرف ہوتا ہے۔ جن اولیاء اللہ کو ہر وقت حق تعالی کے ساتھ ایک خاص کیفیت استحضاری نصیب ہوجاتی ہے اور ان کے سر پر ہر وقت نسبت کا گویا ایک پہاڑ رکھا ہوتا ہے، ایسے حضرات اگرچہ تکثیر نوافل اور تکثیر وظائف میں مشغول نظر نہیں آتے لیکن ان کے باطن پر کسی وقت غفلت اور ذہول نہیں طاری ہوتا۔ یہ حضرات تکثیر اوراد وظائف سے زیادہ اس امر کا اہتمام رکھتے ہیں کہ قلب ایک لمحہ کو بھی حق تعالی شانہ سے غافل نہ ہو۔ اسی مذاق کا نام ''مذاق قلندری'' ہے۔'' (معرفت الٰہیہ: ص ۱۶۵/ سراپا اعجاز: ص ۳۸)

ان حروف کا لکھنے والا تصوف کے کوچہ سے ناآشنا ہے اس لیے اس معاملہ میں جوہر کے

مزاج ومقام کو بیان کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔تاہم ان کے خصوصی شاگرد،ان کے مزاج شناس، راہ تصوف سے ہم آشنا بلکہ اس سمندر کا ایک ماہر شناور حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ کا بیان ہے:

''مولانا اصطلاحی اعتبار سے بظاہر صوفیہ اور مشائخ کے زمرے میں نہ تھے،ایک عالمانہ وقار تھا،ایک بے تکلف سادگی تھی،نہ تواضع کا مظاہرہ تھا،نہ کبر وغرور کا شائبہ تھا،وظائف کی کثرت نہ تھی،اوراد واشغال کا مشغلہ نہ تھا،نفلی عبادات کا زور نہ تھا،مگر ان کے پاس بیٹھ کر،ان سے بات کر کے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ اللہ کی ذات پر بغایت یقین،اللہ کی حکمتوں پر انتہائی بصیرت،رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے آخری حد تک شیفتگی،شریعت کی نہایت عظمت،اور صحابہ وائمہ کرام کے حق میں کمال ادب کا جذبہ قلب کی گہرائیوں میں ہے،اتنا کہ خود اپنا قلب بھی اس سے متأثر ہوتا تھا۔''(سراپا اعجاز:ص۴۶۴)

وہ مرد قلندر ابھی تک یاد ہے مجھ کو   تھی جس کی اذانوں میں فقط حق کی حمایت
مومن کی صدا تھا،وہ مجاہد کی اذاں تھا   تھی شب کے اسیروں کو بہت اس سے شکایت

جوہرؔ کو سب سے زیادہ دل چسپی پڑھنے لکھنے سے تھی اور حقیقتاً وہ اسی میدان کے آدمی تھے۔وہ خود کہا کرتے تھے کہ''اللہ تعالی نے میرے ایک بھائی کو تقریر کی صلاحیت دی تھی اور مجھے تحریر کی صلاحیت بخشی ہے۔''انہوں نے خوب لکھا اور بہت لکھا لیکن اس کا بہت کم حصہ منظر عام پر آسکا۔اور جو شائع ہوا وہ بھی اب ہفت روزہ''الجمعیۃ''اور ماہنامہ''ریاض الجنۃ''اور''دانشور''وغیرہ کی فائلوں میں مدفون ہے۔کاش کہ کوئی ہمت کرتا اور ان دفینوں کو سفینوں میں منتقل کر دیتا۔

حاصل یہ ہے کہ جوہر ایک ہمہ جہت شخصیت اور گوناگوں صفات کے حامل تھے۔انہوں نے بہت ہی سادہ،بے تکلف،صاف ستھری،پاکیزہ اور پر کیف لیکن بہت ہی جفا کش اور محنت و مشقت کی عادی زندگی گزاری ہے۔وہ ایک دل دردمند،فکر ارجمند اور زبان ہوشمند کے مالک تھے۔مزاج میں شگفتگی تھی،وہ ان لوگوں میں سے تھے جن سے کسی کو ضرر اور خطرہ نہیں تھا۔وہ حق گو اور حق شناس اور صبر ورضا کے پیکر تھے۔وہ اپنوں کے لیے انتہائی رحیم وشفیق اور غیروں کے لیے سراپا لطف و کرم تھے۔وہ غیرت حق سے سرشار اور کمزوروں اور مظلوموں کا جاں نثار اور انسانیت کا غم خوار تھے۔

وہ ایک سایہ دار درخت اور بہتے ہوئے دریا کی طرح تھے۔انہوں نے ایک کامیاب اور بامقصد زندگی گزاری، جسے قرآن میں حیات طیبہ کہا گیا ہے۔

من عمل صالحاً من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینه حیاۃ طیبة ولنجزینھم باحسن ما کانوا یعملون. (النحل/۹۷)

جس نے کیا نیک کام، مرد ہو یا عورت ہو، اور ایمان پر ہے تو ہم اس کو زندگی دیں گے ایک اچھی زندگی۔اور بدلے میں دیں گے ان کو حق ان کا بہترین کاموں پر جو کرتے تھے۔(ترجمہ شیخ الہند)

❑❑❑

میرے مشفق دادا۔ میرے استاذ گرامی

مولانا ڈاکٹر محمد عمار قاسمی صاحب رگھولی
حفید رشید حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

جمعہ کا دن تھا میرے دادا حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی نور اللہ مرقدہ ممبئی کے سفر سے بیمار ہوکر گھر آئے۔ سخت اسہال کی شکایت تھی، راستہ کی تھکن اور اسہال کی کثرت نے دادا میاں کو کمزور کر دیا تھا۔ والد محترم جناب ڈاکٹر رشاد صاحب قاسمی دادا میاں کا علاج کر رہے تھے۔ اس وقت میں نرسری اسکول کے درجہ تین میں پڑھتا تھا۔ چونکہ نرسری اسکول میں عربی تعلیم کا بندوبست نہیں ہوتا ہے اس لیے عربی تعلیم کے لیے فتح پور تال نرجا حضرت مولانا شاہ وصی اللہ کے قائم کردہ مدرسہ وصیۃ العلوم میں جانا طے ہوا۔ نماز جمعہ کے بعد فتح پور روانہ ہونے سے پہلے دادا میاں کے کمرے میں سلام کے لیے حاضر ہوا تو وہ سو رہے تھے اور والد صاحب کی سخت ہدایت تھی کہ اگر ابا سوئے ہوں تو کوئی انہیں جگائے نہیں، آرام کرنے دیا جائے۔ میں بغیر دادا سے مصافحہ کیے ہوئے فتح پور چلا گیا۔ جب ایک دو روز کے بعد دادا میاں کی طبیعت بحال ہوئی تو گھر میں مجھے نہ پا کر دادی سے پوچھا کہ کہ عمار کہاں ہے؟ دادی نے بتلایا کہ عربی پڑھنے کے لیے فتح پور مدرسے میں اس کا داخلہ کرا دیا گیا ہے۔ دادا نے والد صاحب کو حکم دیا کہ عمار کو فتح پور سے واپس بلالو، میں اسے اپنے ساتھ گورکھ پور لے کر جاؤں گا۔

مجھے جب یہ خبر ملی کہ دادا کے ساتھ دادا کے مدرسہ میں پڑھنے جانا ہے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ گھر آیا، والدہ نے سامان باندھ دیا اور اگلی صبح دادا میاں کے ساتھ گورکھ پور روانہ ہو گئے

زندگی میں پہلی بار بس سے سفر کر رہا تھا، بس بھری ہوئی تھی، دوران سفر مجھے متلی آئی اور قے ہوگئی۔ سوء اتفاق کہ قے کے کچھ چھینٹے بغل والے آدمی کے اوپر پڑ گئے، اور وہ آگ بگولہ ہوگیا۔ میں گھبرا کر سہم گیا۔ دادا میاں نے اس کے غصے کو دیکھ کر کہا کہ بچہ ہے معاف کیجیے۔ وہ کہنے لگا کہ اسے کون صاف کرے گا؟ دادا نے کہا کہ میں صاف کروں گا اور بس اسٹیشن پر پہونچ کر اس کے کپڑے کو دھلا اور پھر دوبارہ اس سے معذرت کی اور مدرسہ کی طرف چل دیے۔

تقریباً بارہ بجے ہم لوگ مدرسہ پہونچے، جب میں نے مدرسہ اور اس کی عمارتوں کو دیکھا تو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ دادا میاں اتنے بڑے مولانا جن کی شہرت چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، بوسیدہ عمارت جو چند کمروں پر مشتمل ہے اور اکثر کمرے کھپریل کے، اور ایک چھوٹی سی مسجد جو کر کٹ کی تھی۔ یہی دادا میاں کا مدرسہ ہے۔ دادا اس مدرسہ کے کھپریل کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے، جو دفتر بھی تھا، مہمان خانہ بھی، درس گاہ بھی اور قیام گاہ بھی۔ اور بارش کے دنوں میں ٹپکتا بھی تھا۔ دادا میاں جب گھر آتے تو گھر مہمانوں سے بھر جاتا، بڑی بڑی گاڑیوں سے دور دراز سے لوگ دادا میاں سے ملاقات کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس لحاظ سے میرے ذہن نے ایک خاکہ تیار کیا تھا کہ مدرسہ میں بڑی بلڈنگیں ہوں گیں اور پختہ عمارتیں ہوں گیں، مگر میرے بنائے ہوئے خاکے بالکل برعکس یہ مدرسہ نکلا۔

درس وتدریس:

دادا میاں نے ۱۸؍سال کی عمر میں تدریس کا کام جامع العلوم جین پور سے شروع کیا۔ فارسی سے لے کر بخاری تک کا درس دیا۔ دادا میاں کا آخری تدریسی پڑاؤ دار العلوم گورکھ پور ہے جہاں سے ۲۰۰۸ء کے اخیر میں علالت کے باعث مستقل طور سے گھر آ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۲۰۰۵ء میں ایک صاحب نے دادا میاں سے کہا کہ مولانا! اب بہت پڑھا چکے ہیں، عمر زیادہ ہوگئی ہے، اب گھر پر آرام فرمائیں۔ تو دادا میاں نے فرمایا کہ ’’ابھی بڑھاپا نہیں آیا ہے، ابھی تو دوڑ لگا سکتا ہوں، جب تک صحت ساتھ دے گی مدرسہ کو نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں نے دادا میاں سے درسیات کی چند کتابیں پڑھی ہیں۔ شرح جامی، گلستاں بوستاں وغیرہ۔ دادا میاں جب گلستاں یا بوستاں پڑھاتے تو بالکل تر وتازہ

ہوجاتے۔ دادامیاں کو پوری بوستاں یاد تھی، اخیر عمر میں اکثر یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا:

مپندار سعدی کہ راہ صفا
تواں رفت جز پئے مصطفیٰ

دادا میاں کا پڑھانے کا انداز بالکل آسان اور عام فہم ہوتا، طلبہ سے عبارت پڑھواتے اور ترجمہ کراتے، پھر آسان لفظوں میں اس کی تشریح کرتے، پھر ہر بچے سے پوچھتے کہ سمجھے؟ جب طلبہ کہتے کہ سمجھ گئے تو فرماتے کہ چلو سمجھاؤ۔ ایسا کئی بار کرتے، تقریباً سبق درس گاہ ہی میں یاد ہوجاتا۔

دادا میاں ہر جمعرات کو محاورہ لکھواتے۔ ایک دن ہم طلبہ کو ایک لفظ دیا ''ایں ایں'' اور فرمایا کہ اس کو جملہ میں استعمال کرو۔ اتنے میں دادا میاں کے پاس ایک استاذ آئے اور ایں ایں کرنے لگے، اور کچھ بولے نہیں۔ دادا نے کہا کہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی کاپی دادا میاں کے سامنے پیش کردی جس میں تحریر کیا تھا کہ ''ایں ایں کیا کررہے ہیں، صاف بتایئے، تنخواہ چاہیے۔'' دادا نے زور سے پڑھا اور خوب ہنسے اور اس برجستگی پر مجھے شاباشی دی۔

بحیثیت ممتحن:

دادا میاں جب تقریری امتحان لیتے تو طلبہ سے کہتے کہ جہاں سے تمہیں سب سے اچھا یاد ہے، وہاں سے پڑھو، اور پھر اسی میں سے سوالات کرتے۔ اساتذہ سے فرماتے کہ بچوں کا امتحان وہاں سے لو جہاں سے انہیں خوب اچھی طرح یاد ہو۔ جو یاد نہیں اس میں ان کی قابلیت کا اندازہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟۔

دادا میاں کے شب وروز:

فجر کی نماز کے بعد تلاوت کرتے اور تلاوت کے بعد چند کرکرے کھاتے اور چائے پی کر سات بجے سے گیارہ بجے تک درس وتدریس میں لگ جاتے۔ گیارہ بجے کے بعد سے ظہر کی نماز تک آئے ہوئے لوگوں سے ملتے، ان کے مسائل سنتے اور دعا وترکیب بتاتے۔ ظہر سے قبل

لوگوں سے فرصت ملتی تو کھانا کھاتے اور نماز کی تیاری میں لگ جاتے۔ظہر کے بعد سے عصر تک درس دیتے یا مدرسہ کا حساب کتاب دیکھتے۔عصر کے بعد سے مغرب تک شہر کے لوگوں سے ملاقات کرتے۔مغرب سے عشا اور عشا سے نہ جانے کب تک مطالعہ اور لکھنے میں مصروف رہتے۔کب سوتے اور کب جاگتے؟اس کا علم نہیں،جب دیکھو کچھ نہ کچھ لکھنے میں مصروف ہیں۔میں نے دادا میاں کو کبھی مسلسل ایک گھنٹہ آرام کرتے نہیں دیکھا،اگر کبھی طبیعت ناساز ہوتی تو بھی قلم ہاتھ میں ہوتا۔دادا میاں نے پوری زندگی آرام وآسائش کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ہر وقت فعال ومتحرک رہتے اور لوگوں کو بھی متحرک رہنے کی تلقین کرتے۔ایک مرتبہ دادا میاں نے ہم طلبہ سے فرمایا کہ:

جاگنا ہے جاگ لے عرش کے سایہ تلے
زندگی بھر سونا ہے خاک کے سایہ تلے

سہی معنوں میں دادا میاں ہو بہو اس شعر کے مصداق تھے۔

مثالی مہتمم:

عشا کی نماز سے پہلے میں نے دسترخوان لگایا،کھانے پر صرف میں اور دادا تھے۔دادا میاں نے اپنے پلیٹ میں سالن نکالا اور پھر میں نے نکالا۔اس دن مدرسہ میں گوشت پکا تھا۔ابھی کھانا شروع نہیں کیے تھے کہ چند طلبہ آئے اور کہنے لگے کہ حضرت!ہم لوگوں کو گوشت نہیں ملا ہے۔دادا نے ان کے برتن منگوائے اور سارا سالن اپنے پلیٹ کا اور میرے پلیٹ کا بھی اس میں انڈیل دیا۔اور ان کو دے کر رخصت کیا۔پھر دادا نے مجھ سے کہا کہ دیکھو اچار ہو تو لاؤ آج اسی سے کھا لیتے ہیں۔دادا کے اس ایثار پر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ مہتمم تو دادا ہیں پھر میرا سالن کیوں ان کو دیا،میں بھی تو انہیں کی طرح ایک طالب علم ہوں۔کھانے سے فراغت کے بعد دادا میاں نے مجھے شفقت بھری نظروں سے دیکھا اور کہا کہ یہ وہ طلبہ ہیں جن کو اپنے گھر پر بھی اچھے کھانے نہیں ملتے،اور تم تو گھر پر اچھا کھا سکتے ہو۔یہ واقعہ گزرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا ہے لیکن دادا میاں کا اچار اور روٹی کھانا آج بھی نظروں کے سامنے گردش کرتا ہے۔اس واقعہ کا تذکرہ کبھی میں نے کسی سے نہیں کیا تھا،آج مضمون لکھتے ہوئے والد صاحب سے ذکر کیا تو بے ساختہ آنسو نکل پڑے،اور والد

صاحب بھی واقعہ سن کر اپنے آپ کو روک نہیں پائے۔ بھوکے رہ کر طلبہ کی فکر کرنا دادا میاں کے متبع سنت ہونے کی روشن دلیل ہے۔

توکل علی اللہ:

دارالعلوم گورکھ پور میں بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا کہ آج کھانا نہیں بن سکے گا، کیوں کہ مطبخ خالی ہوتا تھا۔ کبھی دال ہے تو چاول نہیں، چاول ہے تو آٹا نہیں۔ دادا میاں تک خبر پہونچتی کہ شام میں پکنے کے لیے کچھ نہیں ہے تو دادا میاں بڑے اطمینان سے صرف یہ فرماتے کہ چلو ابھی اللہ کہیں سے انتظام کر دے گا۔ اور واقعہ یہی ہے کہ کہیں نہ کہیں سے انتظام ہو ہی جاتا تھا۔ الحمد للہ مدرسہ میں کبھی ایک وقت کا بھی فاقہ نہیں ہوا۔

برکت:

دسترخوان پر برکت کا مشاہدہ بخدا اگر میں نے کہیں کیا تو دادا میاں ہی کے دسترخوان پر کیا۔ شاید ہی کوئی ایسا دن ہو جب دادا میاں کے یہاں مہمان نہ آئے ہوں، دادا میاں بلا تکلف دسترخوان لگا دینے کا حکم دیتے اور فرماتے کہ جو کچھ ہے سب لاؤ۔ بعض دفعہ مہمانوں کی تعداد دیکھ کر مجھے الجھن ہوتی کہ کھانا تو تین چار افراد کا ہے اور مہمان زائد ہیں، کیسے سب کے لیے کافی ہوگا؟ دسترخوان لگتا، دادا میاں کی عادت تھی وہ اپنا کھانا خود اپنی پلیٹ میں نکالتے تھے اور دوسروں کو اپنے مطابق کھانا لینے کو کہتے۔ نئے مہمان از راہ تکلف دادا میاں کے پلیٹ میں بھی نکالنے کی کوشش کرتے تو فوراً منع کرتے اور کہتے کہ مجھے کتنی بھوک ہے، کتنا کھانا ہے، یہ آپ کو نہیں معلوم، اس لیے اپنا کھانا خود سے نکالنا چاہیے، اس سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ سبھی لوگ اطمینان سے کھانا کھاتے اور پیٹ بھر کے کھاتے۔ الحمد للہ دادا میاں کے دسترخوان سے کوئی شخص بھوکا نہیں اٹھا۔

مہمانوں کی ضیافت:

راقم الحروف کے لیے یہ سعادت کی بات رہی ہے کہ دادا میاں کے زیر سایہ رہ کر بڑے بڑے علمائے دین کی مہمان نوازی کرنے کا موقع ملا ہے۔ خصوصی طور پر حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی، مولانا حقانی صاحب پالن پوری، مولانا سید احمد ہاشمی صاحب غازی

پوری، حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی، حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب وغیرہم۔ حضرت کیرانوی کو تو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر میں نے پلائی ہے۔

دادا میاں مہمانوں کے لیے اپنی الماری میں کچھ نہ کچھ ضرور رکھتے تھے، جو کچھ ہوتا سب بے تکلف پیش کر دیتے۔ ایک دفعہ مکہ مکرمہ سے دادا میاں کے ایک مرید گورکھ پور آئے، شدید گرمی کا موسم تھا، میں نے دادا سے کہا کہ دادا! فریج کا پانی انجینئر صاحب کے گھر سے لاؤں؟ جو مدرسہ کی بغل میں رہتے تھے۔ دادا میاں نے فرمایا کہ بلا وجہ تکلف مت کیا کرو، جو کچھ ہے پیش کر دو، مہمان تو روز ہی آتے ہیں، کب تک پانی مانگتے رہوگے۔

عملیات:

دادا میاں ماہر عملیات بھی تھے، آپ مخلوق خدا کی راحت رسانی کے لیے بلا معاوضہ تعویذات بھی دیا کرتے تھے۔ اکابر کی طرح آپ بھی قرآنی آیات اور احادیث نبوی پڑھ کر اور لکھ کر دیا کرتے تھے۔ اس کے معاوضے میں دادا میاں نے کبھی بھی ایک روپیہ نہیں لیا۔ ایک مرتبہ ممبئی سے ایک صاحب بغرض دعا آئے اور ان کو کافی فائدہ بھی ہوا۔ میں اس وقت دادا میاں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے کچھ روپے جس میں سو سو کے کئی نوٹ تھے، دادا میاں کی طرف بڑھائے۔ دادا میاں نے پیسے دیکھ کر مدرسہ کی رسید اٹھائی، اس شخص نے رسید دیکھ کر پیسے واپس جیب میں رکھ لیے اور مدرسہ کے لیے ایک چھوٹی سی رقم نکالی۔ دادا میاں یہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئے اور فرمانے لگے کہ تم مجھے خریدنا چاہتے ہو، مدرسہ کے لیے تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں، اور مجھے دینے کے لیے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے میں گھر سے مالی اعتبار سے مضبوط ہوں، پیسوں کی ضرورت مجھے نہیں بلکہ مدرسہ کو ہے۔

عادات واخلاق:

دادا میاں بڑے خلیق، ملنسار، متواضع، منکسر المزاج اور شیریں گفتار تھے۔ آپ سے جو کوئی بھی ایک مرتبہ ملتا وہ آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ دادا میاں اپنے اہل وعیال اور شاگردوں پر بڑے شفیق ومہربان تھے، سبھی کے ساتھ بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ دادا میاں غصہ بھی خوب کرتے تھے لیکن عفو ودرگزر کا پہلو ہمیشہ غالب رہتا۔ غلطیوں پر ڈانٹتے مگر معافی مانگنے پر

فوراً معاف کر دیتے، پھر کبھی اس غلطی کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔

دادا میاں کو سنت نبوی کے اتباع کی برکت سے رعب وجلال سے بھی وافر حصہ ملا تھا۔ دادا میاں کے رعب وجلال کو اہل خانہ وشاگرد اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمیشہ ساتھ رہنے والوں کو بھی کبھی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ بے تکلفی سے پیش آئیں۔

سادگی:

دادا میاں نے تین حج اور ۸؍عمرے کیے ہیں لیکن سفر حج پر جانے سے پہلے یا بعد نہ کوئی تقریب اور نہ کوئی شوروغل۔ خاموشی کے ساتھ جاتے اور خاموشی کے ساتھ واپس آجاتے۔ بعض دفعہ تو ہم لوگوں کو بھی چند دن پہلے خبر ہوئی کہ دادا میاں سفر عمرہ پر جانے والے ہیں۔ ایک مختصر سا بیگ جس میں چند کپڑے، کاغذ، قلم اور ہمدرد کی کچھ دوائیں۔ بس یہی سامان رہتا، واپسی پر کھجور اور آب زمزم کا اضافہ ہوتا جس کو گھر، مدرسہ اور گاؤں کی مسجد میں تقسیم کراتے۔

دادا میاں اپنا بیگ خود اٹھاتے تھے، کبھی کسی کو اٹھانے نہیں دیتے، بعض لوگ کوشش کرتے تو فرماتے کہ یہ میرا بوجھ ہے میں ہی اٹھاؤں تو اچھا ہے۔ دادا میاں کے ساتھ ایک بار شام کو گھر سے مدرسہ کے لیے روانہ ہوا اور پہونچتے پہونچتے رات کے گیارہ بج گئے۔ بس اسٹیشن پر اترنے کے بعد رکشہ نہیں مل رہا تھا، بڑی تگ ودو کے بعد ایک رکشہ ملا، اس سے چلنے کے لیے کہا اور کرایہ پوچھا تو اس نے پچاس روپے مانگے۔ اسٹیشن سے مدرسہ کی دوری تقریباً پانچ کلومیٹر ہے اور عموماً دس روپیہ کرایہ ہوتا تھا۔ دادا میاں نے کہا کہ دس کے بجائے بیس دے سکتا ہوں، چلنا ہو تو چلو، مگر وہ پچاس سے کم پر راضی نہیں ہوا۔ دادا نے کہا کہ آج پیدل ہی چلتے ہیں، کچھ دور چلنے کے بعد دادا نے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھا اور میرا بیگ مانگنے لگے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے دادا! میں ٹھیک ہوں، کہنے لگے کہ بیگ مجھے دو اور تیز چلو۔ دادا میاں اپنے اور میرے بیگ کو اپنے کاندھے پر لادا اور چل دیے۔ دادا میاں کا یہ مشفقانہ عمل جب بھی یاد آتا ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

انہماک ویکسوئی:

دادا میاں کب سوتے، کب جاگتے اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ بیٹھے بیٹھے

سوجاتے، ہاتھ میں قلم اور سامنے کاغذ ہوتا، جب اٹھتے لکھنا شروع کردیتے۔ غالباً جولائی یا اگست کا مہینہ تھا، شدید بارش ہورہی تھی، دادا میاں اپنے کمرے میں کسی عنوان پر مضمون لکھ رہے تھے اور ایسا منہمک تھے کہ پتہ ہی نہیں چلا اور کمرہ پانی سے بھر گیا۔ پانی نالی کے راستے کمرہ میں آرہا تھا اور گھٹنوں تک پہونچ گیا۔ پنکھا چل رہا تھا اور دادا میاں اپنے تخت پر بیٹھے تھے کہ کاغذ کا ایک ٹکڑا اڑ کر نیچے گرا، اسے اٹھانے کے لیے اٹھے تو دیکھا کہ کمرہ پانی سے بھرا ہوا ہے۔ آواز لگائی تو بغل والے کمرے سے ایک استاذ آئے اور انہوں نے طلبہ کو جگایا اور سب سامان باہر نکالا۔

شریعت سے محبت اور اصلاح:

یہ واقعہ غالباً ۱۹۶۸ء کا ہے اور اس کے راوی جناب سہیل احمد خان رگھولی ہیں، انہوں نے ذکر کیا کہ میرے چچازاد بھائی رئیس احمد کی شادی بنارس کے بڑے مشہور ایڈوکیٹ جناب ظہیرالدین کی صاحبزادی سے طے ہوئی۔ دونوں طرف کے لوگوں کی خواہش تھی کہ نکاح حضرت مولانا افضال الحق صاحب پڑھائیں گے اور نکاح کا وقت بعد نماز فجر طے ہوا۔ بارات شام کو ڈھول باجے کے ساتھ دولہن کے گھر پہونچی۔ دادا میاں وہاں پہلے سے موجود تھے، جب یہ منظر دیکھا تو خاموشی سے اٹھے اور غائب ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا کو نہ دیکھ کر لوگوں نے تلاش کرنا شروع کیا، دونوں جماعتوں نے خوب تلاش کیا، دادا میاں کے جتنے متعلق بنارس شہر میں تھے سب کے یہاں معلوم کیا، مگر کہیں سراغ نہیں ملا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد لوگوں نے مولانا کو آتے دیکھا، دوڑے دوڑے گئے اور پوچھا کہ مولانا! کہاں چلے گئے تھے؟ ہم سب پریشان تھے۔ دادا میاں نے فرمایا کہ یہیں محلّہ کی مسجد میں رات بھر رہا، تم لوگوں کو کوئی خلل نہ ہو، اس لیے چلا گیا۔ سب لوگ شرمندہ ہوئے اور سب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، معافی مانگی، دادا میاں نے آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کی شرط پر معاف کردیا اور نکاح پڑھایا۔ راوی کہتے ہیں کہ اس رات مولانا بغیر کچھ کھائے رات بھر بھوکے سوئے مگر شریعت سے سمجھوتا نہیں کیا۔ ایسے تھے ہمارے اکابر جو حقیقی معنوں میں نمونہ اسلاف تھے۔

وقت کی پابندی:

چچا محترم جناب محمد عارف صاحب کی شادی دادا میاں نے حمید پور طے کی، اور نکاح

پڑھانے کے لیے حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب گورینی کو مدعو کیا۔ نکاح کا وقت طے کرکے گھر والوں کو اس سے آگاہ کردیا۔ دادا میاں وقت متعین پر تیار ہوکر چچا سے جلد تیار ہونے کو کہا، کیوں کہ دادا میاں کو خبر مل چکی تھی کہ مولانا حمید پور پہونچ گئے ہیں۔ دادا میاں نے چچا کو گاڑی میں بٹھایا اور نکل گئے، گھر کے بیشتر افراد حسب روایت وعادت ابھی تیاری میں مصروف تھے۔ گھر میں شور ہوا کہ جلدی کرو، لوگ جا چکے ہیں۔ جب گھر کے پیچھے رہ جانے افراد پہونچے تو نکاح ہو چکا تھا اور دعا ہو رہی تھی۔

خودداری:

دادا میاں جب فرقانیہ گونڈہ میں پڑھاتے تھے اس وقت کسی سفر سے گونڈہ ٹرین سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں پیسے اور چپل چوری ہوگئے۔ گونڈہ اسٹیشن پر ننگے پاؤں اترے اور رکشہ کرکے مدرسہ کی طرف چل دیے۔ رگھولی کے مولوی رئیس احمد صاحب اس وقت وہیں زیر تعلیم تھے، مولانا کو رکشہ سے آتے ہوئے دیکھا اور بغیر چپل کے ننگے پاؤں دیکھا تو پوچھا کہ مولانا! چپل کیا ہوئی؟ فرمایا کہ چوری ہوگئی۔ جاؤ! مولانا عبدالجبار صاحب سے آٹھ آنہ لاکر رکشہ والے کو دیدو۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ گونڈہ کا چپہ چپہ مولانا کو جانتا اور پہچانتا تھا۔ مولانا کے محبین کی ایک خاصی تعداد ریلوے اسٹیشن کے قریب رہتی تھی لیکن یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ چند روپے کسی سے لے کر چپل خرید لیتے یا رکشہ کا انتظام کر لیتے۔

کانفرنس یا سیمینار وغیرہ میں شرکت کے لیے سفر کرتے وقت بیگ اٹھاتے اور چل دیتے سکنڈ کلاس یا بہت ہوا تو سلیپر میں سفر کرتے۔ اور واپسی میں اسی کا کرایہ لیتے اور اسی میں سفر کرتے۔ فرماتے کہ روز جیسے سفر کرتا ہوں ویسا ہی ایسے موقعوں پر بھی کرتا ہوں۔

انسانیت سے ہمدردی:

گورکھ پور مدرسہ سے اسٹیشن کے راستے پر ایک جگہ سورج کھنڈ ہے جو کافی اونچائی پر واقع ہے۔ ہم لوگ رکشہ سے دادا میاں کے ساتھ جاتے، جیسے ہی سورج کھنڈ آتا دادا میاں ہمیں اترنے کو کہتے اور کہتے کہ پیچھے سے رکشہ کو دھکا دو۔ اگر رکشہ والا ضعیف ہوتا تو خود بھی اتر جاتے اور اونچائی پر چڑھنے کے بعد سوار ہوتے۔ بچپن کا ذہن، غصہ آتا کہ دادا میاں پیسے بھی دیتے ہیں اور

رکشہ کو دھکا بھی دلاتے ہیں لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی احساس ہوتا گیا کہ یہ انسانیت سے ہمدردی کا ایک درس ہے، جو دادا میاں کو حضرت شاہ عبدالرحیم فضلی کی تربیت میں ملا تھا۔ اللہ ہمیں بھی حضرت والا کے نقش قدم پر چلنے والا بنادے۔ آمین

شاگردوں کا حال:

دادا میاں نے اپنے شاگردوں کی تربیت ایسی کی تھی کہ وہ عمر بھر شاگرد کی ہی حیثیت سے رہے، چاہے وہ کتنے ہی عظیم منصب اور عہدے پر فائز ہو گئے ہوں۔ دادا میاں اپنے شاگردوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ دادا میاں کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں میں ہے۔ چند شاگردوں کا حال جس کا میں خود گواہ ہوں، تحریر کرتا ہوں، تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اکابر کے ادب کو دیکھ کر باادب بننے کی کوشش کریں۔

☆ حضرت مولانا فضل حق صاحب مہتمم مدرسہ احیاء العلوم گوراپور دادا میاں کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ خاندانی بھائی بھی تھے۔ ایک مرتبہ گورکھ پور تشریف لائے، دادا میاں اس وقت سفر پر تھے، حضرت مولانا فضل حق صاحب کا قیام ہوا، بعد نماز عشا، کھانے سے فراغت کے بعد مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ سونے کا انتظام کہاں ہے؟ میں نے وہ جگہ بتادی جہاں دادا میاں سوتے تھے، میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ تو مجھے مولانا کی جگہ سلا رہا ہے، ابے! مولانا کے پائیتا نے سو جاؤں، یہی میری خوش نصیبی ہے۔ یہ مولانا ہی کی تربیت اور تعلیم ہے کہ میں آج یہاں بیٹھا ہوں، یہ مولانا ہی کا کمال ہے مجھے دین سے بیزار گھرانے سے نکال کر فاضل دیوبند بنادیا۔

☆ میری اور میرے بڑے بھائی محمد حماد کے لیے یہ سعادت رہی ہے کہ ہم دونوں کا نکاح دادا میاں نے اپنے چہیتے شاگرد حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب سے پڑھوایا۔ دوران نکاح جو میری نظروں نے دیکھا بخدا ایسا ادب میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا کہ اتنا بڑا عالم جس کی شہرت پورے عالم اسلام میں پھیلی ہو، جو بیک وقت مفسر قرآن، معلم اور صاحب نسبت بزرگ درجنوں کتابوں کا مصنف، جس کی ایک آواز پر ہزاروں شاگرد لبیک کہتے ہوں، جب وہ اپنے استاذ کے سامنے ہوتا تو یہ بھول جاتا کہ میں کیا ہوں، صرف اتنا یاد رہتا کہ میں مولانا کا شاگرد ہوں۔

گھر کے صحن میں دری بچھی ہوئی تھی، دادا میاں تشریف فرما تھے، عزیز و رشتہ دار سے صحن بھرا ہوا تھا، میں اور بڑے بھائی دونوں دادا میاں کے سامنے بیٹھے تھے۔ دادا میاں نے حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کو نکاح پڑھانے کا حکم دیا۔ مولانا خطبہ نکاح بیٹھ کر پڑھ رہے تھے، دادا میاں نے حکم دیا کہ کھڑے ہوکر پڑھو۔ واہ رے استاذ کا شاگرد پر اعتماد، بھری محفل میں کھڑے ہونے کا حکم ملتا ہے، اور شاگرد بلا تکلف، چہرے پر شکن لائے بغیر، بیماری کا عذر کیے بغیر فوراً کھڑا ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نہیں بلکہ عربی اول کا کوئی طالب علم ہے۔ نکاح کے بعد دادا میاں نے فرمایا کہ حضرت مدنی خطبۂ نکاح کھڑے ہوکر پڑھایا کرتے تھے۔

مسلکی رواداری:

رگھولی کے سید حسن مرحوم جو دادا میاں کے بچپن کے دوست تھے اور دادا میاں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کا جب انتقال ہوا تو دادا میاں گھر ہی تھے، سید حسن صاحب کی خواہش تھی کہ جنازہ حضرت مولانا اکرام الحق صاحب پڑھائیں، جو بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ سید حسن صاحب مولانا اکرام الحق صاحب کے مرید تھے۔ رگھولی کا یہ دستور تھا کہ جب دادا میاں رہتے تو نماز کوئی بھی ہو، عیدین، جمعہ یا جنازہ سبھی نمازیں دادا میاں پڑھاتے۔ البتہ جب چچا محترم مولانا محمد راشد صاحب الہندی موجود ہوتے تو انہیں نماز کے لیے آگے کر دیتے۔ چچا کو اللہ میاں نے خوبصورت آواز دی ہے، چچا میاں کا مخصوص انداز تلاوت اور منفرد لب ولہجہ لوگوں میں بہت مقبول تھا۔

جنازہ سے قبل حضرت مولانا اکرام الحق صاحب دادا میاں کے پاس آئے اور جنازہ پڑھانے پر اصرار کرنے لگے۔ دادا میاں نے فرمایا کہ سید حسن صاحب کی خواہش تھی کہ آپ ہی نماز پڑھائیں، اس لیے آپ کو ہی پڑھانا ہے۔ چنانچہ دادا میاں اور دیگر تمام علما نے ان کی اقتدا میں نماز ادا کی اور دونوں عالموں نے مسلکی رواداری کی ایک نئی عبارت لکھی۔

بحیثیت والد:

والد محترم بلیا سے میڈیکل آفیسر کے عہدے سے ۲۰۰۹ء میں سبکدوش ہوئے۔ نگرا بلیا

میں پی ایچ سی کے انچارج کے عہدے کو جوائن کرنے جارہے تھے تو دادا میاں کی خدمت میں گئے اور کہا کہ آج میڈیکل آفیسر انچارج کے عہدے کو جوائن کرنے جارہا ہوں۔ دادا میاں نے فرمایا کہ جاؤ عہدہ قبول کرلو، دیانت داری سے کام کرنا، بے ایمانی مت کرنا۔ والد صاحب نے کہا کہ ابا! اتنے دنوں کی سروس میں کبھی آپ نے کوئی شکایت سنی ہے؟ فرمانے لگے کہ شکایت تو نہیں سنی، اور مطمئن بھی ہوں لیکن میں ایک باپ ہوں، اور باپ کا فرض بچوں کو ہمیشہ غلط کام سے پرہیز کرنے کی تلقین کرنا ہے۔

ہمت وحوصلہ:

سفر دادا میاں کا محبوب مشغلہ تھا، سفر سے کبھی گھبراتے نہیں، زندگی کا معتد بہ حصہ سفر میں ہی گزارا۔ اخیر عمر میں ایک بار والد صاحب نے کہا کہ حضرت مولانا عزیز الحسن صاحب کا فون آیا ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ فون کان سے لگایا گیا، بات ہوئی۔ دادا میاں بہت خوش ہوئے، اس لیے کہ کہیں جانے کی بات ہورہی تھی۔ میں نے دادا سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے؟ کہنے لگے کہ مولانا عزیز الحسن صاحب کے یہاں کوئی پروگرام ہے، اس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دادا چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ بستر مرض پر ہونے کے باوجود سفر سے گھبراتے نہیں کہیں جانے کی بات ہوتی تو ہامی بھر لیتے۔ مولانا عزیز الحسن صاحب کا دادا میاں کے خاص رفقا میں شمار ہوتا ہے۔ اللہ ان کا سایہ تادیر سلامت رکھے۔ آمین

حق گوئی:

حق گوئی دادا میاں کا طرہ امتیاز تھا، حق بولتے، حق لکھتے اور عملی طور سے کر کے دکھاتے۔ دادا میاں نے ہمیشہ حق گوئی کو فروغ دیا ہے اس کی جو بھی قیمت چکانی پڑے انہیں منظور تھا۔ دادا میاں کا قلم چلتا اور خوب چلتا تھا، غلط کو غلط کہتے چاہے سامنے والی ذات کتنی ہی سپر پاور کیوں نہ ہو۔

دادا میاں کی تحریروں کو اگر شمشیر بے نیام کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ ان کی نظر تمام مسائل پر یکساں ہوتی تھی، حالات حاضرہ ملکی وملی مسائل۔ جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو دادا میاں کا مضمون منظر عام پر آجاتا۔ جب علمائے کرام کے قدم بہکے تو ''امریکہ علما کی تفریح گاہ'' جب

فقہ پر آنچ آئی تو ''فقہ اسلامی کا شاندار جنازہ'' جب امریکہ نے عراق پر بم برسائے تو ''جنگل کا قانون'' جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقلیتی کردار پر سوال اٹھا تو ''مرحوم جامعہ ملیہ'' کے عنوان سے اوراس طرح کے نہ جانے کتنے مضامین دادامیاں کے قلم سے نکلے، اور قوم وملت کی ترجمانی کی۔

حق کو جب ٹھیس لگے گی تو میں یاد آؤں گا
سونی محفل کی اداسی کو بھی گرماؤں گا

مدینہ کا روحانی سفر:

دوران علالت ایک روز عصر کی نماز کے بعد دادی نے مجھے بلایا کہ دیکھو دادامیاں اپنے تخت سے اتر کر جنگلے کی دیوار پر بیٹھے ہیں، میں دوڑا گیا تو دیکھا کہ واقعی اتنی کم جگہ میں کیسے بیٹھے ہیں؟ میں نے دادامیاں سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے؟ فرمانے لگے کہ مدینہ جانا ہے، اور حضور ﷺ کی قبر پر فاتحہ پڑھنا ہے۔ دادامیاں کے یہ الفاظ سن کر اور بے چینی دیکھ کر میرے جسم پر بجلی سی گرگئی کہ جو شخص ہمیشہ سفر میں رہتا تھا، جس کا بیگ ہمیشہ تیار رہتا تھا، جس نے آرام کو اپنے سے کوسوں دور رکھا، آج بیماری نے اس عظیم مسافر کے قدم باندھ دیے مگر ذہنی سفر سے نہیں روک پائی اور آخر وقت تک مدینہ کا سفر کرتے رہے۔

تقوی:

دادامیاں حساب وکتاب کے معاملہ میں بڑے حساس تھے۔ ایک ایک پیسہ کا حساب دیتے اور لیتے تھے۔ دادامیاں کو حساب دینے والوں کو پسینہ آجاتا تھا۔ دادامیاں کا رجسٹر مدرسہ میں مشہور تھا، جس میں ایک ایک پائی کا تذکرہ ہوتا تھا۔ دادامیاں مدرسہ کے مال سے ہمیشہ اجتناب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مدرسہ میں ہمیشہ خوراکی دے کر کھاتے تھے۔ گورکھ پور سے جب میں عربی چہارم کے لیے دوسرے مدرسہ جانے لگا تو فرمانے لگے کہ دیکھو جہاں بھی جانا، مدرسہ کی خوراکی کو ہمیشہ ادا کرنا، بغیر خوراکی کے مدرسہ کا مت کھانا، یہ زکوۃ وصدقات کا مال ہوتا ہے اگر غیر مستحق کھائیں گے تو مدرسہ ان کو کھا جائے گا۔

آخری دیدار:

۳؍ستمبر ۲۰۱۲ء بروز سوموار ایک بجے دن میں میری دادامیاں سے آخری ملاقات ہوئی،

مجھے سعودیہ میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں طبیب کے عہدے پر ملازمت پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ۵ر ستمبر کو دہلی سے فلائٹ تھی۔ دہلی جانے سے قبل جب میں دادا میاں کے کمرے میں داخل ہوا تو دادا سو رہے تھے۔ دروازہ پر پہونچ کر میں اپنا ہوش کھو بیٹھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دادا میاں کی بیماری اور گرتی صحت کو دیکھ کر بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ نہ جانے اس کے بعد ملاقات ہوگی یا نہیں؟ دادا اس وقت سہارے سے اٹھتے بیٹھتے تھے، اس دن بغیر سہارے کے اٹھ کر بیٹھ گئے اور مجھے دیکھ کر اپنے قریب بلایا اور اپنی آغوش میں لے لیا۔ بہت دیر تک میں دادا میاں کی گود میں سر رکھ کر روتا رہا۔ دادا اپنے مبارک ہاتھوں کو میرے چہرے پر پھیرتے رہے اور دعا دیتے رہے۔ پاس میں کھڑے والد صاحب کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں، والد صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا چلو اب گاڑی کا وقت ہوگیا ہے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس عظیم ہستی کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر چلا جس کے سایے میں زندگی کا بیشتر حصہ بطور خادم، بطور شاگرد اور بطور پوتا گزارا تھا۔

پیغام محبت:

دادا کے آخری ایام چل رہے تھے، والدہ کہتی ہیں کہ انتقال سے صرف دو روز پہلے میں ابا کے پاس بیٹھی تھی، ساتھ میں خالہ (دادی) بھی تھیں، ابا نے میرا ہاتھ پکڑا اور دادی کے ہاتھ میں دے کر بڑی دیر تک اپنے ہاتھوں سے دبائے رکھا۔ اور پاس ہی میں موجود اپنی دونوں بیٹیوں قدسیہ خانم اور طیبہ خاتون کی طرف اشارہ کرتے رہے، اور اشارہ کے ذریعہ پیغام محبت دیتے رہے۔

دادا میاں کی دو شادی ہوئی تھی، پہلی فتح پور تال نرجا فخر النسا بنت عبدالاحد سے ہوئی تھی۔ دادی مرحومہ کیسی تھیں ان کے اخلاق کیسے تھے؟ اس کے لیے دادا میاں کا شعر جو مرحومہ دادی کی یاد میں ہے بیان کرنے کے لیے کافی ہے:

برسوں بھی ان سے حرف شکایت نہ کہہ سکا
اوروں سے سن کے ان کا کرم یاد آگیا

دادی مرحومہ کا انتقال ۱۹۶۵ء میں ہوا تھا۔ دادی نے اپنے بعد پانچ لڑکے اور ایک لڑکی یادگار چھوڑی۔ دادی کے انتقال کے وقت چھوٹے چچا محمد طارق کی عمر تین ماہ تھی۔ دادی کی بہن

مرحومہ طاہرہ خاتون اور پھوپھی قدسیہ خاتون نے دادی کے بعد ان کی دیکھ ریکھ کی۔

دادی کے انتقال کے بعد دادا فرماتے تھے کہ ایک بار میں فاتحہ پڑھنے کے لیے عارف کو ساتھ لے گیا، راستہ میں اس نے پوچھا کہ ابا! اماں کہاں ہے؟ میں نے وہ جگہ دکھائی۔ پھر اس نے جو سوال کیا اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کہنے لگا کہ اماں کب اٹھیں گی؟ میری آنکھیں نم ہوگئیں کہ اس بچے کو میں کیسے تسلی دوں۔

والد محترم نے اپنی والدہ مرحومہ فخر النسا کی یاد میں ایک مدرسہ فخریہ نسواں رگھولی میں قائم کیا جس کی بنیاد دادا میاں کے ہاتھوں رکھوائی۔ اور مدرسہ دار العلوم رحیمیہ رگھولی کی نئی عمارت میں جس کی بنیاد دادا میاں کی زندگی میں رکھی گئی تھی، بن کر تیار ہے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اس نئی عمارت کو دادا میاں کی نسبت سے ''جوہر منزل'' کر دیا گیا ہے۔

دادا میاں سے برخوردار محمد شہاب جس کی عمر تین سال تھی، بہت مانوس تھا، جہاں وہ تیل شیشی ہاتھ میں لے کر آتا، پہلے اس سے مصافحہ کرتے پھر اپنا سر اس کے سامنے کر دیتے۔ چھوٹا سا بچہ دادا میاں کے سر پر ہاتھ پھیر دیتا اور خوش ہو جاتا۔ یہ تھی دادا میاں کی بچوں کے ساتھ شفقت اور مانوسیت۔

آخری سفر:

دادا میاں حالت نزع میں دعائیہ کلمات ادا کرتے رہے اور لوگ دعا کی تلقین کرتے رہے۔ میری چھوٹی بہن جو دادا کے پاس بیٹھی تھی، جب بھی پوچھتی کہ دادا کچھ چاہیے، بس خفیف آواز میں فرماتے کہ دعا پڑھو۔ آخر کار ۳۰ر نومبر ۲۰۱۲ء مطابق ۱۵ر محرم الحرام ۱۴۳۴ھ کو دعا پڑھتے ہوئے اور دعا کی تلقین کرتے ہوئے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اس طرح ایک عہد تمام ہوا اور ایک انجمن سونی ہوگئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

❑❑❑

مولانا محمد افضال الحق جوہرؔ قاسمی

مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب
مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور

۳۰ر نومبر ۲۰۱۲ء کی صبح کیسی اداس اور ماحول کیسا غم انگیز تھا جب یہ خبر سننے کو ملی کہ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی (صدر مرکزی جمعیۃ علماء ہند) اس دنیائے بے ثبات سے رخصت ہو گئے۔ ہر چند کہ انہوں نے عمر طبعی گزار کر رخت سفر باندھا مگر ان کے چاہنے والوں کی چاہت یہ تھی کہ وہ ابھی کچھ دن اور ہمارے درمیان رہتے، کچھ ہماری سنتے اور اپنی بھی سناتے۔ بے شک وہ ضعف و ناتوانی کے عالم میں ایک طویل عرصہ تک بستر علالت پر دراز رہے جس کے سبب سے سارے اعضا مضمحل ہو گئے تھے۔ باتیں بہت کم کرتے تھے مگر فکر و شعور سے ہرگز محروم نہیں ہوئے تھے۔ کہہ سکتے ہیں کہ پون صدی کی پر مشقت عملی زندگی سے اوب کر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ایسا متحرک اور فعال شخص جو طویل عرصے تک ملک وملت کے مسائل سے جوجھتا رہا، مخالف ہواؤں میں بھی سرگرم رہا اور متلاطم دریا میں ملت کے سفینے کو پار لگانے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا، ایسا کیا ہوا کہ چھوٹے سے گاؤں ''رگھولی'' میں آ کر پڑ رہا۔ بلاشبہہ رگھولی ان کا وطن تھا جہاں انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں، وہیں پلے بڑھے تھے مگر تعلیم دیوبند میں حاصل کی تھی اور شیخ الاسلام کی صحبت و معیت میں کندن بنے تھے۔ پھر ساری زندگی انہیں کے مشن کی خاطر سرگرداں رہے۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں، ان کی زندگی عبارت تھی حرکت و عمل سے۔ خود بھی متحرک رہے اور دوسروں کو بھی متحرک دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر مولانا سن سکتے تو ہم ان سے ضرور سوال کرتے کہ آپ نے ڈھیر

سارے دن ایک کہف میں کیوں کر گزار دیئے؟ آپ کا دل نہیں گھبرایا؟ اس عرصے میں ملت اسلامیہ پر کیسے کیسے ستم توڑے گئے، نوجوانوں کو مشق ستم بنایا گیا۔ بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تھا جب آپ عمل کے میدان میں تھے، اس وقت آپ نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے مولانا آزاد کا یہ قول دہرایا تھا کہ: ''اگر بابری مسجد مسلمانوں کو لوٹا دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کو جمہوریہ ہند میں برداشت کرلیا گیا ہے۔'' ہائی کورٹ کے فیصلے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہندوستان کا مسلمان ''ناقابل برداشت'' ہوگیا ہے۔ سیکولر انڈیا میں بابری مسجد کا انہدام، مہاراشٹر اور گجرات کے سانحات اور بے گناہ نوجوانوں کو گرفتار اور ٹارچر کیے جانے کے المناک واقعات کیا ثابت نہیں کرتے کہ مسلمان برداشت سے باہر ہوگیا ہے؟۔

ہم آپ کی طویل علالت کے دوران کئی بار آپ سے ملنے کی غرض سے رگھولی حاضر ہوئے مگر وہاں ہماری ملاقات اس افضال الحق سے نہ ہوسکی جس کے جوہر لکھنؤ، دہلی اور دیوبند میں کھلا کرتے تھے، جس کی ایک الگ رائے ہوا کرتی تھی، جس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بڑی بڑی گتھیوں کو سلجھا دیا کرتے تھے، جس کے قلم کی کاٹ تلوار سے زیادہ تیز ہوتی تھی مگر زبان پھول برسایا کرتی تھی۔ سخت سے سخت بات سن کر مسکرا دینے والا اب کون باقی رہ گیا ہے؟ ہمیں یاد ہے کہ بابری مسجد کے سانحہ کے بعد جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں ایک میٹنگ کے دوران ایک صاحب خواہ مخواہ آپ پر برس پڑے تھے مگر آپ نے جواب میں سب وشتم سے کام نہیں لیا اور بالکل نارمل رہے۔ ''اختلاف امتی رحمة'' کی حدیث بیان کرنے والے اب کہاں ایسے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ مولانا! آج ہمیں آپ کی زیادہ ضرورت تھی۔ آپ کے سارے ساتھی جا چکے۔ آپ کے قدردان اور جوہر شناس ایک ایک کر کے اٹھتے چلے گئے۔ آپ کو سننے اور آپ کی بات سمجھنے اور بھانپنے والے کبھی کے رخصت ہو چکے پھر آپ اکیلے رہ کے کیا کرتے؟ آپ کے شکوے کون سنتا؟ سپرد خاک کرنے سے قبل جب دیدار عام کے لیے آپ کے چہرے سے کفن سرکایا گیا تو سب نے دیکھا کہ زبان حال سے آپ کہہ رہے ہیں:

سنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

بے شک آج آپ بے زبان ہو چکے ہیں مگر کل تو نہیں تھے۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ''ملک میں سیاست میں اور ایوان حکومت میں علما کی ایک آواز تھی، ان کی رائے اور جد جہد کی قدر کی جاتی تھی لیکن ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۷ء تک چالیس برسوں میں تدریجاً وہ آواز ختم (بے اثر) ہوگئی۔'' مگر افسوس کہ اس پر دھیان دینے کے بجائے تعزیری نہیں بلکہ تعذیبی کاروائیوں کا بھی آغاز کردیا گیا۔ نتیجہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ ہم باتیں اب بھی کرتے ہیں، تجاویز بھی پاس کرتے ہیں۔ ہمارے وفود بھی صاحبان اقتدار سے ملتے رہتے ہیں مگر

''وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''

اسی دور میں مولانا مرحوم نے ایک طویل نظم کہی تھی جس کے چند اشعار ہمیں اب تک یاد ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

شور اخبار میں ہے قابل تعزیر تھے ہم
کیا کہیں گرمیٔ احساس سے دلگیر تھے ہم
ہم کو اقرار ہے حق بات کہی تھی ہم نے
یہ بھی تسلیم ، خوشامد بھی نہیں کی تھی ہم نے
حق کی آواز کو سننے سے گراں گوش نہ ہو
یارب اتنا بھی کوئی وقت فراموش نہ ہو
ملک آزاد ہے مذہب ابھی آزاد نہیں
کون گوشہ ہے مسلمان جہاں برباد نہیں
کسی شعبے میں بھی اس کے لیے انصاف نہیں
کسی منزل پہ سنی جاتی ہے فریاد کہیں؟

اور آخر میں حق گو افضال الحق نے یہ بھی کہہ دیا:

حق کو جب ٹھیس لگے گی تو میں یاد آؤں گا
سونی محفل کی اداسی کو بھی گرماؤں گا

یادش بخیر! اس مقام پر پہونچ کر ہمیں یاد آیا کہ مجاہد ملت کے مدفن کے قریب ان کے کسی

قدر شناس نے یہ شعر کندہ کرا دیا تھا:

جب زمانہ میں کوئی فتنہ نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

کاش کہ مولانا افضال الحق قاسمی کی قبر کے پاس انہیں کا یہ شعر کوئی کندہ کرا دیتا:

حق کو جب ٹھیس لگے گی تو میں یاد آؤں گا
سونی محفل کی اداسی کو بھی گرماؤں گا

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے اب کہاں؟ کہنے والے باقی نہ سننے کا یارا رکھنے والے موجود۔ اب تو تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر جماعت کے دفود بھی تعذیب کا نشانہ بننے لگے۔ ۲۱؍ اکتوبر کو آگرہ کے ریلوے اسٹیشن پر اس جماعت کے ساتھ جو کچھ پیش آیا کیا وہ جمہوری ہندوستان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہ تھا؟ اور کیا کسی سیاسی یا غیر سیاسی جماعت نے اس کے خلاف آواز اٹھائی؟ اور آگے کیا کچھ ہونے والا ہے اس کی بھی کچھ فکر ہے ہمیں؟ بلا شبہہ تبلیغی کام روکا نہیں جا سکتا، گشت پر بھی روک نہیں لگائی جا سکتی، مساجد کو بھی آباد رکھنا ضروری ہے، مدارس ومکاتب کا قیام بھی بہت ضروری ہے، مگر اس ملک میں سیاسی سرگرمی بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد کیوں ہم نے سیاست سے دست برداری اختیار کر لی؟ مسلم لیگ کی سیاست نے ملک کو اور مسلمانوں کو شدید نقصان پہونچایا تھا، اس لیے آزاد کانفرنس نے اس کو ختم کرنے اور جمعیۃ علما کو من حیث الجماعت پارلیمنٹری سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر ہم نے اس کا مطلب ہی نہیں سمجھا اور سیاست سے بالکلیہ علاحدگی اختیار کر لی۔ مسلم لیگی تو خائف ہوکر بزدلی کے ساتھ ایکانت بیٹھ گئے اور ہم نے مدرسوں کی راہ لی اور سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا۔ جب کہ ضرورت اس بات کی تھی ہم لوکل باڈیز سے لے کر مجالس قانون ساز اور پارلیمان تک اپنا اثر ورسوخ قائم کرتے۔ ہم سے یہ بڑی بھول ہوئی، چالیس سال تک تو مسلمان خوف کی نفسیات میں مبتلا رہا اور آنکھیں بند کر کے کانگریس کی جھولی بھرتا رہا، اس کے بعد مختلف سیاسی دھڑوں میں بٹتا چلا گیا۔ بے شک جزوی فائدے حاصل ہوئے مگر اس کے درد کا درماں پوری طرح سے نہ ہوسکا۔ یہ پہلا اتفاق ہے کہ حال ہی میں بے گناہ مسلم نوجوانوں کی حمایت میں آل پارٹی لیڈران

اور ارکان پارلیمان کے ایک وفد نے وزیراعظم سے ملاقات کر کے فاسٹ ٹریک عدالتیں قائم کرنے، باعزت بری ہونے والے نوجوانوں کو معاوضہ دلوانے اور قصور وار پولیس افسران کو جواب دہ بنانے جیسے اہم مطالبات کیے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سیاست کے میدان میں اسی طرح سرگرم ہوں جس طرح آزادی سے قبل ہمارے بزرگ تھے۔ہمیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اگر انگریز ملک کا دشمن اور غاصب تھا تو فرقہ پرست اور فاسسٹ اس سے بڑے دشمن ہیں۔جب ایک ایسٹ انڈیا کمپنی اس ملک میں تھی تو ہم نے اس کی مخالفت کی تھی، آج نہ جانے کتنی ایسٹ انڈیا کمپنیاں ملک میں موجود ہیں مگر ہم کنارہ کش اور خاموش ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں۔کل ہمارے بزرگ میدان میں آر پار کی لڑائی لڑتے تھے جب کہ ہم آج صرف تجاویز پاس کرتے ہیں اور زمینی لڑائی سے دست بردار ہو چکے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں اکثر مولانا حفظ الرحمان یاد آتے ہیں جنہوں نے رائٹرس بلڈنگ میں وزیراعلی مغربی بنگال بی سی رائے کا گریبان پکڑ لیا تھا اور یوپی میں چرن سنگھ سے دو دو ہاتھ کر لیے تھے اور جب پنڈت نہرو نے مسلم کنونشن میں کانگریسیوں کی شرکت پر قدغن لگادی تھی تو جمعیۃ آفس سے یہ کہتے ہوئے پی ایم آفس گئے کہ آج گلے میں پڑا ہوا طوق (پارلیمنٹ کی رکنیت) اتار کر آؤں گا لیکن پنڈت جی مولانا کے دلائل کے آگے سپر انداز ہو گئے اور حکم واپس لے لیا۔

بے شک جس طرح ہمارے پیشروا کابر دنیا میں نہیں رہے، مولانا افضال الحق قاسمی بھی نہیں رہے۔مگر ملت اسلامیہ ہندیہ تو ہے اور رہے گی۔اس کی قیادت اور رہنمائی کا فریضہ تو کسی نہ کسی کو ادا کرنا ہی پڑے گا۔سوال یہ ہے کہ کون کرے گا؟ نوجوان بے حوصلہ ہورہے ہیں، ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں بے حوصلگی پیدا ہوئی تو ہمارے اسلاف نے اس کو دور کیا، آج پھر ملت انہیں حالات سے دوچار ہے۔۴۷ء میں کسی نے ہندوراشٹر کا نعرہ نہیں لگایا تھا جب کہ آج کھلم کھلا اس قسم کی باتیں کی جارہی ہیں۔مرارجی ڈیسائی جیسے شخص نے بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر آج اسرائیل ہمارا حلیف ملک ہے اور اندرون ملک موساد کی ریشہ دوانیاں جاری ہیں۔آج ہمارے نوجوانوں کو جس طرح ٹارچر کیا جارہا ہے اور بے حوصلہ کیا جارہا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ فلسطینی نوجوانوں کی طرح انہیں بھی تختہ مشق بنانے کی کوشش ہورہی ہو؟ کیا ہم اپنی قیادت سے

پوچھ سکتے ہیں؟

''چیست یاران طریقت بعد ازاں تدبیر ما''

کاش کہ مولانا افضال الحق صاحب کچھ دن اور ہمارے درمیان رہتے اور ہم ان کی قیمتی رائے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے رہتے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدرسوں میں زیر تعلیم طلبہ کو اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے اور ان کے اندر حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت وصلاحیت پیدا کی جائے۔حکومت نے مدرسوں کو ایڈ دے کر ان کو اپنا زرخرید بنالیا ہے۔انگریزوں نے معدودے چند مدارس کو اپنی تحویل میں لیا تھا جب کہ ہماری قومی حکومت بڑی تعداد میں مدارس کو زیر دام لا چکی ہے،جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زبانوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں،صلاحتیں مفقود ہوتی جاری ہیں اور پیسوں پر نگاہ ہے۔

مولانا افضال الحق قاسمی کا شمار شیخ الاسلام کے خاص تلامذہ ومسترشدین میں ہوتا تھا۔ انہوں نے شیخ کی صحبت میں رہ کر جو کچھ سیکھا تھا اس کو اپنی زندگی میں برتا بھی۔حق گوئی وبے با کی انہیں سے سیکھی تھی۔افسوس کہ وہ میکدہ باقی ہے نہ اس کے جرعہ کش پائے جاتے ہیں۔یوں کہہ سکتے ہیں کہ:

''آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند''

مولانا افضال الحق قاسمی مجلّہ''تذکیر'' کی مجلس ادارت کے ایک اہم رکن تھے اور یہ انتساب کوئی رسمی انتساب نہ تھا بلکہ ادارہ تذکیر سے وابستہ افراد کے افکار وخیالات سے پوری طرح ہم آہنگ اور متفق تھے،اور ان سے اکتساب فیض کرتے رہتے تھے۔اس لحاظ سے مولانا کی مفارقت ادارہ تذکیر کے لیے بڑے خسارے کا باعث ہے۔مولانا خود بھی اپنے مدرسہ دارالعلوم گورکھ پور سے''دانشور'' کے نام سے ایک ماہنامہ نکالتے تھے اور ترجمان دارالعلوم دیوبند کے مدیر تھے۔مولانا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کورٹ کے رکن بھی رہے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ اس چراغ سے نہ جانے کتنے چراغ روشن ہوئے۔شمالی ہند کا قدیم اور معروف دینی تعلیمی اور رفاہی ادارہ مدرسہ دینیہ غازی پور تو ان کے گھر آنگن جیسا تھا اور مرحوم بلا کسی پروگرام کے ازخود بھی یہاں تشریف لاتے رہتے تھے۔مدرسہ دینیہ کے سابق صدر مدرس مولانا مشتاق احمد،مولانا مرحوم کے دیوبند کے

رفقاء درس میں تھے۔ یادش بخیر! حضرت شیخ الاسلام بھی اس ادارہ میں بلا پروگرام کے تشریف لاتے تھے۔ سلہٹ (آسام) میں قیام رمضان کے بعد جب آپ کی واپسی ہوتی تو غازی پور کچھ دیر کے لیے ضرور قیام فرماتے تھے۔ مولانا افضال الحق صاحب نے مدرسہ دینیہ کی ''پرسٹیج پرانچ'' (پروقار شاخ) مسلم پور میں حفظ قرآن کے شعبے کا افتتاح فرمایا تھا۔ جب مولانا افتتاح کی رسم ادا کرنے کے لیے وہاں تشریف لائے تھے تو مدرسہ ابتدائی مرحلہ میں تھا۔ اب الحمدللہ قومی شاہ راہ ۲۹ر کے دونوں طرف طویل وعریض عمارتوں میں تعلیمی درجات اور ہوسٹل قائم ہیں۔ افسوس کہ مولانا کی طویل علالت اور معذوریوں نے موقع نہیں دیا، ورنہ مولانا اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودے کو دیکھ کر یقیناً خوش ہوتے۔ ۱۹۷۸ء میں جب شوکت منزل مدرسہ دینیہ کو ملی تو مولانا مرحوم اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور خدام مدرسہ کو مشورہ دیا کہ یہ جگہ تصنیف وتالیف کے لیے بہت موزوں ہے، یہاں اس طرح کا ایک شعبہ قائم ہونا چاہیے۔ چنانچہ مولانا نے خود ہی اس کا نام ''ادارہ ترجمان الاسلام'' تجویز فرمایا۔ اس ادارے سے ۱۹۸۴ء میں سب سے پہلے مولانا ہی کا تحریر کردہ مضمون بعنوان ''مساوات'' کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ مولانا مرحوم ہی اس کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تھے۔

کون واقف نہیں ہے کہ مولانا مرحوم نے اس طرح کے بہت سارے کام کیے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبولیت سے نوازے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین

(بشکریہ مجلّہ تذکیر غازی پور)

❑❑❑

نقش صفات:

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمیؒ کی قرآنی بصیرت

مفتی محمد روح اللہ قاسمی صاحب
مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی بہار

حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی رحمۃ اللہ کی علمی شخصیت، ان کی بزرگی اور صالحیت وصلاحیت میں پختگی کی دلیل کے طور پر ہم لوگوں کی نگاہ میں یہی بات کافی ہے کہ وہ ہمارے حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ کے محسن اساتذہ میں سے تھے اور بعض ناخوشگوار حالات کے پیش نظر جب ملک کے تقریباً تمام مدارس کے دروازے ہمارے مولانا پر بند ہوگئے تھے تو یہی وہ گود تھی جس کی بے پناہ شفقتوں نے حضرت مولانا کی اچاٹ طبیعت کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ ہمارے مولانا جیسے ذہین اور وسیع المطالعہ طالب علم کو درسگاہ میں مطمئن کردینا لوہے کے چنا چبانے کے مرادف تھا، مگر اپنی مہین آواز اور غیر واضح لب ولہجہ کے باوجود حضرت مولانا افضال صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ''علم کی گیرائی وگہرائی، ذہانت کی قوی گرفت، دلائل کی قوت، طلبہ کو مطمئن کرنے کے سلیقہ'' نے کہ ہمارے مولانا کی طبیعت کو کبھی بے اطمینانی اور کمی کا احساس نہیں ہونے دیا'' اور ذہانت کی وجہ سے جو نئے نکتے یا دلائل کی نئی ترتیب مولانا کے ذریعہ ملتی، وہ علم کے نادر ابواب ہوا کرتے تھے۔'' (دیکھئے: سراپا اعجاز ص ۴۵۰، ۴۵۱)

حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمیؒ دیگر علوم میں مہارت کے ساتھ علوم قرآنی سے بھی خاص شغف رکھتے تھے۔ خداداد ذہانت، قرآن کریم سے فطری لگاؤ اور مطالعہ کی کثرت نے قرآنیات کا آپ کو ماہر بنادیا تھا۔ قرآن کریم ان کے مطالعہ کا خاص موضوع رہا ہے۔ وہ قرآن

کریم کے پیغام کو دائمی اور آفاقی سمجھتے تھے۔قرآن کریم کے پیغام اور اس کی جامعیت کو آپ وسیع تناظر میں دیکھنے کے قائل تھے۔ماضی کے ساتھ حال و مستقبل کو بھی آپ قرآنی نظریات سے دیکھتے تھے۔کائنات میں ہونے والے واقعات کے اسباب قرآن کریم سے تلاش کر کے اس کا جائزہ لیتے اور اس کے نتائج و مضمرات سے آگاہی حاصل کرتے تھے۔ان کا ایمان تھا کہ قرآن کے مضامین آج بھی اسی درجہ تازہ اور حالات کے عین مطابق ہیں،جیسا وہ اپنے نزول کے زمانے میں تھا۔قرآن زمانے کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اور اس نے جن تاریخی واقعات اور قصص کا تذکرہ کیا ہے درحقیقت وہ ایک آئینہ ہے جس میں قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ اور دنیا کے الٹ پھیر کے واقعات کی تصویر موجود ہے،جس سے اس کے پس منظر اور پیش منظر کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔درحقیقت ''انھوں نے تفسیر کا خصوصی درس حضرت مولانا احمد علی لاہوری مفسر قرآن کی خدمت میں لیا تھا۔قرآنی حکمت انسان کی روزمرہ زندگی میں کس طرح نافذ ہو،اس کی حکمت وجامعیت کن کن آفاق کو محیط ہے؟ مولانا کا ذہن بڑی سرعت سے اس تک پہونچتا تھا اور اس کی تعبیر اچھوتے انداز میں کرتے تھے۔''(سراپا اعجاز:ص ۴۵۷)

ماضی قریب میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری ہندوپاک کے بڑے نامور مفسر قرآن گزرے ہیں۔انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے تفسیر کا ایک خاص طرز سیکھا تھا اور مدارس عربیہ کے فضلاء کے لئے ڈھائی تین مہینہ کا نصاب بنایا تھا۔یہ درس قرآن بہت مقبول ہوا۔مدارس کے باصلاحیت فضلاء اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔اور انہیں کی رعایت سے یہ مختصر سہ ماہی نصاب مدارس کی تعطیل کے ایام کو مدنظر رکھ کر پڑھایا جاتا تھا۔حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اساطین علم نے اس درس قرآن سے استفادہ کیا ہے۔فضلائے مدارس کی شرکت کی وجہ سے مولانا لاہوریؒ کا یہ درس قرآن ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گیا۔واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں درس قرآن کے عمومی رواج اور لوگوں میں اس کی مقبولیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔(دیکھئے:پرانے چراغ رحصہ اول ص ۱۲۷) حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی ۱۹۴۱ء میں دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا لاہوری کی خدمت میں پہونچے اور اس خصوصی درس میں شریک ہوئے۔

مولانا شروع سے ہی لکھنے لکھانے کے عادی تھے۔ درس ومطالعہ سے جو وقت بچ جاتا اس میں قلم کی سواری فرماتے۔ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے ان کے شاگرد رشید عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ رقم طراز ہیں: ''مولانا بہت محنت سے مطالعہ کرتے، رات گئے تک مطالعہ میں مشغول رہتے، دیر تک کچھ لکھتے رہتے۔'' (سراپا اعجاز: ص ۴۵۱)

مگر یہ بات باعث افسوس ہے کہ مولانا نے اپنی تحریروں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں فرمایا۔ جو مضامین لکھے گئے وہ ملک کے مختلف مجلّات ورسائل کے حوالے کر دیئے گئے، مگر اس کی نقل اپنے پاس محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اگر آج ان کے مضامین محفوظ ہوتے تو علم کے شناوروں کے لئے یقیناً خاصے کی چیز ہوتی۔ اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں گورکھپور کے ایک مدرسہ ''دارالعلوم گورکھپور'' میں قیام کے دوران مولانا نے ''دانشور'' نامی ایک ماہانہ مجلّہ نکالا اور اس کا ایک خاص عنوان ''درس قرآن'' رکھا۔ اس عنوان کے تحت ذہن میں ابھرنے والے طرز تحریر سے ہٹ کر ایک نئے انداز میں قرآن کریم کے علوم کو کاغذ پر بکھیرنا شروع کیا۔ آپ نے اس عنوان کے تحت لکھے جانے والے مضامین میں نظام ظاہر کے ساتھ نظام باطن اور امور تکوینی کی وضاحت اور اس کی نقاب کشائی پر زور دیا۔ واقعات کے پیچھے کام کر رہی خدائی حکمتوں کو آشکار کیا اور بڑے واضح انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس ظاہری نظام کے علاوہ جس میں ہم رہتے بستے ہیں، ایک اور غیبی نظام، قدرت کی طرف سے کارفرما ہے۔ بعض اوقات نظام ظاہر کے اعتبار سے معاملات اور اس کے نتائج واضح نہیں ہوتے، مگر نظام باطن میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مصلحت وحکمت کے عین مطابق تھے۔ قرآن کریم میں ذکر الٰہی، پیغامات، واقعات اور اس کے منطقی نتائج اور اس میں بیان کردہ ابدی حقیقتوں کی ترجمانی کے لئے آپ نے طاقت ور اور پرکشش اسلوب اپنایا اور پابندی سے لکھتے رہے تا آنکہ مجلّہ نے اپنا وقت پورا کر لیا۔ اتفاق ہے کہ اس مجلّہ کی کاپیاں بھی محفوظ نہیں رہ سکی، نہ ہی مدرسہ میں اس کا کوئی ریکارڈ رہ سکا۔ تاہم تلاش بسیار سے اس کے جو بھی شمارے مل سکے اس سے قرآنیات پر لکھے گئے مولانا کے مضامین سے جستہ جستہ نمونے سپرد قلم کیے جا رہے ہیں جس سے مولانا کے ذوق ومزاج کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری کوشش ہوگی کہ مختلف مضامین میں ایک موضوع کے تحت بکھیرے گئے جواہر پاروں کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے جس

سے صورت واقعہ بھی نکھر جائے اوران موتیوں کا حسن بھی دوبالا ہو جائے۔

قصہ موسیٰ وخضر علیہما السلام:

قرآن کریم نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات کا قصہ نقل کیا ہے۔ دوران سفر تین واقعات پیش آئے جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر کوٹوکا۔ دونوں کی جدائیگی ہوگئی اور آخر میں حضرت خضر نے اپنے کاموں کی مصلحت سے آگاہ کیا جو فطرت کے عین مطابق تھا اور حضرت خضر نے واضح لفظوں میں کہا کہ یہ سب کوئی میرا ذاتی فعل نہیں تھا، بلکہ میری تبدیلیوں کے پیچھے رب العالمین کی منشاء شامل تھی۔ **ما فعلته عن امری.**

اب سوال یہ ہے کہ حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ غالباً حضرت خضر بھی نبی ہیں، مگر جو ہدایات وقتی طور سے حضرت خضر کومل رہی ہیں ان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیوں بے خبر ہیں؟ حتی کہ اس بے خبری کی وجہ سے ان کو علیحدہ ہونا پڑا، مگر ان کی بے خبری قائم رہی۔ اس سوال کا جواب کس عمدگی کے ساتھ حضرت مولانا نے دیا ہے جس سے کائنات میں نظر آرہی تبدیلیوں کے پس پردہ خدائی حکمت واضح طور سے جلوہ نما ہوتی ہے۔

کائنات میں دو پرت:

آپ لکھتے ہیں:

''ہمارے سامنے جو کائنات ہے اس کی پیاز کے چھلکے کی طرح دو سطحیں ہیں بلکہ دو پرت ہیں۔ جس سطح میں ہم انسان رہتے ہیں وہ آخری سطح ہے اور غالباً چوتھی سطح ہے یا تیسری سطح، اور دوسری سطحوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جو لوگ حرکت وعمل کرتے ہیں، ہم ان سے آج بھی بے خبر ہیں، کل بھی بے خبر تھے۔ اس لئے ہماری سطح ظاہری کہلاتی ہے اور دوسری سطحیں باطنی کہلاتی ہیں۔ اسی وجہ سے علم کی بھی دو قسمیں چل رہی ہیں علم ظاہر اور علم باطن۔ باطنی امور کے علم کو علم غیب بھی کہتے ہیں۔'' (دانشور: ص ۱۱۔ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۰ء)

اس حقیقت کو مثال کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ فرماتے ہیں:

''اس کی واضح مثال ریڈیو، ٹی وی اور کمپیوٹر ہے کہ کمرے میں بالکل سناٹا ہے، کوئی آواز نہیں ہے، مگر ریڈیو کھول کر دیکھئے یا ٹی وی، تو تمام قسم کے الفاظ، آوازیں، تصویریں، میچ اور

کانفرنس، زلزلے اور طوفان سامنے آتے چلے جاتے ہیں جو ریڈیو یا ٹی وی پر ریکارڈ بھی ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ سنائی اور دکھائی بھی دیتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں کمرے کی فضا کے اندر گذرتی رہتی ہیں جب کہ میرے کان، میری نگاہ اور میرے حواس اس دوسرے پرت کی بات چیت، آوازوں، تصویروں، مقامات کی آمد روفت سے بے خبر رہتے ہیں اور اگر سنتے یا دیکھتے ہیں تو صرف ان مشینوں کے ذریعہ سے، حالانکہ ہمارے پاس ان سے بہتر کان ہیں، آنکھیں ہیں، عقل ہے، مگر وہ انسانی سطح تک محدود ہیں، باطنی سطح تک نہیں پہونچ سکے، کیونکہ محدود ہیں۔ اور ریڈیو میں جو حواس ہیں وہ ہمارے مقابلے میں غیر محدود ہیں۔'' (دانشور: ص ۱۱۔ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۰ء)

مولانا کے بقول یہی وہ تیسری سطح ہے جس میں اجنہ رہتے ہیں اور فرشتے رہتے ہیں، ان کی آمد و رفت رہتی ہے، روحیں آتی جاتی رہتی ہیں، آوازیں، حرکتیں اور فیصلے ہوتے رہتے ہیں، مگر پہلی پرت والے اس ہنگامے کو محسوس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خدا نے ہمیں جو حواس دئے ہیں وہ محدود ہیں، ہم بے خبر رہتے ہیں، کیونکہ ہم علم باطن نہیں رکھتے، صرف علم ظاہر رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب دو فریق ہو جس میں فریق اول دونوں سطح کی خبر رکھتا ہو جبکہ فریق ثانی صرف پہلی سطح سے واقف ہے اور دوسری یا تیسری سطح سے اسے قطعاً ناواقفیت ہے تو جب فریق اول کچھ بتائے گا تو فریق ثانی بعض اوقات حیرت واستعجاب کا شکار ہو کر رہے گا۔ قرآن وحدیث میں ڈھونڈنے سے اس کی سینکڑوں مثالیں مل سکتی ہے۔ خود مولانا نے اپنی تحریروں میں اس طرح کی کئی مثالیں جمع کر رکھی ہیں۔ بند کمرے میں آپ علیہ الصلوۃ والسلام حضرت عائشہؓ سے فرماتے ہیں: ''عائشہ! جبرئیل تم کو سلام کہتے ہیں۔ جسے سلام کیا جا رہا ہے وہ بھی وہیں موجود ہے، مگر اسے سلام کرنے والے اور اس کے سلام کی قطعاً خبر نہیں، مگر یہ ہے حقیقت واقعہ۔ میدان بدر میں آغاز جنگ سے پہلے دونوں پرت کی خبر رکھنے والے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے نام بنام ان مقامات کی نشاندہی فرمادی جہاں سرداران مکہ کو قتل ہو کر گرنا تھا۔ اور وہ جنگ کے اختتام پر وہ وہیں گرا پڑا تھا جہاں کی نشاندہی ہوئی تھی۔ انہیں مقتولین بدر کے سرداروں کا نام لے کر لے کر آپ علیہ السلام نے پوچھا کہ ہم نے تو خدا کے وعدے دیکھ لئے، کیا تم لوگوں کو بھی خدا کی دھکمیوں کی حقانیت سمجھ میں آ گئی؟ تو حضرت عمرؓ نے استفسار کیا کہ کیا یہ مردے اور سڑی گلی لاشیں بھی سن سکتے

ہیں؟ مگر یہی حضرت عمرؓ نے زمانہ خلافت میں اس سطح سے واقفیت کی بناء پر جب سینکڑوں میل دور پہاڑ کے دامن میں مجاہدین اسلام کو دشمنوں سے بے خبر پایا تو دوران خطبۂ جمعہ ہی "یا سارية الجبل" کہہ کر انہیں متنبہ کیا اور وہ لشکر اس انتباہ سے چوکنا بھی ہوگیا۔اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام اور چیونٹی کا قصہ قرآن نے نقل کیا ہے۔چیونٹی کی بات حضرت سلیمان علیہ السلام اور دوسرے چیونٹیوں نے سن لی، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر والے نہیں سن سکے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکر کو کسی جنگل کی چیونٹی نے کیسے پہچان لیا کہ ان کی امت آرہی ہے اور ان کو کیسے پتہ چلا کہ یہ نبی کی امتی ہیں؟ اس لئے دانستہ چیونٹیوں کو روند نہیں سکتے اس لئے "وهم لا يشعرون" کہا۔

بات وہی ہے کہ ہماری فضا کی جو دوسری پرت ہے اس میں پتھروں، جانوروں اور درختوں کے حواس کام کرتے ہیں، ان کی عقلیں کام کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اطلاع دینے سے انبیاء علیہم السلام کو دونوں پرت کا علم ہوجاتا ہے۔وہ اس پرت پر رہتے ہوئے دوسرے پرت کے لوگوں سے بات کرتے ہیں، ان کے ادراک واحساس کو سنتے ہیں، ان کے واقعات کو معلوم کرتے ہیں، سوال وجواب کر سکتے ہیں اور بے زبان مخلوق کی زبان سمجھ لیتے ہیں۔ خود آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اونٹنی کے مالک کو بتایا کہ یہ تمہاری شکایت کررہی ہے۔نیز جب اس دوسری پرت میں رہنے والی مخلوق کے حواس اور عقلیں کام کرتی ہیں تو انہیں اللہ عزوجل یہ شعور بھی بخشتا ہے کہ وہ نبی کو پہچان لیں اور جب اللہ کا پیغمبر کہیں سے گذرتا ہے تو آس پاس کی تمام چیزیں، تمام جاندار اپنی سطح کے مطابق واقف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ صحیح احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ستون پہچانتا تھا جو مسجد نبوی میں لگا ہوا تھا، آپ کو وہ پتھر پہچانتا تھا جو آپ کو سلام کرتا تھا اور راستے میں تھا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ وہ کنکریاں پہچانتی تھیں جو آپ کے ہاتھوں میں تھیں اور کلمہ پڑھتی تھیں۔

حضرت خضر کی تبدیلیوں کا راز:

اس اصول کی روشنی میں اب حضرت خضر اور حضرت موسیٰ کے درمیان ہونے والے واقعات کو دیکھئے۔ واقعہ یہ ہے کہ:

''حضرت خضر، حضرت موسیٰ کے ساتھ عالم ظاہر میں موجود تھے اور ظاہر کی چیزیں دونوں دیکھ رہے تھے، مگر حضرت خضر عالم باطن سے بھی واقف تھے جس سے حضرت موسی بے خبر تھے۔ مگر حضرت خضر صرف ریڈیو نہیں تھے، ایک ایسی ہستی تھے جو ظاہر و باطن دونوں کا علم رکھتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ حالات میں اعتدال، رحم دلی اور اپنی مرضی نمایاں کرنے کے لیے بہت سی تبدیلیاں کرائی تھیں اور ان ہی تبدیلیوں کو ثابت کرنے کے لئے حضرت خضر حضرت موسیٰ کی چند گھنٹوں کی ملاقات کرائی تھی اور ان ہی ملاقاتوں نے وہاں عالم باطن اور خدائی مصلحتوں سے پردے اٹھائے ہیں، تاکہ انسانی واقعات میں ہونے والی اچانک تبدیلیوں میں ہم لوگ خدائی قدرت وحکمت، توانائی اور فیصلے دیکھ سکیں اور خدا کے سامنے حاضر ہونے کی تیاریاں کرتے رہیں۔ کیونکہ عالم باطن کے سامنے ہمارے عالم ظاہر کی ہر حرکت وسکون، ہر لمحہ اور ہر ذرہ اپنی تمام کیفیات واحوال کے ساتھ منکشف ہے اور عالم ظاہر میں ہر قوت محدود مانی گئی ہے۔'' (دانشور: ص۱۲۔ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۰ء)

تکوینی امور

اس حقیقت کو مولانا نے ایک جگہ اس انداز سے سمجھانا چاہا ہے اور انسانیت کا رخ اس کے خالق کی طرف گھمانے کی کوشش کی ہے کہ:

''اسی کا نام اسلام میں تکوینی امور ہے جو ثابت کرتا ہے کہ عالم انسانیت کو ہمارے اعمال جس طرف انفرادی اور اجتماعی طور سے لے جاتے ہیں، اس کے دوسرے سمت خدا کی قدرت اور مصلحت ہم کو گھما دیتی ہے۔ اس لئے ہم کرتے کچھ اور نتیجہ نکلتا ہے ہماری مرضی کے خلاف کچھ اور۔ معلوم ہوا کہ ہماری منشاء کے ساتھ ساتھ عالم ارواح میں متوازی طور سے حرکت وعمل جاری ہے۔ اس لئے علاقوں کی تقدیریں بدلتی رہتی ہیں اور ہم صرف اسباب کو تلاش کرتے رہتے ہیں، خدا کو بھول جاتے ہیں اور اس کے غیبی نظام کائنات کو بلا دلیل نظر انداز کرتے رہتے ہیں، حالانکہ غیبی طاقتیں متوازی طور پر ہر جگہ متحرک رہتی ہیں اور گہرائی میں اتر جایئے تو نظر آتی ہیں۔'' (دانشور: ص۹۔ اگست تا اکتوبر ۲۰۰۰ء)

حق و باطل کی فتح وشکست کا راز:

تاریخ انسانیت میں حق و باطل کی کشمکش ہمیشہ ہوتی رہی ہے،اس تعلق سے کئی ایک واقعات خود قرآن کریم نے ذکر کئے ہیں۔مولانا کی تحریروں میں اس کشمکش کا تذکرہ اور قوموں کی فتح وشکست کے اسباب اور اس کے راز سے نقاب کشائی کی کوشش کی گئی ہے۔لیکن یہاں یہ ملحوظ رہے کہ حق و باطل کے تقابلی تذکرہ سے حق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جماعت مرضیات الٰہی پر چلنے والی اور منشاء خداوندی کو پورا کرنے والی ہے۔اس مفہوم کے ساتھ حق کے معنی میں ذرا وسعت دی گئی ہے اور مقصود اس سے وہ جماعت ہے جسے خدائی مدد حاصل ہو۔دیکھئے قرآن کریم نے روم و ایران کی فتح وشکست کا تذکرہ کیا ہے اور رومیوں کی پسپائی اور رسواکن ناکامی کے بعد محض چند سالوں کے فاصلے سے اس کی فتح کی پیشین گوئی کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رومی منشاء خداوندی کو پورا کرنے والی قوم تھی۔

مولانا نے اپنی تحریروں میں اس واقعہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے۔

> ”جس وقت سب سے نزاعی مسئلہ کھڑا تھا اور یہ کشمکش چل رہی تھی کہ یہ قرآن خدا کی کتاب ہے یا نہیں؟۔سرداران قریش بضد تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہوسکتا،جب کہ ایمان والوں کا ایمان تھا کہ خدا کا نازل کردہ کلام ہے۔ابھی اسی کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ قرآن نے ایسا دعوی کر دیا جس سے مکہ کا پورا معاشرہ حیرت میں پڑ گیا۔دشمن کہتے تھے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا اور دوست کہتے تھے ایسا ضرور ہوکر رہے گا،یعنی رومن امپائر آج تو ہار گیا ہے،لیکن چند ہی سالوں میں یہی رومی ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔(دانشور:ص ۷۔فروری تا اپریل ۲۰۰۱ء)

ایمان والوں کا تو خیر سے خدا اور سول پر ایمان تھا اور اس تقاضہ سے ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر اس چیز پر آمنا وصدقنا کہہ کر اپنا ایمان بڑھائیں جو خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انہیں عطا ہو۔یہ تو محض دو قوموں کی فتح وشکست کا معاملہ تھا،وہ تو اس سے بھی بڑی بڑی باتوں کا اقرار کر چکے تھے اور ان میں بعض چیزوں کے مشاہدات سے ان کے یقین وایمان میں پختگی پیدا ہوتی جاتی تھی۔یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی فرد بشر مکہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے آسمانوں کا سفر

کر کے راتوں رات واپس آ جائے ،لیکن اگر یہ بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان برحق بول رہی ہے تو آمنا وصدقنا۔ جب قرآن کریم نے رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی کی تو مسلمان، جس کی نظر اسباب پر نہیں، مسبب الاسباب پر تھی، وہ اسے صحیح مان رہے تھے۔لیکن:

''صورت یہ تھی کہ جس شاندار طریقہ سے ایرانیوں نے رومیوں کو کھدیر کھدیر کر مارا تھا اسے جاننے والے عرب اس پیشین گوئی کا امکان بھی محال سمجھ رہے تھے۔اس لئے انہیں تعجب ہوا۔......مگر وہی ہوا کہ ایران کو فتح دلانے والے دونوں جرنیل شاہ ایران سے ناراض ہو کر رومیوں سے مل گئے ، پھر ان کی فوج کے سپہ سالار بن کر میدان میں اتر پڑے تو ان کو شکست دینے کے لئے ایران میں کوئی مائی کا لال نہیں تھا اور پھر وہ پورا ہوا جو خدا نے کہا تھا۔ایک طرف ظاہری طور پر ایرانی اور رومی اپنی اپنی طاقت آزمائی کر رہے تھے، دوسری طرف قرآن کے مطابق خدائی منشاء دلوں میں تبدیلی کر رہی تھی تو ایران کے بڑے بڑے جرنیل روم سے ایران ہی کو شکست دلانے کا انتظام کر رہے تھے۔ کیونکہ خدا کا دستور ہے کہ وہ اہل خیر کو ہمت دلاتا ہے اور اہل شر کو پیچھے دھکیلتا ہے۔''(دانشور:ص ۹۔فروری تا اپریل ۲۰۰۱ء)

سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں کر ممکن ہو پایا کہ جن رومیوں کو کھدیر کھدیر کر مارا گیا تھا اسی نے اس جماعت کے دانت کھٹے کر دئے جس نے محض چند سالوں پہلے اسے بری طرح پسپا ہونے پر مجبور کیا تھا۔مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ایسی بڑی بڑی قوموں کی ہار جیت حیران کن ضرور تھی، مگر خدا کہتا ہے کہ ہمارے لیے حالات کا الٹ پھیر کوئی مسئلہ نہیں۔ طاقت کے توازن کو برقرار رکھنا ہمارا نظم وضبط ہے۔اگر قوموں کی طاقت کا توازن برقرار نہ رکھیں تو تمام قسم کی مذہبی عبادتیں بھی تہس نہس ہو جائیں گی۔ تو طاقت کا توازن برقرار رکھنا خدا کی شان ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ فتح اسی فریق کی ہوتی ہے جس کو خدا کی مدد حاصل ہو جائے۔اس لیے پہلے ایرانیوں سے رومیوں پر فتح دلائی گئی پھر ایرانی جرنیلوں نے رومیوں سے واسطہ کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔تو رومی جیت گئے اور ایرانی ہمیشہ کے لیے پسپا ہو گئے اور دونوں طاقتوں کا غرور چکنا چور ہو گیا تو توازن برقرار ہو گیا۔''

قرآن کریم نے باطل کی تباہی کی ایک اور عجیب شکل سے آگاہ کیا ہے، جب ابابیل جیسے

معمولی پرندوں نے ابرہہ کی طاقتور فوج کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر عبرت کا سامان بنا دیا۔ ابابیل کسی لشکر کا کیسے مقابلہ کر سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے رزم گاہ حق و باطل کی داستان خود مولانا کی زبانی سنئے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

''ابابیل نے نہ اس دن مقابلہ کیا نہ آج کر سکتی ہے، مگر قادر مطلق اگر ایسے کام پر اس کو لگادے تو وہ خدا کی مرضی پوری کر سکتی ہے اور کر دیا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ابابیل نے مقابلہ کیا ہے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی غیبی طاقت ابابیل سے یہ کام کرا سکتی ہے یا نہیں؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ جو خدا خالق کائنات ہے وہ اپنی مرضی جس سے چاہے پوری کرا سکتا ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ) کوئی سامراجی طاقت اہل حق پر بلاوجہ حملہ کرتی ہے اور وہ قوم مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتی تو غیرت خداوندی اس کی مدافعت کا سامان خود مہیا کرتی ہے۔ یہ مدافعت کبھی آسمان سے کی جاتی ہے جیسے ابابیل مسلط کردی گئی یا قوم نوح پر پانی کا طوفان، عاد وثمود پر آندھی کا طوفان وغیرہ مسلط کر دئے گئے اور کبھی یہ مدافعت زمین سے کی جاتی ہے کہ دوسری قوموں کو مقابلہ میں لاکر طاقت توڑ دی جاتی ہے جیسے ''غلبت الروم'' اور کبھی شخصیت یا قوم کو ابھار کر مقابلہ کرادیا گیا جیسے شہنشاہ مصر فرعون کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام لائے گئے۔ اہل باطل کی اہل حق پر دہشت گردی ہوتی ہے تو قدرت اہل باطل کو ضرور جواب دیتی ہے۔ خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔'' (دانشور: ص ۷۔ فروری تا اپریل ۲۰۰۲ء)

جنین اور قرآنی دعویٰ:

رحم مادر میں پرورش پانے والا بچہ جس نے ابھی کارگہ حیات میں آنکھ نہیں کھولا ہے، قرآن کریم نے اس کے تعلق سے یہ دعوی کیا ہے کہ اس کا علم صرف اور صرف وحدہ لاشریک لہ کے پاس ہے۔ ''**یعلم ما فی الارحام**''۔ جب کہ سائنس کی موجودہ ایجادات اور اس کے ذریعہ رونما ہونے والے واقعات بظاہر اس دعوی کو توڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

حضرت مولانا نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے قرآن کریم میں ذکر لفظ ''**ما فی الارحام**'' کی وضاحت پر زور دیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ رحم میں نطفہ پہونچتا ہے تو وہاں

اسے نومہینہ تک رہنا پڑتا ہے اوران نومہینہ میں منی کا وہ ایک قطرہ معلوم نہیں کیسی کیسی تبدیلیاں قبول کر کے ایک مکمل انسان کی شکل میں باہر آتا ہے۔......قرآن کریم نے اس کے لیے ’’**مـــافـــی الارحام**‘‘ اور’’ **فی بطون امھاتکم**‘‘ جیسی اصطلاحیں ایجاد کی ہیں، جوجنین کی ان تمام کیفیتوں کوشامل ہیں جن سے اسے نومہینہ کی پوری عمر میں گذرنا پڑتا ہے۔

قرآن کریم کی مختلف آیتوں سے اس نومہینہ تک جنین میں ہونے والی مختلف تبدیلیوں اور کیفیات کی وضاحت اور خدائے وحدہ لاشریک لہ کے علم اور قدرت وحکمت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

’’پہلے خدا کا اعلان تھا’’**یعلم مافی الارحام**‘‘ پھردوسری آیتوں میں خدانے ’’**مافی الارحام**‘‘ کی اوراس کے بعداس سے متعلق اپنے علم وادراک کی تفصیل بتادی۔اس سے معلوم ہوا کہ جوشخصیت جہاں پیدا ہوتی ہے وہاں اتفاقاً نہیں بن جاتی، بلکہ خدائے برتر جان بوجھ کر وہاں پیدا کرتا ہے اورشروع سے اس کی زندگی کے موضوع کے مطابق اسے صلاحیتیں عطا کرتا ہے، پھراسے اختیار دیدیتا ہے کہ انہیں اپنی مرضی سے استعمال کرے۔اس لئے مولانا آزاد خدا کے علم میں اس وقت بھی مولانا آزاد تھے جب مکہ میں پیدا ہوئے اوراس وقت بھی جب کلکتہ سے ’’الہلال‘‘ نکال رہے تھے، اوراس وقت بھی جب دہلی کی جامع مسجد کے سامنے انھیں سپرد خاک کیا جارہا تھا۔‘‘ (ریاض الجنۃ:ص ۲۸۔نومبر ۱۹۸۸ء)

واقعہ یہ ہے کہ ہماری جوشخصیت دنیا کے ماحول، تعلیم وتجربہ سے مکمل ہوتی ہے وہ پوری شخصیت رحم مادر میں خدا کے سامنے ہوتی ہے، یعنی بچہ کی پوری شخصیت رحم مادر میں مکمل ہوجاتی ہے اور خالق تعالیٰ اس سے وہیں واقف ہوتا ہے کہ اسے نمرود بننا ہے یا ابراہیم۔چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب خاک مصر سے اٹھائے گئے، جب وہ رحم مادر میں آئے اور جب ان کی ماں نے دریائے نیل میں چھوڑ دیا اور جب آسیہ نے انھیں پرورش کے لئے اٹھایا، ان تمام مراحل میں اول سے آخر تک وہ موسیٰ تھے۔اور خدائے برتر ابتداء سے پوری واقفیت رکھتا تھا۔

ان صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے اوران تفصیلات کو ذہن نشیں کرتے ہوئے سچ بتائیے کہ کیا کوئی مائی کا لال قرآن کے دعوی کا مقابلہ کرنے کی جسارت کرسکتا ہے؟، کیا دنیا کے کسی

فرد، کسی مشین اور آلہ کے پاس یہ طاقت ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ " **مافی الارحام**"کی اسے بھی خبر ہے؟اور کیا صرف اور صرف نر اور مادہ بتانے میں ہزار بار غلطی کرنے والوں کو حق ہے کہ قرآنی چیلنج پر اعتراض کی سوچے؟نہیں اور ہرگز نہیں۔ بالکل صحیح فرمایا ہے حضرت مولانا نے کہ:

''آج انسانی علم اور علمی آلات بہت وسیع ، بڑے طاقتور اور نہایت باریک ہوگئے ہیں؛ لیکن ایسا انسان یا آلہ پیدا ہونا ممکن نہیں جو بتادے کہ کس خاک سے کون پیدا ہوگا۔ یا یہ بتادے کہ جو رحم مادر میں ہے اس کی شخصیت کیسی ہوگی؟یا جو بچہ پڑھنے جارہا ہے وہ مہاتما گاندھی یا شیخ الہند ہونے جارہا ہے ،جبکہ خدا اس کی شخصیت اور عظمت سے اس وقت سے واقف رہتا ہے جب اسے خاک وطن سے ابھارتا ہے اور جب وہ نطفہ بن کر آتا ہے اور جب وہ صرف ایک گوشت کی بوٹی ہوتا ہے۔اتنا وسیع ہے خدا کا علم۔قرآن کی ان صراحتوں کے بعد اس آیت پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا، نہ کسی کے منہ میں زبان ہے جو یہ کہہ دے کہ جنین کو ہم خدا کی طرح جانتے ہیں۔ایسا وہی کہہ سکتا ہے جو خدا کے علم،اس کی وسعت اور اس کی گہرائی سے واقف نہ ہو۔''

(ریاض الجنۃ:ص۲۹۔نومبر ۱۹۸۸ء)

حضرت مولانا جوہر قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین میں اس طرح کے نہ جانے کتنے علوم کے دریا بہائے گئے ہیں۔ یہ تو محض چند مضامین سے ان کی قرآنی بصیرت اور امور تکوینی پر ان کی گہری نظر کو دکھانے کی طالب علمانہ کوشش کی گئی ہے۔اگر ان کی علمی کاوشوں کو جمع کر کے اس میں پنہاں موتیوں کو نکھارا جائے تو یہ علمی دنیا کے لئے بڑا کام ہوگا۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی جس پائے کی شخصیت تھے ان کے بعد ان کا اس طرح تذکرہ نہیں ہوا اور ان کے روشن کارناموں کو اجاگر نہیں کیا گیا۔شاید بات یہ ہو کہ مولانا مرحوم اس خو کے مالک تھے کہ ان کے ''دل میں جو کچھ ہوتا تھا وہی زبان پر بھی ہوتا تھا، وہ ہمیشہ خدا لگتی کہتے ،کون ان کی باتوں سے خوش ہوتا ہے؟ کون ناک بھوں چڑھاتا ہے؟اس کی انھوں نے کبھی پرواہ نہیں کی، حتی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اپنوں نے ہی انھیں حق گوئی کی پاداش میں کنارے لگا دیا،مگر ان کے اندر جو''جوہر'' تھا وہ کسی انسان کا عطا کردہ نہیں ؛ بلکہ عطیہ الٰہی تھا، وہ اپنے مقام ومنصب سے آگاہ تھے اور آخری دم تک اس کا حق ادا کرتے رہے۔''(سراپا اعجاز:ص۴۰۷)

ہوسکتا ہے کہ جرم حق گوئی کی سزا میں انھیں نظر انداز کیا گیا ہو،مگرحق کی طاقت کو زیادہ دن دبایا نہیں جاسکتا۔دنیا ایک نہ ایک دن ان کے ساتھ انصاف پر مجبور ہوگی اور ان کی زندگی کے روشن نقوش اخلاف کے لئے مشعل راہ ثابت ہوں گے۔ان شاء اللہ تعالیٰ

(اس مضمون کی تیاری میں دار العلوم گورکھپور سے نکلنے والے مجلّہ ''دانشور'' کے دستیاب چند شمارے اور ریاض الجنۃ کے ایک شمارے سے مدد لی گئی ہے)

❑❑❑

حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہرؔ قاسمی کی شخصیت
اور
ان کی دینی وملی دردمندی اداریوں کے حوالے سے

مفتی شرف الدین عظیم قاسمی اعظمی
امام وخطیب جامع انوار شواجی نگر گوونڈی

طویل القامت بھرا ہوا متوازن اور پرکشش سراپا، رنگ صاف اوراس میں تابانی علم و تحقیق کی منور کرنیں، وسیع پیشانی کردار کی پختگی اور اخلاق واخلاص کی رفعت کا آئینہ، چہرہ پہ ذہانت وفطانت اور جلال ووجاہت کی روشن لہریں، آنکھوں میں فکر آگہی اور فراست ایمانی کی چمک، زندگی علامہ اقبال کے یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم سے عبارت، ہر آن ہر لمحہ بطن گیتی سے آفتاب تازہ پیدا کرنے کی ایک تڑپ ایک دھن، مدنی ونانوتوی کے عاشق زار، جہان قاسمی کی شادابی وسیرابی کے لیے ہمہ وقت مستعد وکمر بستہ، روایات دارالعلوم کے محافظ وامین اور انہیں روایات وتعلیمات کی ترویج واشاعت کے جذبات سے معمور دردمند قلب وجگر۔ یہ عناصر اعظم اور صفات زریں جب کسی وجود میں بحیثیت اجزائے ترکیبی بیک وقت جمع ہوجائیں تو وہ شخصیت آسمان علم وفضل پر استاذ الاساتذہ، جامع علم وعمل حضرت مولانا افضال الحق جوہرؔ قاسمی نوراللہ مرقدہ کی دل آویز صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

حافظہ میں یادوں کے دھندلے نقوش کے مطابق راقم سطور حضرت مولانا کی زیارت سے عمر کی اس منزل میں مشرف ہوا جب زندگی شعور وادراک کی دولت سے تہی مایہ ہونے کی وجہ

سے رجال صالحین کی عظمتوں اوران کی حقیقتوں سے نا آشنا تھی۔ غالبًا ۱۹۹۶ء کا زمانہ تھا، راقم شعبہ حفظ میں تھا، وقت کے ابن تیمیہ استاذ نا المعظم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی و پاسبانی میں برق رفتاری سے ترقیاتی منازل کی طرف رواں دواں ادارہ مدرسہ شیخ الاسلام شیخو پور میں تکمیل حفظ قرآن پاک کے اعزاز میں تقریب منعقد تھی، وسیع وعریض مسجد کے لان میں طلبائے حفاظ کی معصومیت سے لبریز پاکیزہ تلاوتوں کے بعد استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نے بہ نفس نفیس کھڑے ہوکر بصد ادب و نیاز اپنے محبوب استاذ اور عظیم محسن حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی سے وعظ ونصیحت کے لیے کرسی خطابت پر جلوہ افروز ہونے کی درخواست کی۔ استاذ و شاگرد کے درمیان الفت ومحبت اور عظمت واحترام کا وہ منظر کتنا دلنواز اور کتنا روح افزا تھا کہ ممدوح محترم نے شاگرد کی علمی عظمت ورفعت کے لحاظ میں کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرنا گوارا نہیں کیا، دوسری طرف احسان شناس وفرمانبردار شاگرد کو یہ منظور نہیں تھا کہ آپ کھڑے ہوکر خطاب کریں۔ یقیناً وہ لمحہ کس قدر مبارک اور جاں نواز تھا کہ جس پر محبتوں، الفتوں کا مکمل گلشن نثار اور بہاریں قربان تھیں۔

حضرت مولانا جوہر قاسمی صاحب اکیسویں صدی کے عہد آفریں اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ علمی دنیا میں جہاں وہ بیک وقت باکمال مدرس ومعلم، بااخلاص مربی ومزکی، صاحب نظر محدث وفقیہ، زبردست نقاد، عظیم مصنف، بے باک اور مخصوص ومنفرد اسلوب کے حامل نثر نگار، جمالیاتی شعور سے بہرہ مند شاعر، ملی وسماجی مفکر اور زندگی اور اس کے مقاصد ومسائل پر نظر رکھنے والے عظیم دانشور تھے، تو علمی دنیا میں زہد وتقوی، دنیا سے بے رغبتی، جاہ ومرتبہ سے بے نیازی، تواضع وخاکساری، دعوت وعزیمت، جہد مسلسل، ایثار وقربانی، ملت اسلامیہ سے متعلق فکر مندی آپ کی زندگی کی واضح علامات تھیں۔ قناعت، وضع داری، وقار، کبھی بزرگانہ واستاذانہ تعلّی میں تبدیل نہیں ہوتا بلکہ ان کے پاس بیٹھنے والے کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم کسی مغتنم روزگار کے روبرو ہیں۔ ان کی شخصیت میں عجیب دلنوازی تھی۔ بعض لوگ ہوتے ہیں جن کی شخصیت کے کمالات بہت آہستہ آہستہ کھلتے ہیں یا وہ خود اپنے گرانمایہ جوہر کی شہرت پسند نہیں کرتے۔ ان کے یہاں بھی تہ داریاں اور گہرائیاں تھیں، ہر شخص ان سے پوری طرح واقفیت کا دعوی نہیں کرسکتا، لیکن ان کی ذاتی دلکشی ان کے اخلاق وکردار، ہمدردی وغم گساری، اخوت ومحبت، ان کے طرز تخاطب

،ان کی گفتگو سے ان کے کریمانہ انداز سے پھوٹی پڑتی تھی۔ وہ سخت سے سخت مخالف کو بھی تحمل و بردباری سے اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔ ان کی زندگی کے حرکات وسکنات اوران کی اخلاقی خوبیوں کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے والے اوران کے فیض یافتہ مایۂ ناز ومحبوب شاگرد حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی کی شہادت ہے کہ:

’’مولانا کو میں نے ہر رنگ میں دیکھا، اس وقت بھی دیکھا جب مولانا مالی اعتبار سے خوش حال نہ تھے، اوراس وقت بھی دیکھا جب اچھی خاصی خوش حالی آچکی تھی۔ مولانا کی طبیعت کا ایک ہی رنگ رہا، خرچ میں میانہ روی، طبیعت میں کشادگی، اپنی معاشرت میں جفاکشی، مزاج میں استغنا و بے نیازی۔ کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ غربت وتنگدستی ہے، اور خوشحالی کے بعد کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا جس میں اتراہٹ اور فخر وناز کا اثر ہوتا۔ ابتدائی ملاقات میں بسا اوقات ملنے والے کو طبیعت میں تیزی اور تندی کا احساس ہوتا، لیکن وہ فطری ہیبت تھی جو اول نظر میں دیکھنے والوں پر چھا جاتی، مگر جب معاملہ پڑتا اور برتنے کا موقع ملتا تو مولانا بہت نرم، پانی کی طرح خوشگوار، زمین کی طرح متحمل، اور سورج کی طرح فیض رساں ہوتے۔ میں نے مولانا کو غصہ میں بھی دیکھا، اور غصہ سے ٹھنڈے ہوتے بھی دیکھا، بظاہر کسی غلط بات پر غصہ جلد آتا تھا، مگر ٹھنڈا اس سے جلد ہوتا تھا۔ میں نے چالیس بیالیس سال کی رفاقت اور برتاؤ میں کبھی کسی کے ساتھ کینہ رکھتے نہیں پایا، آدمیوں کو پہچانتے خوب تھے، اور ہر ایک کے بارے میں ان کی ایک پختہ رائے ہوتی تھی اور جب کوئی معاملہ کرنا ہوتا تو اسی کی روشنی میں کرتے، مگر سلوک اور برتاؤ سب کے ساتھ حسن اخلاق کا ہوتا، اور دل ہمیشہ صاف رکھتے۔‘‘ (سراپا اعجاز: ص ۴۶۳)

مولانائے محترم چونکہ قلب دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند کا پیکر تھے، اس لیے ملی مسائل کی فکر وتڑپ میں ہمہ وقت مستغرق، ہر فرقے کے خیر خواہ، ہر ایک کے لیے مشفق ومہربان منتسبین ومتعلقین کی خبر گیری، شاگردوں سے بے پناہ محبت والفت اور ان کی قدر دانی، نہ اپنوں سے گلہ نہ غیروں کی مخاصمت سے کوئی شکایت، ہر ایک کے لیے نرمی ومروت ان کا وصف خصوصی تھا۔ خاص طور سے اپنے محبوب شاگرد مجمع الکمالات حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی پر تو انہوں نے اس طرح الطاف وعنایات کی بارش کی ہے، اس طرح والہانہ انداز میں ٹوٹ کر محبت والفت سے

نوازا ہے، اس انداز میں قدر ومنزلت اور احترام واکرام کا معاملہ کیا ہے کہ عہد سلف میں استاذ و شاگرد کے تعلقات مثلاً شیخ الہند وشیخ الاسلام، ابن تیمیہ وابن قیم شبلی وسلیمان کی یاد تازہ ہوگئی۔ بسا اوقات حضرت الاستاذ نے مولانائے ممدوح کی شفقتوں، عنایتوں اور دل وجگر کو قوت وحوصلہ بخشنے والے اخلاق وکردار کے ایسے نمونے دیکھے جس کے سامنے شفقت پدری اور ممتائے مادری ہیچ محسوس ہوئی۔ استاذ کی عظمت وعقیدت اور زندگی کے ہر مرحلے میں جذبۂ اطاعت ووفاداری کے جذبۂ فراواں سے معمور محبوب شاگرد رشید کی والہانہ تحریر میں یقیناً ناظرین عشق ومحبت کی شفاف لہریں محسوس کریں گے:

''وہ میرے استاذ تھے، میرے محسن تھے، مجھ پر انھوں نے اس وقت دست شفقت رکھا تھا جب کہ میں ہر طرف سے دھتکارا گیا تھا۔ انھوں نے بغیر کسی علت کے مجھ پر مہربانی فرمائی اور میں ان کی محبت وشفقت میں جذب ہوکر رہ گیا۔'' (سراپا اعجاز: ص۴۴۴)

زندگی کے وہ سنہرے لمحات جہاں آرزوؤں اور تمناؤں کی ایک دنیا آباد رہتی ہیں، فولادی عزم وحوصلہ جوان اور اہداف کے حصول اور ستاروں کی گذرگاہوں کو عبور کرنے کی امنگیں شباب پر ہوتی ہیں۔ یقین محکم اور جہد مسلسل کے بے پناہ سیل رواں کے آگے جہاں ناکامیوں کے احساسات اور اندیشہ ہائے شکست خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں، اچانک وقت کا تیور بدلتا ہے، حالات نے کروٹ لی اور زمانے کی نگاہوں نے اس طرح اپنے رخ بدلے، اپنوں کی بے گانگی اور غیروں کی مخاصمت کے وہ طوفان بے امان کی موجیں اٹھیں کہ قریب تھا کہ استاذ محترم کی کشتی حیات بکھر جائے اور علم وفضل کا یہ نیر تاباں اپنی روشنی سے عالم کو منور کیے بغیر مایوسیوں کے افق میں ہمیشہ کے لیے روپوش ہوجائے۔ ایسے حوصلہ شکن اور مایوس کن حالات میں زمانہ کی چیرہ دستیوں کے بے رحم تھپیڑوں میں ڈوبتے ہوئے سفینہ کو بشکل ناخدا ممدوح محترم نے سہارا دیا اور زندگی کی آخری سانس تک اس شفقت ومحبت میں کمی نہیں آنے دی۔ ان جاں گسل حالات کی ایک جھلک شاگرد رشید نے اپنے تحریر میں اس انداز سے پیش کی ہے کہ لفظ لفظ سے درد وکرب کے ساتھ استاذ معظم کی بارگاہ میں ممنونیت واحسان مندی کی خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے:

''وہاں چھ ماہ خیریت سے گزرے، چھ ماہ کے بعد ایک طوفان بلاخیز آیا جس نے ماحول کو

الٹ پلٹ دیا۔اس طوفان میں طلبہ کی ایک خاصی جماعت تلپٹ ہوگئی، دارالعلوم سے اخراج ہوا، اور ہندستان کے ہر مدرسہ کا دروازہ ان پر بند کر دیا گیا۔ آندھی کے کوے کی طرح وہ پورے ملک میں چکراتے پھرتے تھے اور نگاہ رحم کو تلاش کرتے مگر ہر طرف نظر گرم سے سابقہ پڑتا تھا ۔ان کی ہمدردی میں کہیں سے کوئی آواز نہ آتی تھی، ہر شخص غصے میں تھا، ہر طرف ملامت کے تیر چل رہے تھے۔ اخبارات طلبہ کے حق میں طنز وطعن کے تیروں سے بھرے آتے تھے، خود جہاں کہیں ان لوگوں کا گزر ہوتا گرم گرم نگاہوں کی حرارت سے سر چکرا جاتا۔لوگ اس نظر سے دیکھتے جیسے یہ لوگ خونی، دہشت گرد، قزاق اور رہزن ہوں۔ واقعی غلطی تو ہوئی تھی اور بڑی غلطی ہوئی تھی، یہ لوگ مدرسوں کے مصلح نہ تھے، طالب علم تھے اور طالب علم کو علم کی طلب سے کام رکھنا چاہئے ،انتظام کی گتھیوں میں خود کو نہیں پھنسانا چاہئے مگر مدرسہ والوں کو اتنا غصہ تھا کہ وہ اعتراف جرم کو بھی سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اپنی غلطی ماننے کے اندر بھی انھیں سازش کی بو آتی تھی۔اس وقت طلبہ کی ہمدردی میں کہیں سے کوئی آواز آئی تو وہ مولانا افضال الحق صاحب کی تھی، کسی اخبار میں ان کا مضمون آیا کہ یہ بچے ہیں، ان سے غلطی ہوسکتی ہے مگر ان پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہئے ،اپنے انتظام کی خامیوں اور کمیوں کا جائزہ لینا چاہئے ۔اسی طرح کا مضمون تھا جو چار دہائیاں گزرنے کے بعد پورا کیوں کر یاد رہے گا۔

دارالعلوم کے اس طوفان بلا خیز کے بعد چھ ماہ تک یہ طلبہ کٹی پتنگ کی طرح چکراتے پھرے، پھر جب رمضان کا مہینہ گزر گیا تو چند طلبہ نے بڑی امیدوں، بڑی توقعات کے ساتھ وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب علیہ الرحمہ کے آستانہ مبارک کا رخ کیا حضرت بہت اخلاق سے ملے، بہت دلجوئی فرمائی، بزرگانہ شان کرم سے ان میں سے زیادہ تر طلبہ کی جامع مسجد امروہہ میں سفارش کردی جس کے وہ سرپرست تھے،اس میں ان کا داخلہ ہوگیا، مگر ان سطور کا لکھنے والا اس سفارش سے محروم رہا۔میرے ساتھیوں نے دس پندرہ دن جامع مسجد امروہہ میں وقت گزارا، وہاں کے مہتمم صاحب سے مجھ غریب کا تذکرہ کیا، انھوں نے ازراہ تلطف میرے ساتھیوں کو اجازت دی کہ اسے بھی بلوالو، اس کا بھی داخلہ ہم کرلیں گے ۔میرے دوستوں میں مولانا طاہر حسین گیاوی خوش ہوکر تشریف لائے اور مجھے لے کر

چلے۔ میں نے دریافت کیا کہ امروہہ میں یہی ایک مدرسہ ہے جہاں دورے تک تعلیم ہوتی ہے یا اور کوئی مدرسہ ہے؟ انھوں نے بتایا کہ محلّہ چلہ میں بھی ایک مدرسہ ہے جس کے شیخ الحدیث وہ مولانا ہیں جنھوں نے اخبارات میں ہم لوگوں کے حق میں کلمہ خیر کہا تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا مجھے اسی مدرسہ میں پہونچا دو۔ مولانا کی عظمت پہلے سے دل و دماغ میں جاگزیں تھی، میں نے اصرار کیا کہ مجھے انھیں کی خدمت میں لے چلو۔ مولانا طاہر حسین صاحب نے مجھے ایک مسجد میں لے جا کر رکشہ سے اتارا، ایک متوسط درجہ کی پرانی مسجد! اس کے شمال وجنوب اور مشرق میں مدرسہ سائز کے چند حجرے! کہنے لگے یہی مدرسہ چلہ ہے، جنوب میں تین کمرے تھے، درمیانی کمرے میں مولانا نظر آئے۔ میں نے اندر جا کر ملاقات کی، مولانا بہت اخلاق سے ملے، مولانا طاہر حسین صاحب نے تعارف کرایا، داخلہ کی درخواست کی۔ مولانا نے بہت خندہ پیشانی اور بشاشت سے باتیں سنیں اور زبانی طور سے درخواست قبول فرمالی، کاغذی کاروائی سے پہلے کھانا منگوایا، صاحبزادۂ محترم حافظ محمد ارشد صاحب کو حکم دیا کہ کھانا کھلاؤ، ظہر کی نماز کے بعد میں پہونچا تھا، عصر کے پہلے تک ساری کاروائی ہوگئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔'' (سراپا اعجاز: ص ۴۵۰)

حضرت مولانا افضال الحق صاحب نے علمی عملی اور فکری وادبی میدان میں بہت ہی سرگرم اور فعال زندگی گزاری ہے، ان کے کارناموں کا کینوس اس قدر وسیع ہے اور اس میں اتنے نقوش ہیں کہ ان سب کا شمار چند اوراق میں کرنا دشوار اور محال ہے۔ پس ان سطور کے لکھنے والے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ مولانائے محترم کے مجموعی خدمات کے دائرے سے صرف نظر کرتے ہوئے قلم کے اس سفر کو اس پہلو کی طرف موڑ دے جو اثر خامہ کی صورت میں مختلف مجلّات ورسالوں کے ادارتی صفحات پر ستاروں کی طرح رخشندہ وتابندہ ہیں۔ مولانا جوہر قاسمی مرحوم جہاں ایک بلند پایہ عالم دین، عبقری معلم وجلیل القدر مصنف ومورخ تھے، وہیں وہ باذوق وکہنہ مشق اور فی البدیہہ شاعر، اردو زبان کے قدآور ادیب، بہترین انشاپرداز، دقیقہ رس نقاد اور نئی سمت ونئی جہت کے صحافی وصحافی ساز بھی تھے۔ انہوں نے تدریسی وتربیتی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات سے عوام وخواص کو روشناس کرانے کے لیے قرطاس وقلم کا راستہ اختیار

کیا اور اپنے علم وفکر کی ہمہ گیریت وعبقریت اور قلم کی فصاحت وبلاغت، تیکھے اسلوب اور بے باکانہ انداز اور دیگر ساحرانہ قوت کی وجہ سے اس راہ کی منزلوں کو عبور کرتے چلے گئے۔ان کا ادبی وتخلیقی دائرہ کس قدر وسیع ہے،اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مختلف علمی وادبی، سیاسی وسماجی تربیتی واصلاحی، تاریخی وتحقیقی موضوعات پر مشتمل آپ کی تخلیقات نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک آپ ہی کی ادارت میں شائع ہونے والے معیاری رسالے ''ترجمان دارالعلوم'' ماہنامہ ''ریاض الجنۃ'' گورینی اور ماہنامہ ''دانشور'' گورکھ پور کے ادارتی صفحات کی زینت بنتی رہیں اور ہر خاص و عام کی توجہات ودلچسپیوں کا مرکز بنتی رہیں۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ہر دور ہر زمانہ میں افکار وخیالات، نظریات و احساسات کی ترسیل وترجمانی کے لیے ذرائع ابلاغ میں قرطاس وقلم کا کردار سب سے اہم اور نمایاں رہا ہے۔تاہم یہ بھی مسلم ہے کہ صفحہ قرطاس پر رونماں ہونے والی تحریروں میں انقلاب آفرینی، کیف آفرینی اور قاری کو حسن تحریر کے سحر میں گرفتار کرنے کی قوت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ان میں علم وفکر کی روشنی اور عصری آگہی کے ساتھ ساتھ ادبی محاسن، تخلیقی آرٹ وفن اور مقصدیت کا شعور وادراک پایا جائے۔اردو ادب کے مشہور نقاد دبستان علی گڑھ کے مایہ ناز فرزند پروفیسر محمد حسن صاحب نے ادبی تخلیقات کے اغراض ومقاصد کے بارے میں کچھ اس انداز سے لکھا ہے:

''ادب کے پارکھوں کو دھیان دینا چاہئے، کیوں کہ ادب کی تخلیق نہ صرف لطف لینے کی خاطر ہوئی اور نہ استاذی دکھانے کے لیے، بلکہ اس کے پیچھے وہ تحریک اور دباؤ نیز تاریخ کے گھماؤ اور سماجی کیفیات بھی ہوتے ہیں جن کے درمیان سے کسی دور کے انسان گزرتے ہیں۔ ادیب کو کس حد تک انسانی زندگی کے باطنی پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے تاریخی اور تہذیبی مطالعہ میں سمجھا جاسکتا ہے..... یہ بھی اندازہ کرسکتے ہیں کہ خود ادبی تبدیلیوں اور اصناف ادب کے عروج و زوال کے پیچھے بھی محض اتفاقات یا صرف ادبی تقاضے کام نہیں کرتے بلکہ ان کے پیچھے کارفرما عوامل ومحرکات کی تلاش کی جائے تو تہذیب اور سماج کے اقتصادی اور معاشی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیوں کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔گویا ادیب کا حقیقی مطالعہ تہذیبی سیاق وسباق ہی

میں ممکن ہے اور اسی پس منظر میں ابھرتے ڈوبتے ادبی رجحانات کے اسباب جانے جاسکتے ہیں اور خود اپنی اور اپنے دور کی بھی بہتر طور پر شناخت کی جاسکتی ہے۔''(تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۲۰۱۳ تحریر پروفیسر سید محمد عقیل رضوی)

خاکسار راقم آثم کا یہ منصب ومرتبہ نہیں ہے کہ مولانائے محترم کے تحریری سرمائے کا تجزیہ ونقد کرے، وہ تو ان کے ابھرتے ہوئے نقش ونگار کی نشان دہی کرنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔ البتہ ان تخلیقات کے بار بار مطالعہ سے طالب علمانہ شعور ومذاق کی جو تطہیر وتہذیب ہوئی ہے اس نے بتایا کہ ہمارے اکابرین دیوبند نے اپنے انداز تربیت سے کیسے کیسے خام پتھروں سے ہیرے جواہرات تراشے اور پھر انسانی قلوب کی تاریکیاں دور کرنے کے لیے انہیں وقف کردیا۔ نیز اس بات کا بھی احساس دلایا کہ مدارس کی ان محدود فضا میں رہ کر جو تمام جدید وسائلِ تحقیق وتدقیق سے تہی مایہ ہوتی ہیں، آپ نے ایسی اثر انگیز اور ذہن قلب کو جلا بخشنے والی اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم کا پتہ بتانے والی نگارشات سے ادبی کتب خانے کو مالا مال کیا جو علمی فکری، معاشرتی اور اخلاقی علوم ومعارف کے ساتھ ساتھ بے ساختگی، برجستگی، لطافت ونفاست، پرشکوہ تعبیرات اور بلیغ استعارات، بے باکانہ طرز ادا وجرأت مندانہ اسلوب اور دیگر ادبی ولسانی صفات زریں سے مزین وآراستہ ہیں۔

حضرت مولانا نے موجودہ دور کی بدعہدیوں، بے رنگیوں، مغربی تہذیب وتمدن کی ظاہری چمک دمک پر شیفتہ ہونے والے اذہان وقلوب اور احساس کمتری کا شکار ہوکر جدیدیت کی طرف ضرر رساں رجحانات ومیلانات کے نتیجے میں جادۂ مستقیم سے انحراف وانقطاع کی زندہ کہانیوں کو اپنے خون جگر کی روشنائی سے لکھا۔ مشرقی اقدار وروایات اور اسلامی تعلیمات سے متصادم تمام حرکت وعمل کی دوٹوک اور بے باکانہ انداز میں نشان دہی کی۔ فلسفۂ مغرب کے اتباع کے زیر اثر انسانی زندگی میں مذہب وقانون کے حوالے سے پیدا ہونے والے خدشات ووساوس، اندیشہ ہائے غمناک، تصورات ونظریات، یقین اور عدم یقین، اوہام پرستی اور حقیقت پسندی کی تمام تفصیلات کو صفحاتِ اداریہ کے سپرد کرکے ایک عالم کو روشناس کرادیا۔ ماڈرنائیزیشن کے جذبات اور اس کے جدید فریم میں قانون اسلامی کو فٹ کرنے کا مغرب سے مستعار شدہ اس عمل کی

ایک ہلکی سی تصویر پر آپ ذرا نظر دوڑاتے چلیں جس کا بھاری بھرکم اور دلوں پر سحر کرنے والا خوبصورت نام ''سیمینار'' دیا گیا ہے۔اور اندازہ کریں کہ مولانا کی فکر کی گہرائی،علم کی وسعت و جامعیت اور نقد وتبصرہ کی نا قابل تردید قوت اور اظہار بیان کی لطافت ونفاست اور ان بہت ساری پرکاریوں کا جن کی وجہ سے تحریریں دوام آشنا ہوجاتی ہیں:

''۱۱رفروری ۲۰۰۰ء سے ۱۴ر فروری تک دارالعلوم بستی میں فقہی سیمنار ہوا،قاضی مجاہدالاسلام نے بلایا تھا۔ہندوستان کے علما،فقہا،مشائخ واساتذہ اور دانشوران محترم کا ملا جلا اجلاس تھا،کچھ بیرونی حضرات بھی تھے۔مولانا باقرحسین صاحب نے پرسکون ماحول میں شاندار انتظام فرمایا تھا۔میں صبح ۱۲ر بجے پہونچا تو اجلاس جاری تھا،ڈائس پر مولانا نعمت اللہ صاحب (دارالعلوم دیوبند) صدارت فرما رہے تھے،قاضی صاحب نگرانی کرر ہے تھے۔ایک کرسی خالی تھی،لوگوں نے میرے بڑھاپے کو وہاں بٹھا دیا۔میں نے دیکھا کہ ہال بھرا ہوا ہے، ہر میز پر اسپیکر کا حسن انتظام ہے،اور اپنی نشست سے علما ومفتیان بحث میں حصہ لے رہیں ہے۔موضوع تھا''ائمہ کا اختلاف''۔اس لیے امام ابوحنیفہ،شافعی، مالک بن انس اور احمد بن حنبل کی امامت فقہ کا دھوم دھام سے جائزہ لیا جارہا تھا کہ ان بزرگوں کو امامت کیسے مل گئی؟اور جب مل گئی تو ان میں جائز وناجائز کے اختلافات کیوں پیدا ہوئے؟ (دانشور گورکھ پور)

سواد اعظم میں رائج فقہ ائمہ اربعہ پر دور حاضر کے روشن خیال علما ودانشور کے تحقیق کے نام پر ائمہ اربعہ کی قطعیت میں تزلزل پیدا کرنے والے بےبصیرت محاکمات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

(۱) ائمہ کو تمام حدیثیں نہیں پہونچی ورنہ اس قدر اختلافات نہ ہوتے اور فتاوی مختلف نہ ہوتے۔

(۲) اگر تمام ایک زمانے میں ہوتے تو اس قدر اختلافات نہ ہوتے (سبحان اللہ سبحان اللہ)

(۳) شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس بات کو واضح طور سے لکھا ہے۔

(۴) اختلاف ائمہ کی وجہ یہ ہے،وجہ یہ ہے،وجہ یہ ہے،تو اناؤنسر نے خاموش کردیا۔

(۵) ایک نوجوان نے اپنے مقالے کا ایک گوشہ تلاوت کیا کہ امام ابو یوسف نے امام مالک سے فرمایا تھا کہ اگر امام ابوحنیفہ کو یہ روایت پہونچی ہوتی تو یہ رائے نہ دیتے ورنہ اپنی رائے واپس

لے لیتے۔''

اس قول پر حضرت مولانا نے اس پیرائے میں طنزیہ ریمارک کیا ہے:

''مگر امام ابو یوسف جیسے قاضی نے اپنی رائے واپس لے کر حنفیت کی اصلاح کر دی تو شکایت کیسی؟ گر تھی شکایت۔'' ایک صاحب نے دوسری طرف سے جواب دیا کہ فلاں روایت کی وجہ سے امام صاحب نے یہ رائے دی تھی تو اناؤنسر نے یہ ارشاد فرما کر بحث روک دی کہ اس پر بحث کیا؟ یہ تو واقعہ ہے کہ ائمہ کو سبھی روایتیں نہیں پہونچیں۔ گویا اناؤنسر پارلیمنٹ کے اسپیکر کا کام کر رہا تھا، رولنگ روک دی گئی۔'' (دانشور گورکھ پور)

ائمہ اربعہ کی صحت مند، بصیرت مند توضیحات وتشریحات اور ان کے گراں قدر اجتہادات پر صدیوں سے ایک مخصوص جماعت کی آزاد ذہنیت حملہ کرتی چلی آرہی ہے، خصوصاً امام ابوحنیفہ کے اجتہادات وتشریحات پر تو پوری قوت سے شب خون مارا گیا ہے اور یہ باور کرانے کی ناکام ونامسعود کوششیں کی گئیں کہ فقہ حنفی کے اکثر قوانین کی بنیاد رائے اور قیاس پر قائم ہے جو شریعت کے احکام سے متصادم ہیں۔ مذکورہ سیمینار میں بحث کا انداز یہ بتاتا ہے کہ مذکورہ پروپیگنڈہ کے تباہ کن اثرات لاشعوری طور پر ان محقق علماء عظام کے ذہنوں پر اثر انداز ہو چکے ہیں اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے سنہرے جذبات اور روشن خیالی کے نام پر ہمارے علما کی طرف سے وہی کچھ منظر عام پر آرہا ہے جس کی تبلیغ واشاعت ایک عرصہ سے غیر مقلدین کی جماعت کرتی چلی آئی ہے۔ یعنی ائمہ اربعہ کے اجتہادات، ان کی تعلیمات وتشریحات پر جانب دارانہ نقد وجرح اور ان کے باطل ہونے کا اثبات۔ حضرت مولانا کی ایمانی فراست نے اس فتنہ کو بروقت محسوس کیا اور پوری جرأت کے ساتھ اس پر قلم اٹھایا اور اس فتنہ کو لوگوں کے سامنے آشکارا کیا:

''چھوٹے چھوٹے منہ اور بڑی بڑی باتوں سے طرح طرح کی گستاخانہ باتیں سنتا رہا کہ ایک ایسا اجلاس بھی دیکھنے کو ملا جس میں ائمہ اربعہ پر محاکمہ بھی ہوا، اور محاسبہ بھی، اور ایک پانچویں کالم کی گنجائش پیدا کی جارہی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا جاگتے ہوئے یہ واقعات دیکھ رہا ہوں...... میں نے (آخر میں) عرض کیا کہ ائمہ اربعہ کا اختلاف دلائل کا نہیں ترجیحات اور موقف کا اختلاف تھا۔ دلائل تو ہر طرف ہیں اور بہت ہیں اور

یہ اختلاف نظری ہے ہمیشہ رہا ہے ہمیشہ رہے گا۔ یہ معمہ جیسی عبارت بول کر میں نے حسب عادت چپکے چپکے دعا کرادی، میرا دل بول رہا تھا کہ اللہ تعالی علمائے کرام کو ہدایت نصیب فرمائے۔ میں نے وہاں ترجیحات کی بات اس وجہ سے عرض کی تھی کہ امت کا متفق علیہ مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے فتاوی منقول ہیں، موقف اور ترجیحات منقول ہیں، دلائل تو کئی سو برس بعد حافظ زیلعی، حافظ ابن حجر، حافظ ابن تیمیہ، علامہ عینی، امام نووی جیسے محدثین نے اپنے اپنے ائمہ کے مسلک کو ثابت کرنے کے لیے مہیا کیے ہیں، مگر کسی محدث نے امام کا موقف نہیں بدلا۔ کیوں کہ موقف بدلنے کے لیے امام ابوحنیفہ، ابو یوسف، شافعی اور مالک ہونا چاہیے تھا اور وہ گذر چکے تھے۔ مثال کے طور امام ابوحنیفہ کا موقف تھا کہ نماز میں حضرت ابن مسعود کی روایت کے مطابق رفع یدین متروک ہوگا، اس موقف کو امام شافعی نے قرن ثانی کے آخر میں بدل دیا کہ حضرت ابن عمر کی روایت کے مطابق تین جگہ رفع یدین اب بھی کرنا چاہیے۔ یہ ائمہ کے موقف اپنی اپنی جگہ آج بھی ہیں اور جو محدث یا فقیہ بھی ان ہزاروں برسوں میں آیا، اس نے اپنے اپنے اماموں کے موقف کے لیے احادیث، تفقہ یا آثار سے اس کو ثابت یا راجح کیا تو شراح کا اختلاف دلائل کا اختلاف ہے، ائمہ کا اختلاف موقف اور ترجیحات کا اختلاف ہے۔'' (دانشور گورکھ پور)

مذکورہ اقتباس سے جہاں مولانائے محترم کی ایمانی صلابت، فکری اصابت، ذہنی فراست اور علوم اسلامی کی گہرائی و گیرائی کا پتہ چلتا ہے، وہیں زبان و بیان میں سلاست، صحتِ ادا کی نزاکت اور الفاظ وحروف کی بندش بھی سطر سطر میں نمایاں ہیں۔ ملک کے طول وعرض میں انتہائی تزک واحتشام سے منعقد ہونے والے مروجہ سیمینار میں بحث وتحقیق کا جو انداز اور طریقہ کار ہوتا ہے، حضرت مولانا کی ایمانی حمیت وصلابت اس کو قطعاً قبول نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے کہ ایسی مجلسوں میں عموماً ریسرچ کی آڑ میں فقہی قوانین پر عمل جراحی کا دانستہ یا نادانستہ تجربہ کیا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ سواد اعظم کی معتمد ومعتبر شخصیات بھی نقد کے تیشے سے محفوظ نہیں رہ پاتیں، جیسا کہ مولانا نے اپنے مخصوص ظریفانہ اسلوب میں اس کی بھی تصویر کشی کی ہے:

''مقررین نے اپنی اپنی رائیں بتانی شروع کیں تو اناؤنسر کو تعجب ہوا اور اس نے شکایت

کے لہجہ میں فرمایا کہ مقالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلاق نہ ماننے والوں کی اکثریت ہے مگر ہاؤس کا رنگ یہ ہے کہ طلاق ماننے والوں کی اکثریت ہے۔ایوانوں میں دیکھا ہے کہ ہاتھ اٹھوا کر رائے شماری کرائی جاتی ہے مگر یہاں منہ زبانی رائے شماری ہورہی تھی۔میں سمجھتا تھا کہ دلیل کے بغیر رائے کچھ نہیں ہوتی مگر فقہی اجلاس نے بتایا کہ اس کے شرکاء تمام کہ تمام وہ پہونچے ہوئے بزرگ ہیں جن کی رائے اصل ہے،دلائل تو بہت ہیں۔اس لیے مولانا وحیدی سے میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو وہ خاموش رہ گئے اور احناف وشوافع رائے کے لیے بدنام ہیں،یہاں ہر سائز کے لوگ اصحاب الرائے تھے۔''(دانشور گورکھ پور)

جدید نہج پر منعقد ہونے والے مذکورہ فقہی اجلاس کے عام اذہان وقلوب کے علاوہ خواص پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اور کس طرح کے نتائج رونما ہوتے ہیں؟ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ طلاق سکران کے وقوع اور عدم وقوع پر اختلاف رائے کے باعث مجلس فقیہ بظاہر کسی نتیجے پر پہونچنے سے قاصر رہی،باوجود اس کے دوسرے روز کا آفتاب اخباروں میں نیا پیغام لایا کہ طلاق سکران میں بدلتے حالات کے پیش نظر زوجین کے درمیان تفریق کا مفہوم کالعدم ہے۔لہٰذا نشہ کی حالت میں طلاق واقع نہ ہوگی۔مولانائے مرحوم کی دوررس نگاہیں روشن خیالی اور وسعت فکر ونظر کے پردے میں مستور اباحت پسندی کے اس فتنہ کو دیکھ رہی تھیں۔پس آپ نے ایمانی غیرت وحمیت کے زیر اثر بالکل دوٹوک انداز میں مذکورہ اجلاس کے تعجب خیز وتباہ کن نتائج سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کا آخری پیراگراف بھی اس مقالے کا حصہ بنادوں تاکہ واردات قلب کے بیان اور زبان کی برجستگی اور ظریفانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا کی علوم وفنون پر دقیقہ رسی اور ژرف نگاہی بھی نکھر کر سامنے آجائے:

''لیکن سہارا،اردو ٹائمز بمبئی جیسے اخبارات میں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوگئی کہ نشہ کی حالت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔کھلے بند یہ اعلان کیا جارہا ہے اور لوگ سر پیٹ رہے ہیں کہ اسلام میں یہ کیا طوفان آگیا ہے۔دراصل ہیجان اسلام میں نہیں متجددین اسلام میں آگیا ہے۔اس لیے وہ علما وفقہا ومشائخ سے رائے لے کر پھر اس میں اپنی رائے شامل کرکے ان نام نہاد مسلمانوں کی رعایت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جو اسلام کا نیا ایڈیشن چھاپنے کے منتظر ہیں۔مجھے

سخت حیرت ہے کہ اباحت پسندی کس قدر منہ زور ہوگئی ہے کہ ہم جیسے بوڑھوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جارہی ہے اور ہم پتہ نہیں پاتے کہ اسلام، اس کے اصولوں کا، نصوص کا اور روایات کا ناس مار کر ہم کہاں جارہے ہیں۔

اخبار کی سرخی پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ اناؤنسر نے برہمی کے ساتھ کیوں کہا تھا کہ یہاں وقوع طلاق کی کثرت معلوم ہوتی حالانکہ مقالات کے خلاصہ میں اس کے برعکس تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اس تضاد کا جواب پوشیدہ ہے کہ فقہی سیمینار کے دفتر نے یہ طے کر دیا تھا کہ طلاق سکران واقع نہیں مانی جائے گی، اس لیے اجلاس کے پرواہ کیے بغیر خبر نامہ مرتب کر کے اخبارات کو بھیج دیا گیا جیسا کہ سیاسی پارٹیاں کرتی ہیں یا مناظرہ باز لوگ کرتے ہیں۔ تو فقہی سیمینار والے اس چابک دستی سے کیوں پیچھے رہیں؟ ایسا ہی ڈرامہ حیدرآباد کے اجلاس میں کیا گیا تھا، بلکہ انشورنس کے لیے سود اور جوا دونوں کو مباح قرار دیا گیا تھا اور اس میں ہم لوگوں کا نام شامل کر لیا گیا تھا، اور یہی ڈرامہ بستی میں کیا گیا اور دانستہ کیا گیا کہ طے کچھ ہوا اور اعلان وہ ہوا جس کے لیے اجلاس بلایا گیا تھا۔ اس لیے سارا زمانہ اعلان سن کر ششدر رہ گیا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جس کے لیے مفتی دارالعلوم فقیہ امت مولانا محمود حسن صاحب گنگوہی ان سیمیناروں سے دور رہنے کی تلقین فرماتے تھے اور محدث عصر مولانا حبیب الرحمان اعظمی صاحب نے ایسے ہی سیمیناروں کے لیے فرمایا تھا کہ ''ایسے سیمینار فقہ حنفی کا حلیہ بگاڑ دیں گے۔'' آج میں شہادت دے سکتا ہوں کہ فقہ حنفی کا نہیں خود اسلام کا حلیہ بگڑ رہا ہے۔ اب شرابی روز طلاق دے گا اور روز اپنی حرام بیوی کو حلال سمجھ کر اس سے حلال زنا کرے گا اور ان سیمیناروں کو دعا دے گا جو قرب قیامت کی علامت ہیں اور اپنی اباحیت پسندی میں کہیں نہ کہیں سے کوئی ترکیب تلاش کر کے اس پر اصولوں کو منطبق کر کے تفقہ کا بیڑا اغرق کر رہے ہیں۔ برادرم قاضی مجاہد الاسلام سے دست بستہ عرض ہے کہ:

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

مسلمانان ہند کے علمی فکری ثقافتی اور تہذیبی دانش گاہوں میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو

اہم مقام حاصل ہے۔ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے سرسید اور ان کے رفقا نے ان تھک جدو جہد اور فولادی عزم و ہمت کے نتیجے میں اس درسگاہ کو ترقیاتی منزلوں کی انتہا پر پہونچا دیا۔ انہوں نے مسلسل قربانیوں اور لاثانی مشقتوں کے نتیجے میں قائم ہونے والے مدرسۃ العلوم کو محمڈن اینگلو اورینٹیل کالج کے درجہ تک پہونچایا اور ۱۹۲۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں طویل جد وجہد کے بعد اس کالج کو یونی ورسٹی کے درجہ تک پہونچایا۔ برطانوی حکومت نے اس شرط پر یونی ورسٹی ایکٹ دینے کی ہامی بھری کہ مسلمان اس کے عوض میں ۲۰/ لاکھ روپیہ کی خطیر رقم جو اس زمانہ میں اربوں روپیہ تک پہونچتی ہے، حکومت کو بطور فیس ادا کرے، جس کے لیے مسلمانوں نے مسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی قائم کرکے تیس لاکھ روپیہ جمع کیا اور شرط مذکور کے مطابق حکومت کو ادا کیا۔ لیکن تعصب وفرقہ واریت کی داستان کا مضحکہ خیز اور الم ناک باب یہ بھی ہے کہ آزادی کے بعد برادران وطن کی زہر آلود نگاہوں میں دینی واسلامی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند کی طرح مسلمانوں کے عصری وثقافتی علوم کا ادارہ کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا اور مکمل منصوبہ بندی کے تحت حکومتی سطح پر اس ادارے کے مخصوص قومی شناخت واختیارات کو سلب کرنے کی مذموم کوشش شروع ہوگئیں۔ اس کے اقلیتی کردار پر حملہ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پارلیمنٹ نے ۱۹۸۱ء میں ایک ایکٹ منظور کیا تھا کہ مسلم یونی ورسٹی مسلم اقلیت کے سرمایہ سے قائم ہوئی ہے اور یہ اول روز سے ہی ایک اقلیتی ادارے کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ مسلم یونی ورسٹی کا مقصد آئین کی دفعات ۳۰۔ ۲۹ کے بموجب ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی وثقافتی ترقی ہے۔ اس ایکٹ نے اس بنیاد کو ختم کردیا جس پر سپریم کورٹ کا ۱۹۶۷ء کا فیصلہ قائم تھا جس کو عزیز پاشا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

اس ادارے کے آغاز سے ہی جدید علوم کے ساتھ مسلم طلبہ کے لیے دینیات کی تعلیم لازمی تھی جسے ایک ترمیمی ایکٹ کے تحت ختم کردیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں جب عبدالکریم چھاگلہ وزیر تعلیم اور اندرا گاندھی وزیر اعظم تھیں، ایک پارلیمانی ایکٹ کے ذریعہ اس کے اقلیتی کردار پر شب خون مارا گیا، اس ایکٹ کے خلاف سپریم کورٹ میں کیس لڑا گیا جس میں یونی ورسٹی موقف کو شکست ہوئی اور اندرا حکومت کا موقف مضبوط ہوا، جس سے ملک کے مسلم طبقہ میں بے انتہا بے

چینی پیدا ہوئی اور کانگریس سے مسلمان برگشتہ ہونے لگے۔ جب کانگریس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے ۱۹۸۱ء میں مذکورہ ترمیمی ایکٹ منظور کرایا۔''(اردو ٹائمز ممبئی سنڈے میگزین تحریر ڈاکٹر خالد اختر علیگ)

واضح رہے کہ یونی ورسٹی کے خلاف یہ تمام منصوبہ بندیاں اور سلب اختیارات کی منظّم پالیسیاں اس ملک میں ظہور پذیر ہوتی ہیں جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا علم بردار ہے جس کا سیکولر آئین اقلیتوں کے مفادات کا ان الفاظ میں تحفظ کا اعلان کرتا ہے:

''دفعہ ۲۹۔ بھارت کے علاقہ میں یا اس کے کسی بھی حصہ میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔(۲) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارے میں جس کو مملکت چلاتی ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو، داخلے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان یا اس میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔''

دفعہ ۳۰۔ جو اقلیتوں کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظامات کرنے کے حقوق کی ضمانت پر مشتمل ہے کی پہلی شق ہی جمہوری تعداد کے تحفظ سے شروع ہوتی ہے۔(۱) تمام اقلیتوں کو خواہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی، اپنی پسند کی تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کے انتظامات کرنے کا انہیں حق حاصل ہوگا۔(۲) مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے خواہ وہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی بنا۔''(بھارت کا آئین:۵۳۔ یکم جولائی ۲۱۰۳۔ ترمیم شدہ بحوالہ اردو ٹائمز سنڈے میگزین۔ تحریر ندیم احمد انصاری ممبئی)

سطور بالا میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ۱۹۵۱ء میں یونی ورسٹی میں جاری جدید علوم کے ساتھ دینیات کی لازمی تعلیم کو ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے اس دستور کو کالعدم قرار دینے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ یونی ورسٹی کی فضا میں اسلامی تمدن کا کوئی اثر باقی رہے، نہ ہی یہاں کے طالب علموں کے قلوب واذہان اسلامی علوم سے آراستہ ہو پائیں۔ حضرت مولانا کی ایمانی فراست نے بڑی شدت سے اس سازش کو محسوس کیا اور ۱۹۸۱ء میں یونی ورسٹی کے اقلیتی کردار کے بحال ہونے کے بعد پورے وثوق اور مکمل اعتماد کے ساتھ بحیثیت رکن مذکورہ تقاضے کو قائدین ادارہ کے سامنے

رکھا اور اپنے مخصوص اظہار بیان کے ذریعہ اس طرح اسلامی تربیت کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ سطر سطر سے آپ کی بالغ نظری اور عصری آگہی محسوس ہوتی ہے:

''ہندوستان کی سو سے زیادہ یونی ورسٹیوں میں صرف ایک ہی مسلم یونی ورسٹی ہے اور اس یونی ورسٹی کو قانون نے اقلیتی کردار عطا کیا ہے جو دراصل دستور ہند کے بنیادی حقوق کا عملی اقدام ہے۔اس لیے مسلم یونی ورسٹی کی ذمہ داری ہے کہ ممبران وغیر ممبران کے مشورے سے یہ طے کرے کہ (الف) اقلیتی کردار کے تقاضے کیا کیا ہیں؟ (ب) اقلیتی کردار کن کن ذرائع سے حاصل ہوسکتا ہے؟ (ج) اقلیتی کردار اگر اسلامی کردار ہے تو یونی ورسٹی کے ترقی پذیر ماحول میں وہ کہاں تک مؤثر ہوگا؟ اور کس طرح؟ (د) اسلامی کردار طلبہ، اساتذہ، ملازمین اور ماحول کے اندر سے کس کس طرح ابھارا جا سکتا ہے؟ اگر ذمہ داران یونی ورسٹی اسے موضوع فکر بنا کر کام کریں گے تو طریقہ کار طے کرتے وقت ان کے سامنے بہت سی چیزیں آسکتی ہیں مثلاً ہندوستان کی یونی ورسٹی قانون، طب، سائنس، پالیٹکس، تاریخ، ادب اور دوسرے علوم وفنون میں نہ صرف ڈگریاں دیتی ہے بلکہ ریسرچ اسکالر بھی پیدا کرتی ہے۔ان میں بعض یونی ورسٹیاں بعض علوم وفنون کے لیے ممتاز بھی ہیں۔سوال یہ ہے کہ مسلم یونی ورسٹی کیا ہندوستان کو مسلمان ڈاکٹر، مسلمان وکیل، مسلمان لیڈر، مسلمان انجینئر اور مسلمان ادیب عنایت کرسکتی ہے؟ جن کی دیانت، جن کی امانت، جن کا اخلاق، جن کی خدمت اور للّٰہیت کی شہادت دی جاسکتی ہو۔میرا مطلب یہ ہے کہ یہ مسلم یونی ورسٹی کیا مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر فریدی، ڈاکٹر ذاکر حسین، رفیع احمد قدوائی یا قاضی عدیل عباسی جیسی بے داغ شخصیتیں اپنی آغوش میں تربیت دے سکتی ہے۔اگر دے سکتی ہے تو کس طرح؟ یہ صحیح ہے کہ ڈگری کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں جن علوم وفنون کی تعلیم ہوتی ہے ان کی تربیت بھی ہوتی ہے۔اس لیے اس کے ماہر اور نمونے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح اگر ہماری یونی ورسٹی دیانت، ایمان، اخلاق اور خدمت کا کوئی کورس تیار کرے اور اس کی تربیت کا ایک خاص ماحول بنائے تو یہاں سے اسلام کے ترجمان، خدمت کے نمونے، اخلاق کے سراپا اور امانت کے لیے قابل بھروسہ افراد پیدا کرسکتی ہے۔ لاریب کہ یہ کام کسی کالج یا یونی ورسٹی میں نہیں ہورہا ہے، یہ شبہہ کہ اس دور میں اس طرح کی

تربیت دینا ایک مشکل کام ہے اور یقیناً ایسے کسی تخیل کے لیے کورس مرتب کرنا اور عملی تربیت کا نظام بنانا ایک سخت مرحلہ ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اسی ہندوستان میں ایسے ادارے موجود ہیں جو اسلام کے نمونے، اخلاق کے سانچے، دیانت کے مجسمے ڈھالا کرتے ہیں۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی ایک نیا تجربہ کر کے اقلیتی کردار کا حق نہ ادا کریں۔ خصوصاً اس لیے کہ ہمارے یہاں دینیات کی ایک مستقل فیکلٹی ہے جس میں برائے نام کچھ کام ہو رہا ہے۔ اگر اس جمود کو توڑ کے اسے متحرک کر دیا جائے اور اصول و دیانت کے ماہرین فن کو دعوت دے کر کوئی پروگرام بنا کر ایک محدود دائرے میں اس کا تجربہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ایک قابل اعتماد راستہ پیدا ہو جائے، جس طرح سرسید مرحوم نے اپنے کالج میں دینیات کا پیوند لگا کر اس کو اسلامی تصورات عطا کیے تھے اگر آج ہم پھر تجربہ کر کے عملی زندگی میں اس کو داخل کرنے کی کوشش کریں تو وہ قرض ادا کر سکیں گے جو سرسید مرحوم کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔'' (ماہنامہ ریاض الجنۃ: محرم، صفر ۱۴۰۹ھ)

درج بالا اقتباس میں قوم مسلم کے اہم تعلیمی اثاثے کے متعلق کرب و اضطراب اور فکر و تڑپ نیز انقلابی نظریے کی گونج واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے لیکن گونج میں بھی لہجے کا دھیما پن، اسلوب کی غنائیت اور اظہار کی شائستگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحریر کے یہ ادبی نمونے سمندر کے جھاگ کی طرح جذبات کو برانگیختہ تو نہیں کرتے مگر ہمارے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرتے ہیں اور بڑے سلیقے سے قاری کے عزم، جوش اور حوصلے کو ایک خاص نہج پر جو ارتقائی راہ ہموار کرنے کا ضامن ہے، عمل پیرا ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اداریہ نویس کا یہ لائحہ عمل جو انسان کے حقیقی مقصد کی طرف مشیر ہے محض لفظوں کے خارجی آہنگ اور حروف کی صف بندی پر قائم نہیں ہے، جیسا کہ عام ادیبوں یا کالم نویسوں کی تحریروں میں نظر آتا ہے، بلکہ یہ نظریہ روح و وجدان کے خلوص اور علمی و فنی وسعت، عمیق مطالعہ اور وسیع تجربات کی مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے تمام مصورانہ ترکیبی و تخلیقی عمل میں احساس کی تابنا کی، فنی لوازمات کے ساتھ حرف حرف سے عیاں ہے۔ اقلیتی اور مسلم تہذیب و تمدن کی علامت کے طور پر دیکھی جانے والی مذکورہ دانش گاہ کی نظریاتی فضا کس رخ پر ہے اور اسلامی ثقافت سے کتنی ہم آہنگ

ہے؟ ذیل کے اقتباس سے آسانی سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اداریہ نویس کے اس سچے اور پرخلوص احساس کا بھی جسے معتبر تخلیقیت کا پیراہن دے کر جاوداں کر دیا گیا ہے:

''ہر یونی ورسٹی مختلف موضوعات پر اسکالرشپ جاری کرتی ہے اور ذہین افراد سے امید کرتی ہے کہ وہ اس موضوع کے تمام گوشوں کو سامنے رکھ کر مجتہدانہ شان سے بحث کریں گے اور پیچیدگیوں کا حل نکالیں گے۔ اس سلسلے میں کسی بھی یونی ورسٹی میں آپ اقتصادیات، معاشیات وغیرہ کا جائزہ لیں تو پروفیسر صاحبان یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ اسلام ایک عبادتی مذہب ہے، ان علوم سے اس کو کیا کام؟ اور ایسا اس لیے انہیں کہنا پڑتا ہے کہ ان کے علم وفن کے دنیا یورپ اور مستشرقین تک محدود ہے۔ وہ اسلام سے، اس کے اصولوں سے اور اس کے نظام حکومت سے براہ راست واقف نہیں۔ اس لیے اگر مسلم یونی ورسٹی ایسا تجربہ کرے کہ مشترکہ طور پر چند آدمیوں کو ایک موضوع دے، ان میں کوئی گریجویٹ ہوتو دوسرا فاضل دینیات ہو، دونوں مل کر کوئی مقالہ تیار کریں اور اس سلسلے میں ہندوستان کے علمی مراکز سے مدد لے کر اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کریں تو دنیا کو نظر آسکتا ہے کہ جس اسلام نے مشرق سے مغرب تک ہزار برس تک قانونی حکمرانی کی ہے، اصولی نظام چلایا ہے، اس کا دامن کسی علم وفن سے خالی نہیں۔ یہ کام اگر مسلم یونی ورسٹی شروع کرے تو بہت ممکن ہے کہ کشمیر یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اور دوسری یونی ورسٹیاں بھی اسلام کے قانونی خزانے تک پہونچنے کی کوشش کریں۔ بہرصورت اقلیتی کردار کا حق ادا کرنے کے لیے اگر مسلم یونی ورسٹی سنجیدہ ہے تو اسے موضوع بنا کر بہت سے میدان سر کرسکتی ہے اور دنیا کی رہنمائی کرسکتی ہے۔ مسلم یونی ورسٹی کا تعمیری پروگرام چونکہ کورٹ کے سامنے زیر بحث ہے، اس لیے اس کے اقلیتی کردار سے دلچسپی لینے والے حضرات اس سلسلے میں اگر مشورہ کے لیے ہماری خدمات حاصل کرنا چاہیں تو ''ریاض'' کے صفحات حاضر ہیں۔''

(حوالہ بالا: ص۶۔ تحریر مولانا جوہر قاسمی، ممبر مسلم یونی ورسٹی کورٹ)

آزادی کے بعد ہندوستان کے منظرنامے کی تصویرکشی کرتے ہوئے ایک عظیم نثر نگار حمید سہروردی نے لکھا ہے:

''آزادی کے بعد ملک میں جس طرح کی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہ مسرت زا بھی تھیں اور

الم انگیز بھی۔ مسرت اس لیے کہ ہندوستان کو غلامی سے نجات حاصل ہوگئی، ہر باشعور انسان یہ سوچ کر کے کہ آزادی ملنے کے بعد سیاسی غلامی سے نجات حاصل ہوگی اور غریبی اور ناداری، معاشی اعتبار سے محتاجی اور بے بسی سے چھٹکارا مل جائے گا، ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جس میں ہر ایک کو مساوی حقوق اور انصاف ملے گا۔ یہی وہ خواب تھے جس کے لیے قوم کے ہمدرد خلوص دل سے آزادی کی جدوجہد کر رہے تھے۔ عوام اور خواص ملک کے لیے جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھے مگر یہ سبھی خواب چکنا چور ہو کر رہ گئے، مایوسی اور بددلی نے پر امید زندگی کو شکست خوردگی میں بدل دیا۔

الم انگیز اس لیے کہ ایک ملک کے دو ٹکڑے ہوئے، آزادی اور تقسیم ملک نے کئی نا قابل اعتبار منظر دکھائے۔ فرقہ وارانہ فسادات، مذہبی عصبیت اور فرقہ پرستی، بربریت جیسے عناصر کام کر رہے تھے۔ قتل وخون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور بے شمار خاندان خانما برباد اور لٹے ہوئے ایک ملک سے دوسرے ملک کو ہجرت کر رہے تھے۔ جن آنکھوں نے وہ تمام منظر دیکھے وہ بدحواس پژمردہ اور زندگی سے بیزار ہو چکے تھے۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جو زوال معاشرہ کو رقم کرتی ہے، ہر امید فریب، ہر دل مردہ، ہر سہارا بے معنی ہو کر رہ گیا، ہر قدر میں فریب کاری اور ریا کاری نظر آنے لگی اور ہر ادارہ پر سے ایمان اٹھ گیا۔'' (سہ ماہی فکر وتحقیق جنوری تا مارچ ۲۰۱۵ء ص ۵۵)

وقت کی گردش اور حالات کی جانکاہ سنگینی سے ایک ایسا صاحب قلم جس کے یہاں انسانیت، ضمیر، اخلاق کے علاوہ ادب وانشا کی قدریں بھی آفاقی اور لامحدود تھیں، جس کے قلب میں افکار واحساسات کا ایک دریا رواں دواں ہو، جس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز اخوت، محبت، ہمدردی و بھائی چارگی اور انسانیت نوازی کی قدیم اسلامی تاریخ وروایات سے مملو ہو، وہ اس طرح کے خون چکاں مناظر سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے؟ چنانچہ مولانائے محترم نے آزادی کے بعد پیدا ہونے والے حالات، انسانیت نوازی کے بجائے فرقہ پرستی، خوابوں کی شکست و ریخت روزمرہ کے فسادات، فحاشی و بدعنوانی، لوٹ کھسوٹ اور سرمایہ داری کے استحکام پر مزدوروں کے استحصال پر مشتمل دلخراش مناظر کو بے پناہ تخلیقیت کی قوت کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا:

’’آج ہمارے مسائل الجھے پڑے ہیں، سیاسی بھی اور سماجی اور تعلیمی بھی۔ سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہم اول درجہ کے شہری ہیں یا دوسرے درجہ کے یا تیسرے درجہ کے؟ جس کی یہاں مال وآبرو کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ متحدہ اقوام کہتا ہے اور دستور ہند اعلان کرتا ہے کہ ہم مسلمان بھی یہاں اول درجہ کے شہری ہیں۔ اس لیے گاندھی کی سرزمین ہمیں بتائے کہ ہم کس درجہ کے شہری ہیں؟ اور ہم نے اپنی شہریت واہمیت کو حاصل کرنے کے لیے گاندھی جی سے پہلے اور ان کے آنے کے بعد جلاوطنی، پھانسی اور جیل کی کون سی مصیبتیں نہیں جھیلی ہیں؟ یہ سب کیا اسی دن کے لیے تھا کہ ہماری نسلیں اپنے وطن میں غلاموں کی زندگی بسر کریں گی؟ اقلیتیں اور چھوٹی قومیں اکثریت اور بڑی ذات والوں کے رحم وکرم پر زندگی گذاریں گی؟ اگر ایسا نہیں تھا تو ہمیں بتایا جائے کہ ہم کس طرح باعزت زندگی تک پہونچ سکیں؟ ہم مسلمانوں کا دوسرا سب سے بڑا مسئلہ انصاف اور امتیاز کا ہے کہ دستور ہند کی واضح ہدایات اور سپریم کورٹ کے اہم فیصلوں کے باوجود اقلیتوں سے انصاف نہیں کیا گیا۔ ہم قتل کیے گئے تو قاتلوں کو پھانسی نہیں دی گئی نہ پکڑا گیا۔ ہم لوٹے گئے تو چوروں ڈاکوؤں اور غارت گروں کو گولی نہیں ماری گئی بلکہ ان کی سرپرستی کی گئی، اور اردو زبان کو صرف اس الزام میں جلاوطن کیا گیا کہ اس سے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ہمارے بچوں کو تعلیم کی پسماندگی کی آخری سطح تک اس وجہ سے پہونچایا دیا کہ وہ اقلیت ہیں، اکثریت کی برابری نہیں کر سکتے۔ اس لیے مجھے عرض کرنے دیجیے کہ پچھلے پچاس برسوں کی تاریخ مسلمانوں سے بے انصافی اور امتیاز ہی کی تاریخ ہے۔ ورنہ ۱۹۴۹ء میں بابری مسجد کا جو مقدمہ درج ہوا تھا وہ ۹۸ء تک ضرور فیصل ہو گیا ہوتا مگر اس لیے نہیں ہوا اور نہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کا مسئلہ ہے، جن کو الجھا کر رکھنا کانگریس کو بھی پسند ہے، بھاجپا کو بھی اور متحدہ محاذ کو بھی۔ اسی طرح میسا کا کالا قانون اور ٹاڈا کا جنگلی قانون اس لیے بنایا اور چلایا گیا کہ ہمارے نوجوانوں کو اور ہماری نسلوں کو غلامی کا مزہ چکھایا جائے ورنہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ٹاڈا کے جنگلی قانون کے ختم کیے جانے کے باوجود اس کے پکڑے ہوئے لوگ بلا مقدمہ چلائے جیل کی کوٹھریوں میں سڑائے جائیں اور احتجاج کے باوجود گورنمنٹ بہری اور گونگی ہوگئی ہے۔ آپ انہیں عدالت میں لاکر پھانسی دیدیں کالے پانی بھیج دیں تو ہمیں کوئی

شکایت نہیں مگر بلا مقدمہ چلائے کسی شہری کو حقوق شہریت سے محروم رکھنا اگر جرم ہے تو مسلمانوں کے ساتھ یہ اس وجہ سے جائز ہے کہ حکمراں طبقے کو انہیں دبا کر رکھنے میں لطف آتا ہے۔'' (دانشور گورکھ پور ٦)

نفرت وعصبیت کے سوداگروں کے پالیسی ساز ذہنوں نے اسلامی تمدن وثقافت کے بڑھتے ہوئے اثرات کو معاشرے کی ہر سطح پر دیکھا تو اس کے ارتقا کی بنیادیں تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہونچے کہ سماجی ومعاشی ابتری وپسماندگی کے باوجود مسلم معاشرہ میں عزم وحوصلہ بخشنے والے اسپرٹ اور اسلامی ثقافت سے وابستگی پیدا کرنے والی روشنی ان اداروں سے حاصل ہوتی ہے جو عام مسلمانوں کی حقیر معاونت سے اپنے اہداف کے حصول میں ہمہ وقت سرگرم عمل ہیں۔ مذکورہ نتیجے کی دشمنان اسلام نے بازیافت کیا کی کہ ان کی تمام سازشوں اور حربوں کا رخ مدارس اسلامیہ کی طرف مڑ گیا، معاندانہ رویے کی اس سنگلاخی نے انسان اور فطرت کے درمیان نہ صرف دوری اور اجنبیت پیدا کی بلکہ ان کے درمیان تعصّبات کی ایک وسیع خلیج حائل ہوگئی۔ مولانائے محترم نے اس کرب ناک صورت حال کو شدتِ احساس کے ساتھ نثری پیکر میں ڈھالا ہے۔ اعتدال وتوازن ناآشنا سماج کی بے حسی پر جہاں آپ کے قلم نے سوالیہ نشان قائم کیا ہے وہیں قدم قدم پر اس نے صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے۔ ذیل کا یہ اقتباس دیکھئے جس میں مدارس اسلامیہ کے خلاف پروپیگنڈے کے وسیع منظر نامے میں اخلاقی قدروں کی پامالی کے ساتھ ایک حساس صاحب قلم کا درد وکرب پوری شدت کے ساتھ رقم ہوا ہے:

''ہندی کے سہارا اخبار نے یکم جنوری کو پورے صفحے پر دارالعلوم دیوبند کی شاندار تصویر شائع کی ہے اور نئے سال کے تحفے کے طور پر مسلمانوں کو عنایت کی ہے۔ پھر اس میں نائب مہتمم کا انٹریو، دارالعلوم کے نصاب پر تبصرہ........اس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرنے کے بعد ٹیپ کا بند یہ ہے کہ ''دارالعلوم سے طالبان پیدا ہوتے ہیں، کٹر پنتھی اور کور دماغ لوگ جنم لیتے ہیں۔'' اس طرح اس نے فالودہ میں زہر ملا دیا ہے، اس لیے اسے ہضم کرنا ہمارے لیے مشکل ہے اور حکومت کے لیے آسان ہے تاکہ پوٹو جیسے زہریلے سانپ جنم دے سکے۔ یہ مضمون اتنا جارحانہ، مسلم کش، مدارس دشمن اور معلوماتی ہے کہ اسے چند ہفتوں میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اور اس جیسے مدارس اسلامیہ نے اگر طالبان اور ان کے لیڈر ملا عمر کو پیدا کیا ہے تو ملا برہان الدین اور ملا مسعود کو بھی پیدا کیا ہے جو شمالی اتحاد کے کمانڈر تھے، جن کو استعمال کر کے صدر بش، جنرل مشرف اور ایڈوانی سرکار نے طالبان اور ان کے ملک کی نسل کشی کر دی ہے، تہس نہس بھی کر دیا ہے۔ اس لیے آپ کو شکر گزار ہونا چاہیے کہ مدارس اسلامیہ نے اگر زہر پیدا کیا تھا تو تریاق بھی وہیں سے مہیا کیا گیا۔ پھر نسل کشی کرنے والے طالبان سے آپ کو کیا شکایت ہے؟ وہ تو عالمی طور سے بدنصیب تھے اس لیے عالمی دہشت گرد کے پالے پڑ گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو جن لوگوں نے ۳۰۔۸ سے ۳۰۔۱۰ بجے تک امریکہ کی آبرو لوٹی تھی اور ۱۹ر جانبازوں کو مسلم ممالک سے مہیا کر کے ۲ر گھنٹے تک ایک ہی نشانے پر انہیں استعمال کیا تھا اور دو ہزار یہودیوں کو اس بربادی سے بچا لیا تھا، پھر ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء سے ۳۰ر جنوری ۲۰۰۲ء تک ساری دنیا کے خفیہ محکمے ان میں سے کسی کا پتہ نہیں لگا سکے ہیں، کیوں کہ وہ یہودی دہشت گرد ظالم اور خونخوار یہودی امریکہ میں بیٹھ کر یہ کاروائیاں کرتے رہے تھے۔ انہوں نے کس دارالعلوم سے غنڈہ گردی کی سند لی تھی۔ ہندوستان پاکستان یا سعودی عرب کے کس دارالحدیث کے ملا یا علامہ تھے۔ پھر یہ تاریخی دہشت گردی کیسے عمل میں آئی؟ ظاہر ہے کہ سازشی لوگ انجینئر تھے، سائنسدان تھے ڈاکٹر اور پروفیسر تھے۔ پھر ایسے کالجوں اور یونی ورسٹیوں کو کیوں نہ بند کر دیا جائے، جہاں سے ایسے ایسے عالمی دہشت گرد جنم لیتے ہیں۔ اس نکتے پر ہندی سہارا کو خون کی سرخی سے لکھنا چاہیے اور ایڈوانی کے ساتھ جوشی مہاراج کو سراغ دینا چاہیے کہ وہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کا طالبان کا رنگ نہ دیں بلکہ انہیں بند کرا دیں کہ سارے عالم کے لیے یہ خطرناک ہیں اور اسامہ کا گڑھ ہیں۔'' (ریاض الجنۃ جنوری ۲۰۰۲ء)

مقصد حیات سے ناآشنا برادران وطن کے علاوہ روشن خیالی اور وسیع الذہنی کے زعم میں مبتلا رہنے والے اسلام کے دعویداروں کا مدارس اسلامیہ کے متعلق یہ اعتراض بھی بحر سکون میں وقفہ وقفہ سے تموج پیدا کرتا ہے کہ مدارس اسلامیہ فرسودہ نظام تعلیم اور محدود مذہبی تعلیم کی وجہ سے حالات کے مطابق جدید تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، جس کی وجہ سے نوجوانان وطن کی ایک بڑی تعداد زندگی کی ترقیاتی راہوں پر قدم رکھنے سے معذور و محروم ہے۔ حضرت مولانا نے

اس کھو کھلے نعرے کی قلعی کھولتے ہوئے مدارس کی اہمیت پر خوبصورت اور جارحانہ پیرائے میں اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ عصری درسگاہوں کی انسانی و اخلاقی خدمات مدارس کے کارناموں کے سامنے سورج کے آگے چراغ کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ محسوسات کے اظہار کی وہ قدرت جس کی وجہ سے قاری سطر سطر میں ہمنوائی پر مجبور ہو جائے ایسا نمونہ آپ بھی ملاحظہ کریں:

''ہندی سہارا کو شکایت ہے کہ دارالعلوم کا نصاب تعلیم مذہبی ہے، دنیاوی تعلیم سے محروم ہے۔ تو ہمیں تسلیم ہے کہ ہم اپنی اسلامی درسگاہوں میں آسمانی صحیفوں کی تعلیم دیتے ہیں، خدا کے عالمی رسول کی سیرت سکھاتے ہیں اور قرآن کی روشنی میں اقوام عالم کا جائزہ لے کر اپنے طلبہ کو ایمان داری، دیانت داری، حب الوطنی، انسانی مساوات، اخلاقی بلندی اور قومی یکجہتی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لیے ہمارے طلبہ جب پارلیمنٹ اسمبلی اور کونسل ہاؤس یا وزارت میں پہونچتے ہیں یا قومی پارٹیوں میں آگے بڑھتے ہیں تو مولانا حفظ الرحمان ایم پی کی طرح ان کی ایمانداری کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ مگر آپ کی یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے نیتا اور وزیر اور ممبران تو بددیانتی، بے ایمانی، رشوت، بدعنوانی کا ہر ریکارڈ توڑ ڈالتے ہیں۔ غنڈہ گردی، دہشت گردی مافیا گروپنگ کی سربراہی کر کے عام زندگیوں کو اجیرن بنادیتے ہیں۔ کیوں کہ آپ کے کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں آسمانی صحیفے نہیں پڑھائے جاتے، صرف سیاست، چالبازی اور خرافات سے بھری تاریخ پڑھائی جاتی ہے۔ اس لیے آپ کو دارالعلوم دیوبند کا منہ نہیں چڑھانا چاہیے، اپنے کالجوں کے نظام تعلیم پر سنجیدگی، ایمان داری اور فکرمندی سے غور کرنا چاہیے، ورنہ قوم اور ملک کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ پچاس برس کے بعد ہم سر اٹھا کر کہہ نہیں سکتے کہ ہم گاندھی جی ایسے باپو کی اولاد ہیں۔'' (ریاض الجنۃ: ص ۵۔ جنوری ۲۰۰۲ء)

اس امر میں شک نہیں ہے کہ نثر نگاری ہی میں نہیں بلکہ تمام اصناف سخن میں مقبولیت آفاقیت اور زوال نا آشنا صفات پیدا کرنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے کہ فنکار کا قلب و ذہن خیالات کی وسعت، افکار کی گہرائی، احساس کی شدت، زندگی اور اس کے گردوپیش کے داخلی و خارجی مسائل کے باریک مشاہدے سے معمور ہو۔ اور پھر ان داخلی عناصر کے ساتھ تنظیم الفاظ کی صلاحیت، ہمہ رنگ کیفیات کے اظہار کی نئی ہیئت، موضوعات کا تنوع، طرز سخن، سخن میں ارتقا کا

تسلسل، تخلیقی عمل میں فنی لوازمات اور ادبی روایات واسالیب میں تازہ کاری وتابناکی سے اس نثر نگار کا دامن بھرا ہوا ہو۔ تاہم ادبی منظر نامہ میں جذبات کی پاکیزگی اور اخلاص کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ تخلیق کو دائمی زندگی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب تخلیق کار میں مکمل خلوص ہو، اور پوری دیانت داری کے ساتھ اپنے علم وفن، اپنے مشاہدات وتجربات اور تصورات ومحسوسات کو الفاظ کے پیکر میں ڈھال دے۔ پروفیسر آل احمد سرور کا فن کے تعلق سے یہ بیان اس کی شہادت ہے کہ:

''ایک فن پارہ اسی نسبت سے آفاقی ہوتا ہے جس نسبت سے اس میں خصوصی تجربہ ہوتا ہے۔ تجربہ فیشن یا فارمولے یا گروہ کے خیالات کی پاسداری کی وجہ سے نہیں، اس کے اپنے دلِ گداختہ سے پگھل کر نکلتا ہے۔ اس کے لیے بنیادی شرط فن کار کا خلوص ہے.......فنکار سے محض شدید جذبات یا مانگے ہوئے اجالے سے چراغاں کرنے کی توقع غلط ہے، یہاں اصل سوال فنکار کی بصیرت اور بصیرت کی گہرائی کا ہے۔'' (فکر وتحقیق سہ ماہی)

بلاشبہہ حضرت مولانا کے سیال وگہر بار قلم نے آرٹ وادب کے تقریباً تمام پلیٹ فارموں پر اپنے حسن اسلوب کا جادو بکھیرا ہے۔ آپ نے ادارتی کینوس پر علمی، تاریخی، سیاسی اور معاشرتی قدر کے انہدام سے پھیلنے والی بے چینی، بے قراری، خودغرضی، مفاد پرستی، بربریت و عصبیت کے نتیجے میں خوف وہراس، ظلم وناانصافی پر مشتمل تمام موضوعات پر طنز، تڑپ اور اضطراب اور چبھن سے بھرپور زبان میں اپنے افکار وخیالات کو پیش کیا ہے۔ مضمون کی طوالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ ہم مزید اپنے دعوی کے ثبوت میں آپ کا نثر پارہ پیش کریں، سوائے اس اعتراف کے کہ مولانا کی تخلیقات میں علمی وفنی معنویت کے ساتھ ساتھ حرف حرف میں ادبی چاشنی اور تہہ داری نمایاں ہے۔ ان کی نثر میں جہد مسلسل، تعمیری جذبات، ندرت آگیں تشبیہات، پرکیف استعارات میں ظلم واستحصال کے خلاف کھلے عام احتجاج ملتا ہے، تاہم موضوع ومواد اور تلخ وشیریں تجربات کے نشیب وفراز میں کسی مقام پر بھی اعتدال وتوازن، شگفتگی وشائستگی، معیار ترسیل وسنجیدگی سے کوئی فن پارہ تہی مایہ نہیں ہے۔ لاریب کہ آپ کی ذات ہم عصروں میں عبقری شان کی مالک تھی کہ علوم وفنون کی دیگر فضاؤں میں مشغولیت وانہماک کے باوجود اپنی معتبر تخلیقات اور خوبصورت

نگارشات کے ذریعہ اداریہ نویسی کی سطح کو نہ صرف بلندی عطا کی، بلکہ اردو ادب میں نثر کی اس صنف کو اعتماد اور ترقی بھی عطا کی ہے۔مولانا کی زندگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے والے مولانا عزیر احمد قاسمی نے لکھا ہے:

''مولانا مرحوم بلند علمی حیثیت کے مالک تھے،تفسیر وحدیث،فقہ ومنطق،بلاغت وادب ان تمام علوم کے شہسوار تھے۔آس پاس کی مثالوں کے ذریعہ طلبہ کو مسائل سے واقف کرانے کا مولانا کو اللہ نے عجیب ملکہ عطا فرمایا تھا۔وہ مسئلے کی تشریح میں کسی خاص کتابی مثال کے محتاج نہیں تھے۔اس کی زندہ مثال مولانا مرحوم کی منطق میں ''یسری'' اور بلاغت میں ''زور بیان'' ہے۔ان دونوں کتابوں کے علاوہ درجنوں کتابوں کے مولانا مصنف ومولف تھے۔مرحوم ایک بلند پایہ محدث ومفسر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ انشاپرداز اور شاعر بھی تھے۔جس وقت جہاں چاہتے لکھنا شروع کردیتے۔تنظیم فضلا وابنائے قدیم کی طرف سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''القاسم'' کے ایڈیٹر رہے۔مجلّات کی ذمہ داری کے علاوہ ہزاروں صفحات پر آپ کے مقالات و مضامین بکھرے پڑے ہیں۔'' (مجلّہ تذکیر غازی پور)

اختتام کلام:

یہاں یہ بات اہمیت سے قطعاً خالی نہیں ہوگی کہ ہر چند مولانا قاسمی نے اپنی وہبی وکسبی صلاحیتوں سے کام لے کر علمی،فکری،تحقیقی،اصلاحی،ملی،سماجی، تربیتی تمام میدانوں میں اپنی زریں خدمات کا علم نصب کیا ہے لیکن اس کے باوجود میرے خیال میں آں محترم کے تمام کارناموں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ان کے ایک کارنامے پر گہری نظر ڈالی جائے تو یقیناً محسوس ہوگا کہ آپ کی عظمت ورفعت اور آپ کو اوج ثریا سے آشنا کرنے کے لیے محض یہی کارنامہ کافی ہے کہ آپ نے ایک گمنام سنگ خام کو تراش کر اس قیمتی جوہر سے لوگوں کو آشنا کرایا جس کی بے پناہ تابانیوں سے ایک عالم جگمگا اٹھا،جس کی فیض رساں کرنوں سے گلشن علم وفضل کی ہر شاخ،ہر شجر نے تازگی حاصل کی۔جی ہاں میرے اس استعارے کا رخ استاذنا المعظم جامع علم وعمل حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ کی ذات اقدس ہے۔قدرت نے جس کی سیاحت کے لیے جنان علم وفن کے تمام دروازے کھول دیے تھے، جو اپنے استاذ کی نگاہوں کی ٹھنڈک اور

اس کی زندگی کا سب سے اہم اور عظیم سرمایہ تھی۔

جی چاہتا ہے کہ اپنی اس بے ربط تحریر کے حسن خاتمہ کے لیے استاذ نا المعظم کا وہ دل آویز اقتباس مستعار لوں جو انھوں نے اپنے محسن استاذ کی علمی گہرائی اور فنی بصیرت اور ان کے مزاج و مذاق کے متعلق رقم کیا ہے:

''مولانا اصطلاحی اعتبار سے بظاہر صوفیہ اور مشائخ کے زمرے میں نہ تھے، ایک عالمانہ وقار تھا، ایک بے تکلف سادگی تھی، نہ تواضع کا مظاہرہ تھا، نہ کبر وغرور کا شائبہ تھا، وظائف کی کثرت نہ تھی، اوراد و اشغال کا مشغلہ نہ تھا، نفلی عبادات کا زور نہ تھا، مگر ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے بات کر کے ہمیشہ یہ احساس ہوا کہ اللہ کی ذات پر بغایت یقین، اللہ کی حکمتوں پر انتہائی بصیرت، رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے آخری حد تک شیفتگی، شریعت کی نہایت عظمت، اور صحابہ وائمہ کرام کے حق میں کمال ادب کا جذبہ قلب کی گہرائیوں میں ہے، اتنا کہ خود اپنا قلب بھی اس سے متأثر ہوتا تھا۔ خصوصیت سے قرآن کریم کی حکمتوں پر ایسی گہری نظر اور ایسی روشن بصیرت تھی کہ جب اس موضوع کو بیان کرتے یا لکھتے تو وہ حکمت غامض ہونے کے بعد بدیہی اور واضح حقیقت معلوم ہوتی۔ وہ کیفیت جسے اصحاب شرع، اور ارباب طریقت ''شرح صدر'' کہتے ہیں، مولانا کی گفتگو سن کر اور مولانا کے مضامین پڑھ کر بار بار خیال ہوا کہ مولانا کو شرعی علوم ومسائل پر شرح صدر حاصل ہے۔'' (سراپا اعجاز: ص۴۶۴)

حاصل یہ کہ مولانائے محترم کی نثر نگاری میں طرحداری، کارناموں کی وسعت، خدمات کا تنوع اور آپ کی ہشت پہلوی شخصیت راہ حیات کے تھکے ہوئے مسافروں کے لیے عزم و حوصلہ کا لازوال پیغام ہے۔

تمھیں کہتا ہے مردہ کون؟ تم زندوں سے زندہ ہو
تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

❑❑❑

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی اور مولانا اعجاز احمد اعظمی
استاذ وشاگرد کے مابین تعلق ومحبت

محمد عرفات اعجاز اعظمی

دنیا میں انسان کے ساتھ ہزاروں عارضی نسبتیں لگی ہوئی ہیں۔بعض نسبتیں مستحکم اور پائیدار ہوتی ہیں اور کچھ گرتی ہوئی دیوار کی طرح کہ انہیں ہمہ وقت سہارا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ان نسبتوں کا شامیانہ جیسا بھی ہومگر خلوص کے ستون کے بغیر ان کا دیر تک قائم رہنا مشکل ہے۔باپ اور بیٹے کی نسبت پائیدار ہوتی ہے،اس لئے کہ اس میں بہرصورت خلوص کی آمیزش ہوتی ہے چاہے یک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔اور کہا جاتا ہے کہ استاذ وشاگرد کی نسبت باپ بیٹے کی نسبت سے زیادہ استحکام رکھتی ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ باپ عدم سے وجود میں لانے کا سبب ہوتا اور اس وجود پر رنگ وروغن کا کام استاذ کرتا ہے۔اس کی تراش خراش اس کو بہتر سے بہتر اور عمدہ سے عمدہ صورت دینا استاذ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔اور یہ ذمہ داری کچھ ایسی آسان نہیں ہوتی۔باپ کی نشو ونما اور پرورش کی کدوکاوش سے کہیں زیادہ استاذ کو اپنی ذمہ داری نباہنے میں جگر کاوی اور دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے۔یہ کام ہر استاذ کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔یہ ایک الگ سانچہ ہے،بیسیوں اساتذہ میں بمشکل ایک دو ہی اس سانچہ میں ڈھلتے ہیں۔انہیں گنے چنے اساتذہ میں سے ایک استاذ،استاذ العلما حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی نور اللہ مرقدہ بھی تھے،جنہوں نے بے شمار لوگوں کو تراش خراش کر بہترین رنگ وروغن کے ساتھ اسلامی سانچے میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔انہیں کے ہاتھ اور سانچے میں ڈھلا ہوا ایک نمونہ والد محترم عارف باللہ

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ کی ذات بھی تھی۔

ایک کم عمر بچہ یا طالب علم اپنے گھر خاندان ماحول اور اساتذہ سب کا کچھ نہ کچھ رنگ اخذ کرتا ہے اور غیر شعوری سے اسی رنگ میں ڈھل جاتا ہے۔ مگر شعور کے بعد اثر وتاثر کا معاملہ کم ہو جاتا ہے اور انسان اپنے مزاج وطبیعت کے لحاظ سے جسے نمونہ اور آئیڈیل سمجھتا ہے پھر صرف اسی کا رنگ قبول کرتا ہے۔ والد صاحب کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے شعور کے بعد اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ مولانا افضال الحق صاحب کا رنگ قبول کیا ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔

والد صاحب کو مولانا سے شرف تلمذ اگر چہ بہت بعد میں حاصل ہوا۔ یعنی اس وقت جب والد صاحب عمر کی دوسری دہائی میں داخل ہو چکے تھے اور سن وشعور کے اعتبار سے بہت کچھ پختہ ہو چکے تھے۔ مگر شاگردی کا رشتہ استوار ہونے کے بعد یہ رشتہ مستحکم سے مستحکم تر ہی ہوتا چلا گیا۔ والد صاحب کی مجلس میں جب کبھی مولانا کا ذکر چھڑ جاتا تو ان پر ایک سرور کی کیفیت چھا جاتی اور پھر ان کے ذکر کی وہ باد بہاری چلتی کہ اس سے زیادہ کا بس صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کو بھی والد صاحب سے از حد تعلق ومحبت تھی۔ شاگردی کے رشتہ کے بعد زندگی کے ہر موڑ پر مولانا نے والد صاحب کی رہنمائی کی اور ان کے لیے فکرمند رہے۔ انہوں نے اپنے شاگرد کو بہت مانا، بیٹوں کی طرح مانا۔ بیماری کے زمانہ میں جب مولانا پر نسیان کا غلبہ تھا، والد صاحب خدمت میں حاضر ہوئے، مولانا کے صاحبزادے نے تعارف کرانے کی کوشش کی تو مسکرا کر فرمایا کہ ''میں انہیں تم سے زیادہ پہچانتا ہوں۔''

مولانا جس سانچہ کے ڈھلے ہوئے انسان تھے وہ سانچہ شاید اب ٹوٹ چکا ہے۔ مولانا کی ذات کی بنیاد جفاکشی، محبت، تحمل اور بے پناہ دینی غیرت وحمیت سے رکھی گئی تھی۔ دینی وشرعی معاملہ میں ان کے یہاں ایک ذرا لچک نہیں تھی، اس سلسلہ میں ان کی ذات میں سمجھوتہ کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ محبت وتحمل اور جفاکشی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی محبت اور جفاکشی کا ایک واقعہ والد صاحب کے قلم سے پڑھیے:

''تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا سے ربط وتعلق باقی رہا، مولانا کے آبائی گاؤں سے میرا گاؤں بیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ضلع مئو میں ہی ہے۔ چھٹیوں میں جب مولانا گھر پر ہوتے تو میں

اکثر سائیکل سے ان کے گھر چلا جایا کرتا، ایک مرتبہ کسی مختصر چھٹی میں مولانا گھر تشریف لائے تھے، مجھے معلوم نہ تھا، میں کہیں گیا ہوا تھا، گھر واپس آیا تو والد صاحب نے بتایا کہ مولانا افضال صاحب تشریف لائے تھے۔ میں حیرت اور خوشی میں ڈوب گیا، مولانا کی یہ خرد نوازی تھی، مجھے معلوم نہیں تھا کہ مولانا گھر تشریف لائے ہیں، تو خود ہی ملاقات کے لئے آ گئے۔ والد صاحب نے بتایا کہ سائیکل سے آئے تھے، انھیں تعجب ہو رہا تھا کہ اتنے بڑے عالم اور سائیکل چلا رہے تھے۔ یہ مولانا کی سادگی اور بے نفسی تھی۔''

اب کہاں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے شاگرد سے اس قدر محبت رکھتے ہوں اور محض شاگرد سے ملاقات کے لیے اتنی مشقت اور جفاکشی کا مظاہرہ کریں۔

والد صاحب کی رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد مولانا کو اپنے شاگرد کی فکر ہوئی، وہ چاہتے تھے کہ کسی کام میں لگ جائیں مگر حالات ایسے تھے مدرسہ والے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ مولانا کو بھی اس کا اندازہ تھا کہ اگر یہ مدرسہ میں گیا تو مشکل پیش آئے گی۔ مولانا نے اپنی سی کوشش کی اور مولانا اسعد مدنی صاحب کے نام خط لکھ کر والد صاحب کے حوالے کیا اور تاکید بلیغ کی کہ یہ خط ضرور مولانا اسعد مدنی صاحب کو دیدینا، وہ کہیں جمعیۃ میں لگا دیں گے۔ والد صاحب حسب ہدایت خط لے کر گئے مگر مولانا اسعد مدنی صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد کچھ گھریلو حالات کی وجہ سے والد صاحب کو ڈیڑھ سال تک گھر ہی رہنا پڑا۔

اصل دکھلانا یہ ہے کہ مولانا کو اپنے شاگرد سے کس درجہ محبت تھی۔ والد صاحب کے تعلق سے ان کی فکرمندی ہو بہو ویسی ہی تھی جیسی ایک باپ کی فکرمندی اپنے بیٹے کے تعلق سے ہوسکتی ہے۔

یہ بالکل ابتدائی زمانہ کی بات تھی، اس کے بعد بھی جب والد صاحب تدریس سے متعلق ہوگئے اور مدرسوں میں مدرسی کرنے لگے تو ایسا نہیں کہ مولانا والد صاحب کی طرف سے مطمئن ہوکر بیٹھ گئے ہوں، نہیں، بلکہ اس وقت بھی مولانا والد صاحب کے حالات سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے، ویسے ہی جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کے حالات سے باخبر رہنا چاہتا ہے۔ موقع بموقع مفید مشوروں سے نوازتے اور درست رہنمائی کرتے رہتے۔ ۱۹۸۴ء میں جب والد صاحب

گورینی گئے تو مولانا اس وقت وہیں مصروفِ تدریس تھے۔امروہہ کے بعد پھر استاذ شاگرد کی یکجائی ہوئی اور یہ یکجائی چار سال تک رہی۔۱۹۸۹ء میں مولانا کے ساتھ مدرسہ میں انتہائی غیر انسانی سلوک ہوا جس کی وجہ سے مولانا نے وہاں سے اپنا رشتۂ تعلق ختم کرلیا۔اسی سال والد کو یہ کہہ کر ذہنی اذیت دینے کی کوشش کی گئی کہ ''آپ کے استاذ تو گئے،آپ کب جارہے ہیں؟'' والد صاحب دل برداشتہ تو پہلے ہی سے تھے،اس بات نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی اور انہوں نے بھی اپنا ربط ضبط منقطع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس طرح بزعم خود راستہ کے دونوں کانٹوں کو ہٹادیا گیا۔ پہلے استاذ کو رخصت کیا اور پھر استاذ کے ساتھ شاگرد کی گرویدگی ومحبت کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے استاذ کا طعنہ دے کر شاگرد کو بھی رخصت ہونے پر مجبور کردیا گیا۔

والد صاحب کو مولانا کی ذات سے جو انس،تعلق،شیفتگی،گرویدگی اور محبت تھی،اس کا ذکر اکثر ہم لوگوں سے کیا کرتے تھے۔مولانا کے احسانات وعنایات کا اظہار اپنے بیٹوں کے سامنے بس سمجھ لیجیے کہ ان کا وظیفہ تھا۔اکثر کہا کرتے تھے کہ ''مولانا نے اس وقت میرے سر پر ہاتھ رکھا جب ہر طرف سے طنز وطعنہ کے طمانچے برس رہے تھے۔'' یہ اشارہ ہوا کرتا تھا دارالعلوم کی اسٹرائک کے بعد کے حالات کی طرف،جب والد صاحب پر طنز کا تیر اپنا وغیر ہر شخص برسا رہا تھا۔ اسٹرائک کرنے والوں پر ارباب دارالعلوم نے پورے ہندوستان کے مدارس کے دروازے بند کردیئے تھے۔کوئی بھی ان کا داخلہ لینے اور اپنے مدرسہ میں پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔اس وقت ان مجرمین کے حق میں کوئی آواز آئی تو وہ مولانا ہی کی تھی کہ ''یہ بچے ہیں،ان سے غلطی ہوسکتی ہے مگر ان پر تعلیم کا دروازہ بند نہیں کرنا چاہئے،اپنے انتظام کی خامیوں اور کمیوں کا جائزہ لینا چاہئے۔''

اس وقت مجرمین کے حق میں آواز اٹھانا بہت جگر اور گردے کا کام تھا مگر وہ مولانا افضال ہی کیا جو یہ کام نہ کرسکیں۔ان کا تو خمیر ہی حق گوئی اور بے باکی سے اٹھایا گیا تھا۔

والد صاحب نے مولانا مناظر احسن گیلانی کی دوتین تحریروں کو یکجا کرکے ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی،اور چاہا کہ کتاب کے شایان شان مولانا مناظر احسن صاحب کے رنگ طبیعت سے میل کھاتی کوئی شخصیت اس کا مقدمہ

لکھے۔ظاہر ہے کہ والد صاحب کی نگاہ میں مولانا سے زیادہ اس کام کے لیے اور کون موزوں ہوسکتا تھا؟اور پھر یہ بھی کہ مولانا مناظر احسن صاحب اور مولانا افضال صاحب میں بہت سی قدریں مشترک بھی ہیں۔جیسے سیال اور مجتہد ذہن کے وہ مالک تھے ویسا ہی سیلانی اور مجتہدانہ دماغ ان کا بھی تھا۔جیسی شستہ،شگفتہ علمی نثر وہ لکھتے ہیں ویسی ہی کوثر وتسنیم میں دھلی ہوئی جھرنے کے پانی کے مانند سبک سہل ،بے تکلف اور رواں دواں ان کی بھی علمی زبان ہے۔چنانچہ والد صاحب ''احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن''میں لکھتے ہیں:

''جی چاہتا تھا کہ اس بیش قیمت کتاب پر اسی کے شایان شان ایک مقدمہ لکھا جاتا،ملا کی دوڑ مسجد تک۔میں اور کہاں جاتا،مجھے کون پوچھتا؟علم اور قلم میں میرے مرکز عقیدت،میرے جلیل القدر استاذ حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہ ہیں جن کے فیضان نظر سے اگر چہ میں اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کی وجہ سے یہ تو نہیں بتا سکتا کہ کیا ملا ہے لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس مشت خاک میں اگر کسی کو کوئی ہنر نظر آئے تو یہ انہیں کا فیضان نظر ہے۔میں اپنی یہ کوشش اور محنت ان کی خدمت میں لے گیا۔انہوں نے حسن قبول کی سند دی اور جیسا میں چاہتا تھا حضرۃ الاستاد نے ویسا ہی مقدمہ لکھ کر عنایت فرما دیا،جس کے الفاظ اگر چہ قلیل ہیں لیکن معانی ومقاصد اس کے جلیل ہیں۔غور وفکر کرنے والوں کے لئے اس مختصر مقدمہ میں ایک جہانِ معنی پنہاں ہے۔فھل من مدکر

مولانا نے ''یادش بخیر''کے عنوان سے اس کا مقدمہ لکھا اور خوب لکھا۔ایسا لکھا کہ پڑھ کر طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔بس سمجھ لیجیے کہ نثر میں شاعری کی ہے۔مقدمہ اگر چہ بہت طویل نہیں ہے مگر اس میں ایک جہان معانی سمو دیا ہے۔اس مقدمہ کے صرف متن ہی نہیں بلکہ بین السطور کو بھی مولانا کے قلم نے گویائی عطا کر دی ہے۔اس کی عبارت جو کہتی ہے وہ تو ہے ہی،اس کے ساتھ اس کے بین السطور بھی بہت سی ان کہی بات سناتے ہیں۔مولانا نے اس مقدمہ میں ایک جگہ اپنے شاگرد کا بھی تذکرہ کیا ہے جس کی سطر سطر سے عیاں ہے کہ مولانا اپنے شاگرد سے مطمئن ہیں اور خوش بھی۔آپ بھی دیکھئے مولانا کی تحریر:

''مولانا اعجاز احمد صاحب تعلیم وتربیت کے آدمی ہیں۔میں نے ان کے نمونے غازی

پور، گورینی جونپور میں اور اب شیخو پور میں دیکھے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تعلیم وتربیت کی فضامزید بہتر، خوش گوار اور علیٰ منہاج النبوۃ بنانے کی تڑپ ان میں موجود ہے اور اسی تڑپ نے اس رودادسفر کو کتابی شکل میں لاکر اہل مدارس کو اپنی جدوجہد کی راہ دکھانا ضروری سمجھا ہے۔

خدا اُس مسافر کی ہمت بڑھائے
جو منزل کو ٹھکرادے منزل سمجھ کر

سمجھ میں نہیں آتا کہ دارالعلوم کا ایک طالب علم ایک گاؤں میں بیٹھ کر تعلیم وتربیت کو خالص دیوبندی اسلاف کے نہج پر لانے کی دھن میں سرگرداں ہے، اور خود اہل دارالعلوم اول و ثانی کو اس کی مطلق پروانہیں کہ وہ بھی اپنی متاع گمشدہ کو تلاش کریں اس کی گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کریں شاید:''

''کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا''

یہ تحریر ایک دیدہ ور استاذ کی جانب سے ایک شاگرد کے لیے سند ہے۔

مولانا اپنے شاگرد سے بہت تعلق ومحبت رکھتے تھے۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ زبانی اور مجلسی گفتگو میں شاگرد کو اچھے انداز اور اونچے الفاظ میں یاد کرتے ہی تھے، اگر تحریر میں بھی کہیں سے شاگرد کے ذکر کی تقریب نکل جاتی تو دو چار جملے ضرور لکھ دیتے۔ بابو عزیز الرحمان صاحب کا انتقال ہوا، مولانا کے ان سے بہت اچھے مراسم تھے۔ ان کا تذکرہ مولانا نے لکھا اور ان کے محاسن بیان کیے۔ تذکرہ کے درمیان اعظم گڑھ کی جامع مسجد اور درس قرآن کا ذکر آ گیا۔ والد صاحب نے درس قرآن کا سلسلہ بابو عزیز الرحمان صاحب ہی کی دعوت وایما پر شروع کیا تھا۔ مولانا نے اس تقریب سے والد صاحب تذکرہ کیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ آپ بھی وہ پیراگراف ملاحظہ کرتے چلئے:

''بابو صاحب نے جامع مسجد کا فیضان عام اور پورے شہر کو اسلام سے مانوس کرنے کے لیے درس کلام اللہ کا انتظام کیا اور اس کی ذمہ داری مولانا اعجاز احمد صاحب جیسے استاذ، خطیب اور عابد وزاہد نوجوان عالم کو سونپ کر اپنے حسن انتخاب کا سکہ جما دیا۔ ورنہ شہر سے گیارہ کلومیٹر دور سے کسی کو ہفتہ وار سہی مگر پابندی سے لانا اور ان کے سفر اور آمد ورفت کو آسان کرنا اور مولانا

کو مطمئن رکھنا غیر معمولی کام تھا، جسے خوب انجام دیا۔

درس قرآن ایک مشکل فن ہے۔وہ بھی اعظم گڑھ جیسے شہر میں جہاں شبلی منزل دارالمصنفین ،شبلی کالج اور دارالرشاد جیسے علمی وادبی اور دینی ادارے کام کررہے ہیں۔اس لیے کہ اچھے اچھے اہل فن وہاں رہتے ہیں اور مولانا کے درس قرآن میں آتے ہیں اور مطمئن رہتے ہیں۔اس میں دونوں نے اپنا اپنا کمال دکھایا۔بابوعزیزالرحمان نے ذوق وجستجو حسن انتخاب اور حسن انتظام کا امتحان اول نمبر سے پاس کرلیا۔اور مولانا اعجاز صاحب بھی پابندی اوقات، حسن خطاب اور مطالعہ قرآن کے امتحان میں ممتاز رہے۔**شکر الله مساعیهم**

بابوعزیزالرحمان کے اٹھ جانے سے یہ جوڑی بچھڑ گئی مگر امید ہے کہ مولانا اعجاز صاحب بابوصاحب کی خاطر نہیں بلکہ اعظم گڑھ کی خاطر اس سلسلے کو اسی طرح خوش دلی اور ذوق وشوق سے چلاتے رہیں گے۔''(دانشور۔مارچ،اپریل،مئی ۲۰۰۳ء)

استاذ وشاگرد کا یہ تعلق خلوص پر مبنی تھا۔والد صاحب مولانا کی علمیت اور تقوی وطہارت سے مطمئن تھے اور مولانا والد صاحب کی کارکردگی اور جدوجہد سے خوش تھے۔یہ اخلاص کی کارفرمائی ہی کا نتیجہ تھا کہ کبھی کبھار استاذ وشاگرد کے درمیان علمی اختلاف بھی ہوا مگر یہ اختلاف محض اختلاف ہی رہا۔مخالفت اور رسہ کشی تک نہیں پہونچا اور ذاتی تعلقات پر اس کا کوئی خراب اثر نہیں پڑا۔مولانا اور والد صاحب کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ'' گاؤں میں جمعہ'' مسئلہ کا تھا۔والد صاحب اپنی فقہی بصیرت کی روشنی میں گاؤں میں جمعہ کے جواز کے قائل تھے،اوران کا یہ کہنا کوئی ان کی اپنی الگ رائے یا تفرد نہیں تھا بلکہ حضرت نانوتوی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی بعض تحریروں کو وہ استشہاد میں پیش کرتے تھے۔اور مولانا گاؤں میں جمعہ کے عدم جواز کے قائل تھے۔والد صاحب نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا جو'' بحث ونظر'' میں شائع ہوا۔مولانا نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے غالباً اسی کے رد میں ایک مضمون لکھ کر شائع کرایا۔

یہ تھی استاذ وشاگرد کے مابین تعلق ومحبت کی حکایت۔۱۹۷۰ء میں استاذی شاگردی کے واسطے سے محبت وعقیدت کا رشتہ استوار رہوا،اور ۲۰۱۳ء میں والد صاحب کی وفات پر یہ ربط بظاہر منقطع ہوا مگر حقیقت میں یہ ربط وتعلق ختم ہونے والا نہیں ہے بلکہ دونوں جلیل القدر استاذ وشاگرد کے بعد

یہ رشتہ ایک مثال بن کر لوح عالم پر ثبت ہے۔ دیکھنے والے دیکھیں اور سبق حاصل کرنے والے اس بے لوث تعلق سے سبق حاصل کریں۔ ۴۳؍سال کے طویل عرصہ پر محیط اس تعلق پر ہر طرح کے حالات آئے ہوں گے، کیا کچھ نہیں گزرا ہوگا، مگر اخلاص وللّٰہیت کی برکت سے نہ یہ رسی ٹوٹی اور نہ ہی کبھی ڈھیلی پڑی۔

دعا ہے کہ استاذ وشاگرد کے اس مبنی برخلوص تعلق کو بارگاہ صمدیت میں شرف قبول عطا ہو اور جنت میں دونوں حضرات کو ابدالآباد کی یکجائی حاصل ہو۔

❑❑❑

حرفِ مکرر

ابرار احمد اجراوی

شعر کی ماہیت کیا ہے؟ اس کے مابہ الامتیاز خصائص اور اس کے حدود کیا ہیں؟ شعر کے لیے وزن ضروری ہے یا نہیں؟ لفظ اہم ہے یا معنی؟ مواد مقدم ہے یا ہیئت؟ نہ یہ بتانے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی تشریح درکار کہ یہ سنتے سنتے سارے اردو والے مکمل 'سنی' بن گئے ہیں اور پھر یہ کہ شعر کی کوئی ایسی تعریف بھی نہیں، جو اس کے تمام افراد کو جامع اور دخول غیر سے مانع ہو، سبھی نے اس کے معنی و مراد تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ شاعری بھی فنون لطیفہ ہے، مگر یہ ایک لطیف ترین، نازک ترین اور مشکل ترین فن ہے۔ شاعری جنم تو اسی عالم آتش و آب میں لیتی ہے، مگر یہ محبوبہ بہت ہی عشوۂ و ادا اور ناز و نخرے والی ہے، جو ہر کسی کی 'رفیق زندگی' اور 'شریک حیات' نہیں ہوتی۔ شعر گوئی قدرت کا عطیہ اور بخشش خداوندی ہے۔ ہر موزوں طبع شخص پر شعر گوئی کی صلاحیت یکساں مہربان نہیں ہوتی۔ اور اردو زبان کے جد عالی، مولانا حالی نے تو صاف اعلان کر دیا ہے کہ شاعری کوئی اکتسابی چیز نہیں، بلکہ بعضی طبیعتوں میں اس کی استعداد خداداد ہوتی ہے۔ خیر وزن و قافیے کے پیرایے میں کوئی بھی کلام ہو، اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شعر کا مضمون و مفہوم کیسا ہے۔ لفظ و معنی دونوں کا حسین وصال ممکن ہوا ہے کہ نہیں؟۔ جو کلام بھی موزون و مقفی ہو، اس میں تاثیر کی ساحری ہو، ندرت و طرفگی اور شائستگی ہو، وہ اعلی و ارفع شعر کا خطاب پائے گا۔ اب تو آزاد نظم اور نثری نظم نے ادبی دنیا میں وہ قلابازی دکھائی ہے کہ اردو کی ابجد سے نا آشنا بھی مملکت شعر و ادب کا تخت نشیں بن گیا ہے۔ اور 'ملک الشعرا'، 'استاذ الشعرا' کے القاب اس پر لٹائے جا رہے ہیں۔ اس پر

چہار جانب سے داد و دہش کی بارش برستی ہے۔ مگر اس گئے گزرے دور میں بھی انھیں کوئی سلیم الطبع آدمی شاعر ماننے کے لیے تیار نہیں۔ مجبوریوں، سفارشوں اور پابندیوں کی بات اور ہے۔

فی نفسہ شاعری بری اور قابل تنفر چیز نہیں۔ شاعر تلمیذ الرحمٰن بھی ہوسکتا ہے اور تلمیذ الشیطان بھی۔ تعمیری فکر کا حامل اور اعلی روایتی اور اخلاقی اقدار کا مبلغ بھی ہوسکتا ہے اور فحش، ماورائے انسانیت اور مخرب اخلاق اور حیا سوز مواد کا پرچارک بھی۔ مدح وذم کے دائرے سے شعر بھی بالاتر نہیں۔ مگر شعر کے مضامین کی صفائی و سادگی، اس کی حقیقت و واقعیت اور صداقت و حرمت سے اس کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ اچھے معانی، بامعنی الفاظ انسانی اذہان پر اچھے اثرات مرتب کرتے ہیں تو برے الفاظ اور فحش معانی انسانی معاشرے میں بے راہ روی، اخلاق باختگی اور آوارہ گردی کا زہر گھولتے ہیں۔ بری شاعری سے صرف سوسائٹی کی فضا ہی مسموم اور زہر آلود نہیں ہوتی، بلکہ اس سے زبان اور لٹریچر کو بھی بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں لکھا ہے:

> ''سب سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے یا اس کے محدود ہوجانے سے ملک کو پہنچتا ہے، وہ اس کے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی ہے۔ جب جھوٹ اور مبالغہ عام شعرا کا شعار ہوجاتا ہے، تو اس کا اثر مصنفوں کی تحریر اور فصحا کی تقریر اور خواص اہل ملک کے روزمرہ اور بول چال تک پہنچتا ہے۔ کیوں کہ ہر زبان کا نمایاں اور برگزیدہ حصہ وہی الفاظ ومحاورات اور ترکیبیں سمجھی جاتی ہیں، جو شعرا کے استعمال میں آجاتی ہیں۔..... شعرا کی ہزل گوئی سے زبان میں کثرت سے نامہذب اور فحش الفاظ داخل ہوجاتے ہیں۔'' (ص:۳۹)

ہمارے قدیم دور کے شاعروں کو اس کا خیال بھی تھا، کیوں کہ وہ مولانا الطاف حسین حالی کی مقدمۂ شعر و شاعری کے اصول وضوابط پر چلنے والے شعرا تھے، انھیں امام فن علامہ شبلی کی تنقیدی نظر سے اتفاق تھا، وہ سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کے ادبی اور تخلیقی معیار نقد پر ایمان رکھتے تھے۔ میر وسودا، ذوق وغالب، اقبال وحسرت، فانی، جگر اور اصغر وغیرہ ایسے شعرا ہیں جنھوں نے شعر کی حرمت کو برقرار رکھا ہے۔ اس کے تقدس کو پامال نہیں کیا ہے۔ اس کی آبرو کی حفاظت کی ہے۔ مگر یہ اردو شاعری کا المیہ ہے کہ اب اردو شاعری میں تزکیہ وتطہیر کا عمل چل رہا ہے۔ شعر وادب

کی دنیا میں دبستانوں کا امتیاز، دہلی اور لکھنؤ کا تنازعہ، شاعرانہ چشمک، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے واقعات اور اردو کے ادبی معرکے بہت مشہور ہیں، مگر کسی شاعر کے مذہبی اور دینی پس منظر کو نظر میں رکھ کر انھیں بارگاہ ادب سے نکال دینا کہاں کا انصاف ہے؟ مذہبی اور اسلامی ماحول میں پرورش پانے والے ادب کے ساتھ ناانصافی کی لہر کیوں چل رہی ہے؟ کوئی مدرسے کی شکستہ چہار دیواری میں، مسجد کے بند گنبد میں اور خانقاہ کی اندھیری کٹیا میں عمدہ ادبی شاہ کار تخلیق کرے، اچھی شاعری کرے، اصلاحی، بامعنی، جنسیات ولغویات سے مبرا اور فکر انگیز افسانے لکھے، تو اس کو مروجہ ادبی لیک اور معاصر شعری رجحان سے منحرف کیوں باور کرتے ہیں؟ ان کی نگارشات کو ادبی اور تخلیقی نگارخانے میں مناسب جگہ کیوں نہیں دی جاتی؟ مسلک و مذہب اور مشرب ومکتب کی وبا مسلمانوں میں تو ہے ہی، مگر مجھے تعجب ہے کہ یہ وبا اتنی تیزی کے ساتھ اردو دنیا میں کیوں پھیلتی جارہی ہے؟ وہی اردو دنیا جو دین و مذہب ہی نہیں، ہر مسلک اور ہر مشرب کے جبر سے کلیتا آزادی کا نعرہ بلند کرتی ہے۔ اردو دنیا کے چودھریوں سے پوچھنا چاہیے کہ اردو کے عناصر خمسہ کون تھے؟ کس فورٹ ولیم کالج، کون سے سینٹ اسٹیفن کالج یا کس عصری دانش گاہ کے پروردہ تھے؟ یا انھوں نے بھی مسجد و مدرسہ کے بوسیدہ اور روایتی ماحول میں جنم لیا تھا۔ شاعری صرف شاعری ہوتی ہے؛ ادب صرف ادب ہوتا ہے۔ صرف کج مج الفاظ کے مجموعہ کو ادب وشاعری کا درجہ نہیں دیا جاتا، اس کے الفاظ، اس کے معانی، اس کے مضامین وموضوعات، اس کو برتنے اور اس کی پیش کش کا انداز اس کو شعر وادب بناتا ہے۔

مولانا حالی نے شاعری کے لیے جو شرطیں اور خوبیاں گنوائی ہیں، وہ شرطیں جس شاعر میں بھی پائی جائیں، ان کے سر پر شعر وادب کا تاج رکھا جائے گا۔ جس شاعر کا تخیل مائل بہ پرواز ہو، کائنات کے اسرار وابعاد تک رسائی اور اس کے مطالعہ کا ملکہ رکھتا ہو اور الفاظ کے تفحص کے لیے ایک دو نہیں، 'ستر کنویں' جھانکتا ہو، اس کے اشعار میں جوش، سادگی اور اصلیت کا جوہر ہو، اس کا فرمایا ہوا بڑی شاعری اور اس کا 'خالق' بڑا شاعر ہے۔ خواہ وہ کسی ادبی گروہ سے منسلک ہو، کسی ادبی جماعت کا ممبر ہو، ترقی پسند ہو، جدیدیت نواز ہو یا مابعد جدیدیت کا علم بردار ہو، یا سکہ بندی ادبی نظریات سے الگ رہ کر شعر وشاعری کی محفل سجائے ہوا ہو۔ مئے خانے میں جام لنڈھار ہا ہو یا مسجد وخانقاہ میں 'ہو'

اور'ہا' کی رٹ لگا رہا ہو، ہماری شعری اور ادبی تاریخ میں یہ جبر کبھی گوارا نہیں رکھا گیا تھا۔ مجھے بتائیے کہ ہمارے کلاسیکی عہد کے شعرا کس ادبی گروہ سے وابستہ تھے۔ان کا ایک ہی کام تھا، شعر گوئی اور ان کا ایک ہی غم تھا، اپنے شعر کے دامن میں آشوب زمانہ کو آئینہ کرنے کا غم، وہ مذہب پسند بھی تھے اور مشرع بھی، ان کا خانقاہوں، درگاہوں، علم ومعرفت اور تصوف وسلوک کی دنیا سے بھی گہرا واسطہ تھا، وہ موحد تھے، زندیق اور کافر بھی نہیں تھے، مگر وہ ادب وتنقید کی کس میزان پر بڑے شاعر نہیں کہلاتے۔ ہم آج جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا راگ الاپنے کی باوجود انھی کے پھیکے ہوئے نوالوں کو رنگ وروپ بدل کر چبا اور نگل رہے ہیں۔خواہ ہم تعصب سے کام لے کر اس پر کوئی اور لیبل چسپاں کردیں۔اور پھر یہ کوئی ضروری نہیں کہ تخلیق کا ملکہ ہر کسی پر برابر مہربان ہو، یہ عطیۂ خداوندی اور فیضان سماوی ہے۔اس پر کسی انسان، کسی بادشاہ اور کسی جاگیر دار کا قبضہ نہیں کہ وہ جس کو جتنا چاہے نواز دے۔ یہ اس خزانے سے ملتا اور اس جہاں سے ودیعت ہوتا ہے جس پر بس ایک کا قبضہ ہے۔اور پھر یہ بھی کہ اچھا ادب لکھنے کے لیے شخصیت کا بڑا ہونا بھی ضروری نہیں۔اس کا پابند ازم ہونا بھی لازمی نہیں۔معمولی شخص بھی عمدہ اشعار موزوں کرسکتا ہے اور بڑا شاعر بھی اسفل السافلین میں جاسکتا ہے۔مولانا دریابادی اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''جس طرح مریض، بہت معمولی طبیبوں بلکہ نیم حکیموں کے ہاتھ سے شفا پاجاتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ ہر شعر کا کہنے والا بھی کوئی اعلی شاعر ہو۔بعض بہت معمولی شاعر بھی شعر بہت اچھا کہہ جاتے ہیں۔'' (آپ بیتی، ص:۳۲۶، مکتبہ فردوس لکھنؤ ۱۹۹۸ء)

رومانیت، ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے عہد میں بھی ایک طبقہ ایسا تھا جو نظریاتی ادبی راہ سے الگ رہا، اور شعر وسخن کی بزم آراستہ وپیراستہ کیے رہا، مگر آج کتنے لوگ ان کی نگارشات، ان کی شاعری، ان کی تخلیقات سے واقف ہیں۔ان کے حصے میں ساہتیہ اکادمی، اردو اکادمی کی طرف سے ملنے والے کتنے ایوارڈ آئے؟ انھوں نے حکومت کے زیر نگرانی ہونے والے کتنے مشاعروں کو زینت بخشی۔ان پر کس یونی ورسٹی میں تحقیق ہوئی؟ جواب صرف نفی میں ہوگا۔مدارس ومساجد اور خانقاہ ومراکز کی چہار دیواری میں پلنے اور بڑھنے والے شعرا کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ انھوں نے شاعری تو کی، اعلی درجے کی، مگر انھوں نے گم نامی اور بے نامی کا خطرہ تو مول

لیا، کسی ادبی گروہ اور کسی ادبی پارٹی سے اپنا ارتباط و اختلاط نہیں رکھا، کیوں کہ انسلاک و انضباط اعلی اور عمدہ ادب کی راہیں مسدود کر دیتا ہے، مگر انھوں نے پابند شاعری کے دائرے میں رہتے ہوئے جو شعری سرمایہ چھوڑا ہے، وہ ہر دور کی شاعری میں ممتاز و نمایاں رہے گا۔ سارے قدیم و جدید شعری اور ادبی معیار و اقدار ان کے سامنے پانی بھریں گے۔ مگر یہ کیسا ادبی جبر ہے کہ انھیں سراسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے کسی دور میں ان کا نام نہیں آتا۔ دہلی، لکھنؤ، عظیم آباد، کسی دبستان میں ان کا ذکر نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنے عہد میں میر مجلس اور صدر الصدور کہلاتے تھے، انھیں متن میں کیا، حاشیہ اور بین السطور میں بھی جگہ نہیں ملی۔

وفا کے دشت میں عمریں گزارنے والے
وفا کے باب میں بے نام و نسب ٹھہرے

دراصل یہاں بھی وہی ذہنیت کام کر رہی ہے کہ یہ بے چارے ملانے، قال اللہ اور قال الرسول کا ترانہ پڑھنے والے کیا لکھیں گے؟ ایمان و اسلام، کعبہ و گنبد خضرا، جنت و دوزخ، حلال و حرام اور کفر و توحید کا ذکر کرنے والے خاک شاعری کریں گے؟ جنھوں نے رندی و سرمستی سے رشتہ استوار نہیں کیا، مئے و مینا اور جام و سبو کا مزہ نہیں لیا اور جنھوں نے آہوان عالم کا دیدار و تعاقب نہیں کیا، جنھوں نے غزل کے دائرے میں ان کے پیکر، ان کے قد و قامت اور ان کے شانہ و سر، ان کے لب و رخسار، ان کے خد و خال اور ان کے سیاہ زلف و کاکل کا نقشہ نہیں کھینچا وہ بھلا کیسے شاعر ہو سکتے ہیں؟ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ اساتذۂ جامعات اردو اور اردو اکادمیوں کے سربراہ بھی ان بے چارے جبہ و قبہ اور عمامہ و دستار والوں کو درکنار کرنے میں پیچھے نہیں ہیں۔ اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار میں اسٹیج پر آتے ہی ایک بڑے افسانہ نگار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور برجستہ بولنے لگے کہ بھئی ادب اور مذہب کو الگ رکھو۔ عمدہ ادب تخلیق کرنے کے لیے اس بے چاری تخلیقی صنف کو مذہب کے بارگراں سے آزاد رکھو۔ خیر سے وہ غیر مسلم تھے، انھیں انسانی زندگی میں دین اور مذہب کی تاثیر اور اس کی حقیقت و واقعیت اور شعری و نثری تخلیق میں اس کی حلاوت سے کیا سروکار، مگر بہت سے اسلام اور دین کا نام لینے والے ادیب و شاعر بھی ان لوگوں سے متنفر اور بیزار نظر آتے ہیں۔ اسی لیے مولانا علی میاں ندویؒ نے، جو اپنے زمانے میں

اس ادبی ناانصافی سے بے تاب و بے چین رہا کرتے تھے، بڑے جذباتی انداز میں لکھا تھا:

''ادب کی کوئی قومیت ہے نہ وطنیت ، نہ جنسیت ہے اور نہ وہ خاص اصطلاحات کا پابند ہے نہ خاص ضوابط کا.....ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو، یا کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے، اور اس کو قبول کرے۔

حسن پسندی تو یہ ہے کہ حسن جس شکل میں ہو اسے پسند کیا جائے، بلبل کو آپ پابند نہیں کر سکتے کہ اس پھول پر بیٹھے اس پھول پر نہ بیٹھے، یہ کہاں کا حسن مذاق اور کہاں کی حق پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی میخانے کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے، اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں؟ کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمو اور جلوہ نمائی کے لئے مسجد کا سہارا لیا؟''

زیر نظر مجموعہ (دار ورسن تک) کے شاعر مولانا افضال الحق جوہر قاسمی (۱۹۲۳-۲۰۱۲ء) بھی مدارس کی چہار دیواری کے پروردہ تھے، جہاں لا الہ الا اللہ کی صدا لگائی جاتی ہے اور مدارس میں بھی اس عالمی اسلامی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے، جس نے برصغیر ہند میں ہی نہیں، بلکہ عالمی پیمانے پر اسلام و مسلمان کی بے بہا خدمت کی ہے۔ عقیدہ و مذہب کے تحفظ اور صحیح اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور قرآن و حدیث کے عالمی پیغام کی ترسیل جس ادارے کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ دار العلوم دیوبند کا یہ امتیاز ہے کہ اس نے اپنے نصب العین سے مفاہمت نہیں کی، اس سے سر مو بھی انحراف نہیں کیا، وہی قرآن و حدیث کے دامن سے وابستگی اور مضبوط وابستگی، وہی قال اللہ اور قال الرسول کی صدائے مستانہ، مگر اس کے فضلاء اور اس کے دامن فیض سے وابستہ افراد نے علم و ادب کے دوسرے گوشوں کو بھی منور کیا ہے۔ دار العلوم دیوبند نے صرف مفسر و محدث، فقیہ و متکلم، خطیب و مناظر اور حافظ و قاری ہی پیدا نہیں کیے، بلکہ چمنستان علم کی ہر شاخ کی آبیاری کی ہے۔ شاعر، صحافی، انشاء پرداز، خطیب و مقرر، مصنف و مؤلف اور تخلیق کاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے دار العلوم دیوبند کے چشمۂ صافی سے علمی اکتساب کیا ہے۔ یہی اس ادارے کا امتیاز

ہے کہ اس نے غیر مشروط وابستگی کے باوجود علم وادب کے دوسرے غیر مقصود شعبوں کی بھی خدمت کی ہے۔ مگر یہ دور حاضر کا المیہ ہے کہ شعروادب کی دنیا میں انھیں حاشیہ پر بھی جگہ نہیں دی جاتی ہے۔ کہیں بھولے سے نام آیا تو اس کو مذہب اور مذہبیات کے غلاف میں بند کر دیا۔ حالاں کہ اردو کے چمنستان میں جو بہار آئی ہوئی ہے، اس میں انھی مدارس اور اہل مدارس کا لہو شامل ہے۔ اردو ادب کے باغ پر قاسمیت کی بہار سے تازگی اور شگفتگی ورعنائی آئی ہے۔ انھوں نے زلف وکاکل، قد وگیسو، دست وکمر اور مئے ومینا کی بات تو نہیں کی، جام چھلکانے اور جسم لہرانے کا پرچار تو نہیں کیا، شراب وکباب کا آنند نہیں لیا، مگر انھوں نے حقیقت پسندی کے ساتھ انسان کے پاکیزہ داخلی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ ہیجان انگیزی تو نہیں کی، مگر انسان کے باطن میں اُمڈنے والے مدو جزر کی عکاسی کی ہے۔ ان کے یہاں معانی کی نیرنگی بھی ہے، حسن ادا بھی ہے، سلاست و برجستگی بھی ہے، ان کی فکر اور ان کا تخیل بہت پاکیزہ ہے۔ دوسرے مدارس کی بات چھوڑیے، ادبی افق پر صرف دارالعلوم سے ہی اتنے سارے نام مل جائیں گے کہ انھی کے شعری اور ادبی محاسن ومحامد کا شمار مشکل امر ہوگا۔ مولانا قاسم نانوتویؒ، مولانا یعقوب نانوتویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ، مولانا اعزاز علی امروہویؒ، مولانا نسیم احمد فریدیؒ، قاری طیبؒ، حامد الانصاری غازیؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عامر عثمانیؒ، علامہ تاجور نجیب آبادیؒ، مفتی کفیل الرحمٰن نشاط عثمانیؒ، مولانا کفیل احمد علویؒ، ایم آر قاسمی، شاہین جمالی وغیرہ ایسے نام ہیں، جنھوں نے عمدہ اشعار کہے ہیں۔ معانی بھی اعلی ہیں اور الفاظ بھی ادبی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے ہیں۔

مولانا افضال الحق جوہرؔ قاسمی کے اشعار شعلہ بھی ہیں اور شبنم بھی۔ ان کے اشعار میں زندگی کی رمق ہے۔ حالات حاضرہ اور سیاسی شکست وریخت پر گہرا طنز ہے۔ ان کی نعت عشق نبوی سے سرشار ہے۔ قلب حب نبوی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کے اشعار کیا اور کیسے دونوں کا بہترین مجموعہ ہیں۔ ان کے نظمیں بھی روانی اور برجستگی میں لاجواب ہیں اور غزلیں بھی ایسی ہیں کہ وہ معانی کا بحر بے کراں معلوم ہوتی ہیں۔ مضامین میں صفائی وسادگی ہے، مگر ان میں تغزل کی فراوانی بھی ہے۔ نظریاتی اظہار کے باوجود فنی لوازم سے سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔ ایک ایک شعر میں معانی کا

جہاں چھپا ہوا ہے۔ آپ غور سے ان کے اشعار کا مطالعہ کریں تو کہیں اقبال کی خودی سانس لیتی نظر آئے گی اور کہیں اقبال کے مردِ مومن سے ملاقات ہوگی، کہیں فیض احمد فیض کی شعلہ سنجی کا گماں گزرے گا اور کہیں غالب کے فلسفیانہ طرزِ اظہار سے ہم آغوش ہوں گے۔ ہر شاعر کی طرح انھوں نے اساتذۂ اردو ادب اور کلاسیکی شعرا کے طرزِ سخن کی بھی پیروی کی ہے۔

ہر شعر کی معنوی اور موضوعی پرتوں کی تحقیق اور اس پر بحث و تمحیص طوالت کا سبب بنے گی، اس لیے متفرق طور پر کچھ اشعار درج کرتا ہوں، دیکھیے شاعر کی پرواز کہاں تک ہے۔ یہاں دیو مالائی اساطیر کا تو ذکر نہیں، مگر اردو کی لفظیات، تلمیحات و تشبیہات اور استعارات کا ایک جہان سانس لیتا ہے۔

قرآن نے فرمایا مردہ انھیں مت کہنا
پھر رسم عزا کیسی! اک فتنہ نیا اٹھا

اشارے پر عمر کے نیل کی موجوں میں طغیانی
سلیمانی بھی کی ہے جس نے کی ہے ان کی دربانی

زمیں پر ہی ہوتی ہے معراج مؤمن
بس اک سجدۂ معتبر ڈھونڈتی ہے

قیس کی بے تابیوں نے نجد کو چمکادیا
ورنہ ہر وادی میں لیلیٰ کا مکاں شیریں کا گھر

ہاں آتش نمرود کو گلزار بنادو
تا عمر تمھیں رکھیں گے یہ اہل ستم یاد

کیوں نکالے گئے استاد ملائک جوہر
کیا کوئی بات بھی تھی سجدۂ آدم کے سوا

اور ذیل کے ان کے خطیبانہ آہنگ والے اشعار میں ترقی پسندیت کی روح سما گئی ہے۔ شاید مارکسزم کے علم بردار ترقی پسندوں نے بھی غریبوں، بے کسوں اور مزدوروں کی حمایت میں اتنی پراثر اور ولولہ انگیز نظم نہ کہی ہو۔

مزدور کی رگوں میں جب خون کھولتا ہے
حاکم کی شہ رگوں میں پھر زہر گھولتا ہے
گنگا تو بہ رہی ہے دولت کی ہر سطح پر
کیوں ڈھونڈتے ہیں بچے روزی کلپ کلپ کر
ان پیٹیوں کے سر سے یہ آسماں ہٹا دو
ظالم معاشرے کو بارود سے اڑادو

ہر شاعر اور تخلیق کار مواد اپنے سماج اور معاشرے اور آس پاس سے اخذ کرتا ہے۔ کوئی مضمون آسمان سے نہیں اترتا۔ نہ ادب خلاء میں پرورش پاتا ہے۔ غزلوں کے ان اشعار میں معاصر حالات کی کش مکش پر کتنا گہرا شاعرانہ طنز کیا ہے؟ موجودہ عالمی سیاست کا کون سا جبر و تشدد اس شعر کی گرفت سے باہر ہے۔ زمان و مکان کی قید سے ماورا۔ لگتا ہے آج ہی یہ شعر تخلیقی ٹکسال سے ڈھل کر نکلا ہے۔

بجھتی ہے جس کی پیاس مرے خون سے وہی
بد قسمتی سے میرا نگہباں ہے آج کل
چلیئے گا سر اٹھا کے تو الزام آئے گا
جو بندگی کرے گا وہ نمایاں ہے آج کل
کنج چمن ہے ، دار و رسن ہے قفس بھی ہے
ملئے جہاں بھی ملنے کا امکان ہے آج کل

مولانا افضال صاحب مدرسہ کے پروردہ تھے، ان کا دل بھی مسلمان تھا اور نگاہ بھی، مگر وہ اردو کی شعری اور ادبی تاریخ اور اس کی پوری روایت سے آگاہ تھے۔ اردو کی تاریخ اور اس کی مشترکہ تہذیبی اقدار پر اتنی عمدہ نظم بعنوان ''اردو کی آپ بیتی'' انھوں نے لکھی ہے، جو میری نظر میں

اس قسم کی ساری نظموں پر کماً و کیفاً بھاری ہے۔مگر افسوس کہ اس کو کوئی اردو والا نہیں جانتا۔اقبال اشعر صاحب نے اردو کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار پر نظم لکھی تو وہ محفلوں اور مجلسوں میں گائی گئی، وہ اردو کی مشہور سائٹ ریختہ کی زینت بنی،مگر مولانا کی اس بیش بہا تاریخی نظم کا ایک شعر بھی کسی کی زبان پر نہیں۔حالاں کہ ان کی نظم تاریخی تناظر میں بڑی معنویت اور تہداری رکھتی ہے۔اور مولانا کو اقبال اشعر پر تقدم زمانی (الفضل للمتقدم) کا رتبہ بھی حاصل ہے۔دیکھیے اردو سے متعلق اس مایۂ ناز نظم کے چند اشعار:

دلی کی چاندنی میں تو پھولی پھلی ہوں میں
پہچان لو کہ آج وہی لاڈلی ہوں میں
بھیجے تھے میں نے ذوق کے ہاتھوں ظفر کو پھول
سہرے میں گوندھتے ہوئے غالب گئے تھے بھول
ہندی تو میری ماں ہے ، سہیلی ہے فارسی
تلگو میری بہن ہے تو پشتو میری چچی
حافظ کی بھانجی ہوں تو ہوں خیام کی بہو
میں بیربل کی چھیڑ ہوں ملا کی گفتگو
خسرو کو بھی سکھائی تھیں میں نے پہیلیاں
اب تک ہیں ہر زبان میں میری سہیلیاں

اور آخری بات یہ کہ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی علم وفن اور شعر وادب کی جس دنیا کے باسی تھے، وہ ہم جیسوں کے خواب وخیال کی باتیں ہیں۔وہ شاعر وادیب،مصنف ومؤلف اور معلم ومربی ہونے کے ساتھ کئی دوسرے شعبوں میں بھی اشتغال وانہماک رکھتے تھے۔ان میں تنظیمی امور کی نگرانی اور قیادت وسیاست کا ملکہ بھی تھا۔میں کیا اور میری بساط کیا کہ ان کی کسی کتاب یا کسی شعری مجموعہ پر کچھ اظہار خیال کروں۔مجھے شعر وادب، وزن وقافیہ اور اس کے شرائط کا بھی پختہ علم نہیں،بس نصاب کی حد تک کچھ چیزیں پڑھی ہیں،انھیں ہی حرف مکرر کی طرح دہراتا اور منطبق کرتا رہتا ہوں۔مجھے تو کچھ لکھتے ہوئے نہ صرف ان کی روح سے، بلکہ تمام اہل نظر سے شرم آرہی ہے کہ

روز آخرت میں انھیں کیا منہ دکھاؤں گا اور شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے اہل نظر اس بے مایہ کی اس جرأت و گستاخی کو کیا نام دیں گے۔ پیر خود فقیر تو درگاہ کہاں سے لگانے بیٹھ گیا۔ اور دوسرے یہ کہ شرم کے احساس کے ساتھ صرف اسی جذبے سے یہ چند باتیں لکھ دی ہیں کہ پورا مضمون نہ سہی کوئی ایک جملہ ہی دوران تحریر کام کا آجائے تو میرے حق میں مرحوم شاعر کی شفاعت کا سبب بن جائے گا۔

❑❑❑

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی
یادوں کے آئینے میں

مولانا محمد خبیب صاحب فتح پور تال نرجا مئو

بچپن میں جن عظیم لوگوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کے کردار و گفتار کی خوشبو سے اپنے ذہن و دماغ کو معطر کرنے کا موقع ملا ان میں ایک معروف ومشہور نام مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کا بھی ہے۔ ابھی شعور نے انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہی تھا اور میدان علم میں قدم رکھا ہی تھا کہ مولانا مرحوم کی ''دلائل حنفیہ'' نہ جانے کیسے ہاتھ لگ گئی۔ کتاب کا مطالعہ کیا، کچھ باتیں سمجھ میں آئیں اور کچھ باتوں کے سمجھنے کے چکر میں عقل ٹھوکر کھا کر گری۔ کتاب کے مطالعہ سے مولانا کی علمیت، عظمت و فقاہت اور دیدہ وری کا بخوبی اندازہ ہوا۔ مولانا سے بار بار ملاقاتیں ہوئیں، ملاقات کا ہر تاثر یہی رہا کہ مولانا مرحوم بلاشبہہ ایک سادہ لباس اور سادہ مزاج انسان ہیں۔ کسی بھی زاویہ سے نہیں لگتا تھا کہ وہ علم وعمل کی اس بلندی پر ہیں، جہاں تک پہونچنے کے لیے عمریں درکار ہوتی ہیں۔ جتنی دیر مولانا کے قریب ہوتا تو میری نظریں ان کے سراپا اور چہرے کا طواف کرتی رہتیں۔ اور میں جب وہاں سے اٹھتا تو خود کو نئی بصیرت و بصارت سے معمور پاتا۔

مئو کی علمی وروحانی فضا میں علمی سفر کا آغاز ہوا، محنت، لگن، شوق، جذبۂ جستجو اور تشنگی علم نے از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کے سفر پر مجبور کیا۔ اس تعلیمی سفر میں خاک سے کندن بننے اور اعلی وارفع چوٹیوں کو سر کرنے کا جذبہ موجزن تھا۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے کسب فیض کیا جس سے دین وملت اور ملک وقوم کی خدمت کے جذبے میں اضافہ ہوا۔ شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی

کے التفات وعنایت نے شعروادب کی چاشنی سے آشنا کیا اور شخصیت وکردار سازی میں چار چاند لگائے۔ علمی تڑپ وشوق نے لاہور کی گلیوں کی سیر کرائی اور وہاں علم وفن کے چشمۂ صافی سے سیراب ہوئے۔ درس وتدریس کا عمل عمر کے آخری مرحلہ تک جاری رہا۔ جب تک صحت وتندرستی نے وفا کی کوئی کوتاہی نہ کی۔ تدریس کا آخری پڑاؤ دارالعلوم گورکھ پور رہا۔ وہ ایسے مینارہ علم وادب تھے جس کے کئی قیمتی پتھر آج بھی علمی وعملی دنیا میں اپنی تابانی بکھیر رہے ہیں، اوران کے دم سے شعروادب، خانقاہ ومدرسہ اور فقہ وفتاوی کی راہیں روشن اور منور ہیں۔

درس وتدریس کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ مولانا کا قلم بھی البیلی سج دھج کا تھا۔ تحریریں شستہ بھی ہوتیں اور پختہ بھی۔ فکر انگیز بھی اور درد انگیز بھی۔ ان کی تحریروں میں عمیق مطالعہ کی دھمک بھی ہوتی اور وسیع مشاہدہ کی چمک بھی۔ سینکڑوں کو قلم پکڑنا سکھایا، اور بہتیروں کو خطابت کی باریکیاں سمجھائیں۔ ماہنامہ ''ترجمان دارالعلوم'' کے ایک عرصہ تک آپ مدیر مسئول رہے۔ آپ کی ذات سے اس پرچہ کو اعتبار حاصل ہوا۔ مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی کے نام سے موسوم خاص نمبر آپ ہی کی کوششوں اور محنتوں سے بڑی آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آیا، جس کے لیے آپ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ماہنامہ ''دانشور'' گورکھ پور کی ادارتی ذمہ داری بھی کچھ عرصہ کے لیے آپ کے سپرد کی گئی اور آپ نے بحسن وخوبی اس فریضہ کو نبھایا۔ مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے کئی تصانیف مولانا کے قلم سے یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئیں۔ جس میں ''یسریٰ'' جو کہ منطق کے اصول پر مبنی ہے۔ ''اسوۃ الحبیب'' جس میں اخلاقیات کے موضوع پر مختصر حدیثیں ہیں۔ ''دلائل حنفیہ''۔ ''شرعی پنچایت کے اصول'' قابل ذکر ہیں۔

مولانا کی زندگی کا ایک خوبصورت اور اجلا عنوان شاعری ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو اپنی فکری جولان گاہ بنایا۔ تخلص جوہر اختیار کیا اور اردو کے شعری سرمایے میں اپنے فکری جواہرات سے اضافہ کیا۔ آپ کی غزلوں میں خوبصورت احساسات کی فراوانی ہے تو نظموں میں غم دوراں کی تڑپ وشکایت۔ شاعری میں زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کی ترجمانی ہے۔ جو کچھ لکھا پوری قوت پوری توانائی، پورے وقار اور پورے اعتبار کے ساتھ لکھا۔ آپ کے دو شعری مجموعے ہیں۔ ''نجم سحر'' ان کے شعری سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اور ''دار ورسن تک'' میں فکر کی پرتیں کھلیں اور فکر کے آسمان پر

شعر وسخن کی نئی قندیلیں روشن ہوئیں۔شعر وشاعری کی داستان بیان کرتے ہوئے مولانا خود ''دارو رسن تک'' کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں:

''۱۹۳۸ء میں غالباً پہلی غزل لکھی تھی، ایک شعر اب تک نہیں بھولا:

اگر جذب محبت ہے تو وہ خود سمجھ لیں گے
کبھی تصویر آئینے کو دکھلائی نہیں جاتی

دیوبند پہونچا تو عامر عثمانی، خیری غازی پوری، سعید سلطان پوری کے ساتھ شعر وشاعری کا چرچا رہا۔ ایک مشاعرے میں پہلی مرتبہ غزل اس وجہ سے پڑھی کہ عامر عثمانی کا اصرار تھا اور روش صدیقی صدارت فرمارہے تھے۔اس شعر پر خوش ہوگئے:

قفس میں بند کیا ہوتے قفس سارا چمن ہی ہے
کوئی صیاد ہے شاید لباس باغبانی میں

بہرائچ میں رافت، جمال وصفی اور شوق بہرائچی کے ساتھ رہنے سے شاعری لازم سی ہوگئی تھی۔میری شاعری کا موضوع ہے غم دوراں۔جب عمرہ پہ جاتا ہوں تو نعت ہوجاتی ہے۔ کہیں دل پر چوٹ پڑتی ہے تو نظم یا غزل بن جاتی ہے۔'' (دار ورسن تک)

شاعری کے لیے آپ کو بہتر ماحول میسر آیا۔ جنگ آزادی کا ماحول گرم تھا، ملک کی تحریک آزادی کے ہنگاموں میں انقلابی نظمیں کلیدی کردار ادا کررہی تھیں۔ان کی نظمیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے درد والم کی ہر اذیت کو سہا ہے اور غربت وافلاس اور مایوسی ومحرومی کی ہر تاریکی سے وہ بہت قریب سے گزرے ہوں۔جنگ آزادی کے عنوان سے اپنا درد یوں بیان فرماتے ہیں:

یہ تاحد نظر مجبور انسانوں کا جنگل ہے
ستم کس پر نہیں ہوتا مگر ان پر مسلسل ہے
لبوں پر مسکراہٹ ہے مگر سینوں میں ہلچل ہے
ابھی جینے کے دم خم ہیں ابھی بازو میں کس بل ہے

۱۹۴۲ء میں آزادی کی تحریک ''بھارت چھوڑو'' سے مولانا بھی متاثر ہوئے۔ان کے یہ

اشعار دیکھیں:

اک نئی صبح ، نیا جوش ، نیا دور چلے
تب وہ سمجھیں گے کہ دریا نہیں منجدھار ہیں ہم
زندگی آئے گی ساحل نہیں طوفانوں سے
جیل سے دار پہ جانے کو بھی تیار ہیں ہم
یوں تو آزادیٔ اقوام پہ سب لڑتے ہیں
آج آزادیٔ انساں کے طلب گار ہیں ہم
راہ آزادی کا ہر سنگ گراں ہٹ جائے
ہم نہیں سیل رواں ، وقت کی رفتار ہیں ہم

جنگ آزادی کی تحریک میں پیش پیش اور سر دھڑ کی بازی لگانے والے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یوں گویا ہیں:

گرمیٔ ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے
ہر نفس ہے جس کا موج تہہ نشیں کا اضطراب
رہنمائی کے لیے ہے نقش پائے بوالکلام
جس کا کوہ آہنی کوہ ہمالہ کا جواب

شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر ان کی شاعری نے یوں اشک برسائے:

اٹھ گیا جوش ، شہنشاہ سخن ، شان ادب
انقلابات کے طوفاں کا گماں بھی نہ رہا
دے کے الفاظ کے پھولوں کو معانی کی بہار
ہر روش چپ ہے کہ وہ سحر بیاں بھی نہ رہا
مدتوں روئیں گے اب بانوئے اردو تجھ کو
لٹ گیا صحن چمن ، زور فغاں بھی نہ رہا

اس کے علاوہ انہوں نے بے مثل موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ ہر عنوان اچھوتا، البیلا، اجلا، پاکیزہ، دلفریب اور دلکش ہے۔ سراپائے شیخ الاسلام، اردو کی آپ بیتی، ترانہ ملت، دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جشن، بارہ برس کا لڑکا رکشہ چلا رہا ہے، بے وفا بازوئے قاتل کو دعا دی جائے، نگاہ وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں جوہر نے اپنی فنکاری کے جوہر دکھلائے ہیں، اور ہر عنوان کو قاری کے ذہن سے قریب کر دیا ہے۔ موضوعات کے تنوع کے باوجود نہ کہیں اضمحلال، نہ تھکاوٹ نہ کہیں فنی لڑکھڑاہٹ، نہ کہیں عروض کی لغزش، ہر جگہ شعریت اور ادبیت موجود۔ ان کی نظمیں جن عناصر سے ترتیب پاتی ہیں ان میں عصری آگہی، حمیت، غیرت اور احتجاج کی آمیزش ہے۔ ۱۹۷۹ میں سفر حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔ مقامات مقدسہ کے اس سفر پر عشق و محبت کے جذبات امنڈ آئے۔ ملاحظہ فرمائیں:

وہ ہستی جس کی ہر جنبش میں اک الہام ربانی
ہر ایک سجدہ سے حاصل تھی جسے معراج جسمانی
وہ کیا جذبات تھے، نقشے بدل ڈالے زمانے کے
عزائم نے سکھادی گلہ بانوں کو جہاں بانی
تمہارے نام لیوا آج کل ہیں دربدر لیکن
تمہارا نام لے کر مدتوں کی ہے جہاں بانی

فکر و نظر کی بلند و بالا چٹان سے نظموں کا دریا بھی بہتا رہا اور غزلوں کا خوبصورت آبشار بھی۔ لیکن خاص بات یہ رہی کہ کسی بھی موقع پر نظموں کے آہنگ نے غزلوں کی نازک مزاجی کو ٹھیس نہیں پہونچائی اور نہ ہی غزلوں نے کبھی نظموں کی سنگلاخ وادیوں میں قدم رکھنے کی کوشش کی۔ دونوں میدانوں میں ان کی انفرادیت کی خوشبو اور رنگ جداگانہ رہے۔ غزل کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

ہوس ہے وہ محبت جس کو اہل غم نہیں سمجھے
قیامت ہے کہ ساری عمر تم کو ہم نہیں سمجھے

چراغاں کرلیا ہے تم نے میرے خون ناحق سے
تو پھر یہ چشم نم کیا ؟ ہم اسے ماتم نہیں سمجھے
کہیں پانی ، کہیں آنسو ، کہیں موتی کہیں شبنم
تری آنکھوں کے اتنے زاویوں کو ہم نہیں سمجھے

غزل کے آہنگ میں آئے دن کے فسادات اور عصری مسائل کا تذکرہ کچھ یوں نظر آتا ہے:

اہنسا کے پجاری ، آستیں پر خون کیسا ہے
سیاست کا بہت پر پیچ ہوجانا بغاوت ہے
جلیں بازار، تڑپیں عصمتیں ، ہوں بے کفن لاشیں
مگر اس جشن کی تصویر کھنچوانا بغاوت ہے
خدا نے مجھ کو جوہرؔ فطرت آزاد بخشی ہے
میں باغی ہوں اگر آزاد رہ جانا بغاوت ہے

ملتا نہیں جو سب سے یہ میری خطا نہیں
پھولوں کی چوٹ کھانے کو جی چاہتا نہیں
کچھ آنسوؤں کی بات ہے کچھ دھڑکنوں کا راز
مدت ہوئی کہ اور کوئی سلسلہ نہیں

ذرہ ذرہ گوش بر آواز
مر مٹا کوئی مدعا کے لیے
کل تو آنکھوں میں تھا نشہ کتنا
آج آنسو ہیں التجا کے لیے

جذب کامل تھا ، ورنہ پروانہ
جان کیوں دیتا بے وفا کے لیے

میرا گھر لٹتا رہا سب چپ رہے
ان کو چھینک آئی قیامت ہوگئی
قفس کیا دار تک جانا پڑے گا
بڑا ہے کام آہ ناتواں سے

مولانا کی فکری بلند پروازیوں اور شعری خوبیوں کا ایک بڑا حصہ شائع ہو چکا ہے اور ایک بڑا حصہ ان کی بیاض میں موجود ہے۔ شعری سرمایہ کے علاوہ غیر مطبوعہ قیمتی مقالات ومضامین الگ اپنی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔ مولانا تو تمام عمر علمی وعملی کاموں میں مشغول رہے، وقت ان کا ساتھ دیتا رہا مگر زندگی تھک گئی اور بالآخر ۳۰ رنومبر ۲۰۱۲ء کو مولانا کا ساتھ چھوڑ دیا۔ رگھولی کی وہ سرزمین جس کو مولانا نے عزت وافتخار بخشا، وہیں خاک کی چادر اوڑھ کر ابدی نیند سو گئے:

زمیں لوگوں سے خالی ہورہی ہے
یہ رنگ آسماں دیکھا نہ جائے

❑❑❑

حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہؔر قاسمی
اور
ان کی تصانیف کا تعارف

مولانا محمد عابد اعظمی
جامعہ شیخ الہند قاسم آباد انجان شہید

استاذ العلماء حضرت مولانا افضال الحق جوہؔر قاسمی نور اللہ مرقدہ ان علمار بانیین میں سے تھے جنہیں اللہ نے ذہانت وفطانت، حق گوئی و بے باکی، تحریر وانشا پردازی، افراد سازی ومردم گری، شاعری ونثر نگاری اور تعلیم وتدریس کی بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ بیک وقت بہترین مدرس ومنتظم، بے باک صاحب قلم وانشا پرداز، بے مثال شاعر ونثر نگار، نکتہ رس مفسر و محدث، دین کے معاملہ میں بے لچک اور متصلب، مسلک دیوبند کے بے لوث شارح وترجمان تھے۔ زود نویسی، اختصار نویسی اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بات کہنا ان کا فن تھا۔ ان کا قلم بہت سیال تھا سینکڑوں صفحات پر ان کے قلم کی جولانیوں کے نقوش ثبت ہیں۔ مختلف ومتنوع موضوعات پر انہوں نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، بلاغت، معانی، شاعری حتی کہ لطائف وواقعات پر بھی ان کے نوک قلم نے گل بوٹے نقش کیے ہیں۔ ان کی دستیاب مطبوعہ کتابوں کا ایک مختصر جائزہ اس مضمون میں پیش کیا جائے گا۔

مولانا افضال الحق جوہؔر قاسمی کے نام، ان کی شخصیت اور ان کی ذات سے عقیدت کی ابتدا اس شعور وتمیز کے آغاز کے ساتھ ہی ہے۔ حضرت مولانا اور ان کے شاگرد رشید والدنا المعظم

حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ جب مدرسہ ریاض العلوم گورینی جون پور میں مصروف تدریس تھے اور بندہ ابھی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھا، گھر میں حضرت مولانا چرچا عام تھا۔ ہم سب بھائی بہن انہیں ''دادا'' کہا کرتے تھے، ان کا تعلق بھی والد صاحب کے ساتھ بیٹوں جیسا، اور ہم لوگوں کے ساتھ پوتوں جیسا تھا۔ مدرسہ کی چھٹی کے اوقات میں ان کے یہاں جانا، ان کا شفقت و محبت کا معاملہ کرنا، بچپن کی شرارتوں کو انگیز کرنا بلکہ خوش ہونا، بچپن کے وہ سنہرے لمحات ہیں جو لوح قلب پر اس عظیم انسان کی عظمت و محبت کا نقش قائم کیے ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا تعلیم و تدریس کے تعلق سے جہاں بھی رہے ہیں حضرت والد صاحب ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً اپنی اولاد کو لے کر حاضر ہوتے رہے ہیں۔ گورکھ پور کے زمانہ قیام میں گورکھ پور اور ان کے وطن مالوف رگھولی ضلع مئو بارہا والد صاحب کے ساتھ خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ والد صاحب حضرت مولانا کا بے حد احترام و تعظیم کرتے تھے، ہمیشہ ان کے سامنے دو زانو مؤدب بیٹھتے تھے۔ جب تک مجلس میں رہتے سراپا ادب اور گوش برآواز رہتے۔ حضرت مولانا کا تکلم بہت صاف نہیں تھا، اجنبی کے لیے ان کی بات سمجھنا مشکل ہوتا لیکن والد صاحب ہونٹوں کی حرکت اور لہجے ہی سے بات سمجھ لیتے تھے۔ خود فرماتے تھے کہ'' مولانا کیا فرمارہے ہیں میں صرف مولانا کے لبوں کی جنبش سے ہی جان لیتا ہوں۔'' امروہہ کی زمانہ طالب علمی کے تعلق سے ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

> مولانا کی تقریر کی زبان صاف نہ تھی، آواز بھی باریک تھی اور عجلت میں جملے بھی پورے ادا نہ ہوتے تھے، انداز تقریر پہلے تو عجیب سا لگا، لیکن جلد ہی طبیعت مانوس ہوگئی، میں مولانا کی تقریر تو تقریر اشارات بھی سمجھنے لگا۔'' (حکایت ہستی: ص ۲۵۵)

مولانا ذہانت و ظرافت کے پتلا تھے ان کی تحریر اور گفتگو میں موقع بموقع ظرافت و مزاح کے عناصر کی شمولیت بخوبی ملتی ہے۔ ایک مرتبہ والد صاحب کے ساتھ مولانا کی خدمت میں دارالعلوم گورکھ پور حاضری ہوئی۔ جب واپس ہونے لگے تو مولانا رخصت کرنے کے لیے کمرے سے باہر تشریف لائے اور مسکراتے ہوئے کچھ ارشاد فرمایا والد صاحب بھی مسکرارہے تھے، ہم لوگوں کے پلے کچھ نہیں پڑا، بعد میں میں نے والد صاحب سے پوچھا کہ حضرت کیا فرمارہے تھے؟

بتلایا کہ پوچھ رہے تھے کہ ''تمہار چوپایہ کہاں ہے؟ وہ چار پہیۓ والی گاڑی کو چوپایہ کہتے ہیں کہ جس گاڑی سے آۓ ہو وہ کہاں ہے؟''

مولانا کی زبان اگرچہ ناصاف تھی لیکن علم وفن پر قدرت بے پناہ تھی اور گفتگو میں ظرافت ان کی باتوں کی جان ہوا کرتی تھی۔ والد صاحب ان کے انداز تدریس کے متعلق رقم طراز ہیں:

مولانا غضب کے ذہین تھے، باتوں سے باتیں نکالنا ان میں ترتیب پیدا کرنا، دلائل کو سجا کر پیش کرنا مولانا کا خاص فن تھا۔ یہ فن ترمذی شریف کے درس میں زیادہ ظاہر ہوتا تھا، میں ان کی باتیں بہت انہماک سے سنتا اور بہت فائدہ ہوتا، سوال کرنے کی نوبت کم آتی اس قدر مرتب اور مدلل تقریر ہوتی کہ سوالات خود بخود حل ہوتے رہتے۔ ان کے سبق میں بیٹھ کر احساس ہوا کہ علمی اور دماغی فوائد کے لحاظ سے صرف وقت گزاری نہیں ہے، بلکہ علم و ہنر کے بیش قیمت جواہر ہاتھ آ رہے ہیں۔'' (حکایت ہستی: ص ۲۵۵)

مولانا کا قلم بہت سیال تھا، انہوں نے بہت کچھ لکھا، مطبوعہ تصنیفات وتالیفات کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن مضامین ومقالات کی خاصی کثیر تعداد ہے، جو مختلف مجلوں اور رسالوں میں شائع ہوۓ ہیں۔ مجلّہ ''ترجمان دارالعلوم'' دہلی اور رسالہ ''دانشور'' گورکھ پور کے تو وہ مدیر تھے جن میں ان کے مستقل مضامین شائع ہوتے تھے۔ اداریہ کے علاوہ درس قرآن، درس حدیث اور حالات حاضرہ ان کے قلم کے مستقل عنوان تھے۔ جب تک بیماری اور بڑھاپے نے اپنی گرفت میں لے کر بستر استراحت تک محصور اور محدود نہیں کر دیا، ان کا قلم برابر رواں دواں رہا۔ ان کی مطبوعہ دستیاب تصانیف کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

(۱) اسوۃ الحبیب (دو حصے)

یہ کتاب اخلاقیات سے متعلق احادیث کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مدارس عربیہ کے عربی چہارم وپنجم کے درجات کے نصاب کے طور پر مرتب کی گئی ہے۔ مولانا کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہمارے مدارس میں معقولات، عربی ادب، فقہ، حدیث اور قرآن کا ایک مکمل نصاب ہے جو پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن طلبہ کی اخلاقی تربیت کے لیے الگ سے

کوئی مرتب نصاب نہیں ہے جس سے ان میں اسلامی شعور، دینی مزاج پیدا ہو سکے۔ کتاب کے مقدمہ میں حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''ابتدائی دور میں ہمارے اکابر واسلاف جو اتباع سنت کا مجسمہ اور اسلامی تربیت کے لیے بہترین نمونہ تھے، ان کی صحبت، ان کی رفتار وگفتار اور ان کی نگاہوں کے دباؤ سے بچوں کا علم عمل بن جاتا تھا۔ لیکن آج ہمارے مدارس ایسے نمونوں سے خالی ہوتے جا رہے ہیں، اس لیے عرصے سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ علمِ اخلاق وآداب کا ایسا کوئی مجموعہ مرتب کیا جائے جس میں معلم اخلاق سرور دو عالم ﷺ کی حیات طیبہ، آپ کی تعلیم، آپ کی تربیت، آپ کا تزکیہ اور صحابہ کرام کا اسے قبول کرنا اور اپنی زندگیوں کو ان کے سانچے میں ڈھالنے کے جو واقعات ہیں انہیں مختلف ابواب میں پیش کر دیا جائے، تاکہ بچے علی وجہ البصیرت آں حضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے نقوش قدم پر چل کر اپنی زندگیوں کو سنوار سکیں۔''

کتاب کے پہلے حصے میں درج ذیل عنوانات کے تحت احادیث جمع کی گئی ہیں:

القدوم والوداع، المحاسن وآدابها، المائدة الاسلامية، الاسرة الاسلامية، اطوار الخلق، التعليم والتربية، الرجال البارزون، العلم والحكمة، الاذكار والادعية.

دوسرے حصہ میں یہ عنوانات ہیں:

العشرة الحسنة، الدعوة والارشاد، الايمان والاسلام، السياسة والانتظام، الاقتصاديات الاسلامية، الطب النبوی.

کتاب کے عنوانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرے اور دینی زندگی کے نشو ونما اور ارتقا کے لیے جن عناصر کا موجود ہونا ناگزیر ہے، ان سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے ارشادات وفرامین اور آپ کی سیرت طیبہ اور اسوہ حسنہ کے مطابق طلبہ کو ڈھال کر ایک مثالی اور آئیڈیل معاشرے کی تشکیل کا کام انجام دینا مولانا کا مطمح نظر تھا۔ فی زمانہ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مدارس کے نصاب میں اس کتاب کو شامل کیا جائے اور مولانا کے بیان کردہ طریقہ تعلیم کے مطابق اس کی تدریس کی جائے تو ان شاء اللہ آج کے بگڑے ہوئے ماحول اور معاشرت میں اس کے دوررس اور حوصلہ افزا نتائج سامنے آئیں گے۔

(۲) اسلامی ہندوستان کی عائلی مشکلات کا حل۔شرعی پنچایت یا قاضی؟:

۱۹۸۶ء میں امارت شرعیہ نے دارالقضا کے قیام کی ضرورت اور اہمیت پر ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ دارالقضا کے قیام کو مختلف مسلک ومشرب کے علما نے واجب قرار دیا ہے،اور یہ کہ امارت شرعیہ کو دارالقضا قائم کر کے قاضی مقرر کرنے کا حق حاصل ہے،اوران کے قاضی کا فیصلہ شرعی قاضی کا فیصلہ ہوگا حتی کہ قضا کی شرعی ضرورت کو پورا کردے گا۔

حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی کو امارت شرعیہ کے اس فیصلے اور کتابچے کے مشمولات پر اعتراض تھا۔ان کا نظریہ حضرت تھانوی،حضرت مدنی اور دیگر علمائے دیوبند کے اقوال وآرا کی روشنی میں یہ تھا کہ'' عائلی مسائل جنہیں کوئی غیر اسلامی عدالت طے نہیں کرسکتی بلکہ ان کے لیے شرعاً قضاءِ قاضی یعنی عدالتی فیصلہ ضروری ہے،مسلم عوام وہاں کے اہل علم اوراہل رائے کی پنچایت مقرر کر کے امام مالک کے مذہب پر اس سے شرعی فیصلہ کرائیں۔''اور ہندوستان جیسے ملک میں شرعی پنچایت کے قیام کی ضرورت کی وکالت کی۔

اس کتاب میں مولانا نے دلائل کی روشنی میں امارت شرعیہ کے موقف اوراس کے دلائل کی کمزوریوں کو ثابت کر کے اپنے مدعا کو دلائل وبراہین سے مزین کر کے مضبوطی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اورحضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی''الحیلۃ الناجزۃ'' کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ''ہندوستان جیسے ملک میں تراضی مسلمین سے قاضی کا تقرر درست نہیں ہے۔جس ملک میں تراضی مسلمین سے قاضی کو شوکت وقوت حاصل ہوجائے،وہاں تو گنجائش بھی تھی مگر اس ملک میں تقرر عام سے کچھ کام نہیں چل سکتا بلکہ ایک اختلاف جدید کا وسیع کا باب کھل جائے گا۔اس لیے اس کو صحیح کہنا کسی طرح قرین قیاس نہیں۔''اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے عدالتی مسائل کس طرح طے کیے جائیں تو حضرت تھانوی نے فرمایا کہ:

> ''اگر مسلمان حاکم نہ ہوں یا اس کی عدالت میں فیصلہ شریعت کے مطابق نہ ہوتا ہو تو پھر مذہب مالکیہ کے موافق دیندار مسلمانوں کی ایک جماعت پنچایت کر کے حسب شرائط،تحقیقات کر کے تحقیقِ کامل کے بعد فیصلہ کرے تو یہ فیصلہ قضاءِ قاضی کے حکم میں ہوگا۔''

اس کتاب مس چھ مضامین شامل ہیں۔(۱)ہندوستان میں مسلمانوں کے عائلی مسائل کون طے کرے؟(۲)تلفیق فی المذہب کی ضرورت واہمیت (۳)شرعی پنچایت کا طریق کار اور طریقہ انتخاب(۴)ہندوستان میں شرعی پنچایت کا جواز(۵)افتا اور قضاء قاضی کا فرق (۶) قاضی یا شرعی پنچایت کی آئینی حیثیت۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اس کتاب میں زیر بحث مسئلے کا مالہ وماعلیہ کے ساتھ ناقدانہ ومنصفانہ جائزہ لے کر غور وفکر کی نئی رائیں وا کی ہیں۔

(۳) یسریٰ:

یہ کتاب فن منطق میں ہے، مدارس کے ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے آسان اور عام فہم زبان میں روز مرہ کی چیزوں سے آسان مثالوں کے ساتھ لکھی گئی ہے۔جس میں منطق کی اصطلاحات،ضروری اصول، بنیادی مسائل کو بچوں کی مادری زبان میں روز مرہ کی زندگی سے دلچسپ مثالیں لا کر منطق کو زندگی میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔زبان،انداز اور مثالیں اتنی عام فہم اور دلچسپ ہیں کہ دیگر فنون کے مقابلہ میں یہ انتہائی آسان معلوم ہوتی ہے،جب کہ مدارس کے ماحول میں طلبہ کے درمیان منطق کسی ’’ھوّا‘‘ سے کم نہیں ہے۔کتاب کے مقدمہ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں کہ منطق کیا اور اسے کیسے برتا جاتا ہے؟اور مولانا کی سہل ترین زبان اور انداز کی داد دیجیے:

> ’’کوئی بچہ بازار سے ٹماٹر لا رہا ہے، آپ اس سے پوچھئے تمہارے تھیلے میں کیا ہے؟ وہ کہہ دے گا کہ ٹماٹر ہے۔لیکن اگر اس کے ساتھ آلو بھی ہے گوبھی بھی ہے تو جواب دے گا کہ سبزی ہے یا ترکاری ہے۔اسی طرح کسی کے تھیلے میں سبزی بھی ہے مصالحہ بھی ہے تو اس کا جواب ہوگا سامان ہے۔آخر ٹماٹر کی نوع چھوڑ کر ترکاری کی جنس کیوں لایا؟یا اسے چھوڑ کر سامان کی جنس بعید کیوں استعمال کی گئی؟اسی وجہ سے تو کہ ہر ایک کا نام لینا دشوار تھا۔اس وجہ سے جزئیات سے کلیات تک اس کو آنا پڑا۔اسی کا نام منطق ہے اور یہی استقراء ہے اور غور وفکر کی یہی راہ ہے۔

معلوم ہوا کہ منطق ضروریات زندگی میں سے ہے اور اسے بچے بوڑھے جوان سب بے

تکلف استعمال کرتے ہیں اگر چہ علمی زبان میں اس کے اصطلاحی نام،اس کی تعریف اور اس کے مسائل کا ایک حرف بھی نہ جانتے ہوں۔''

کتاب کا انداز یہ ہے کہ پہلے مثالوں سے بات سمجھانے کے بعد علمی تعریف بتائی گئی ہے تا کہ وہ ذہن نشین ہو جائے۔ کیوں کہ کسی فن کی اصطلاحات کی تعریف کرنا اس فن کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔

منطق کی ایک اصطلاح ''جنس'' ہے اور اس کے اقسام 'قریب' اور 'بعید' کو مثالوں سے سمجھانے کے بعد ان کی تعریف ذکر کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''طوطا، کبوتر اور مرغا پر مشترک طور سے بولی جانے والی کلی چڑیا ہے، اس لیے کہ یہ ان کی جنس ہے مگر ان تینوں کے ساتھ خرگوش ملا لو تو اب ان میں چڑیا مشترک نہیں ہے بلکہ حیوان ہونا مشترک ہے۔ اس لیے طوطا کی دو جنس ہوئی ایک چڑیا، دوسری حیوان۔ تو چڑیا طوطا کی جنس قریب ہے اور حیوان اس کی جنس بعید ہے۔ کیوں کہ دونوں اس کی بناوٹ میں شامل ہیں، اس لیے ذاتی ہیں، ایک عام ہے ایک خاص ہے۔''

''عکس مستوی'' کو اس طرح سمجھایا ہے:

''حسین نے کہا کہ طالب علم چور ہو گئے ہیں، احمد نے بات الٹ کر کہی کہ نہیں چور طالب علم ہو گئے ہیں۔ یہ عکس مستوی ہے۔

تعریف: کسی بات کو اس طرح الٹ دینا کہ ایک جز دوسرے جز کی جگہ آ جائے مگر کیفیت اور ایجاب وسلب میں فرق نہ ہو، اس کو عکس مستوی کہتے ہیں۔''

پوری کتاب اسی دلچسپ انداز اور ترتیب پر ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا ہے منطق کو آسان تر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر سبق کے بعد سوالات کا حصہ ہے تا کہ پڑھا ہوا سبق از بر اور پختہ ہو جائے۔ کتاب اتنے فطری اور منطقی انداز میں لکھی گئی ہے کہ اگر پوری توجہ سے طلبہ کو پڑھا اور یاد کرادی جائے تو مطولات کا سمجھنا ان کے لیے بے حد آسان ہو جائے۔ یہ کتاب واقعتاً اس بات کی مستحق ہے کہ مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے اور اس سے استفادہ کیا جائے۔ فن منطق کے مبادیات میں شاید ہی کوئی کتاب اتنی آسان، سہل اور جامع ہو۔

(۴) حسن معانی:

یہ کتاب زبان وادب میں بلاغت کی ایک صنف ''علم معانی'' کے اصول وقواعد اور مبادیات ومصطلحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بھی ماسبق کتاب کی طرح زبان وبیان اور انداز کے یُسر کے حسن سے آراستہ وپیراستہ ہے۔ مثالوں کو روزمرہ کی چیزوں اور دلچسپ اشعار سے مزین کیا گیا ہے۔

فعل امر کی بحث بڑے دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

''صیغہ امر بہت سے معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر اس کی اصل وضع اس لیے ہے کہ کوئی بڑا شخص چھوٹے سے کسی کام یا چیز کا مطالبہ کرے۔ جیسے پانی دو، محنت سے پڑھو، لیکن اگر نوکر سے کہو تو امر ہے، ساتھی سے کہو تو فرمائش ہے، اجنبی سے کہو تو استدعا ہے، بڑے سے گستاخی ہے، حاکم سے درخواست ہے، دشمن سے چیلنج ہے، دوکاندار سے معاملہ داری ہے، مگر ابا سے ضرورت ہے، خدا سے دعا ہے۔ قبروں سے، بتوں سے اور پتھروں سے اپنی توہین اور بے وقوفی ہے۔ اس طرح امر کا مخاطب بدل جانے سے اس کا موضوع بدل جاتا ہے اگرچہ معنی وہی رہتا ہے۔ اسی طرح شاعر جب کسی کو مخاطب کرتا ہے تو ایک ہی صیغے سے کیا کیا گل کھلاتا ہے دیکھنے کی چیز ہے۔ مثلاً:

اصرار:	ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی
تلاش:	چلی بھی جا جرس نغمہ کی صدا پہ نسیم کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا
التجا:	آجاؤ کہ اب خلوت دل خلوت غم ہے اب دل کے ڈھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے
بے حیائی:	مان نہ مان میں تیرا مہمان
دھمکی وتنبیہ:	جہاں سینگ سمائے چلے جاؤ۔ کونوا قردةً خاسئین

اظہارِ بےتعلقی: نہیں سنتے تو چولہے بھاڑ میں جاؤ

اظہارِ بےخودی: گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

علم معانی کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوری کتاب علم معانی کے گل وگلزار سے لالہ زار ہے۔ پڑھتے جایئے اور زبان وبیان کا لطف اٹھاتے جایئے۔

(۵) زور بیان:

اس سلسلے کی دوسری کڑی زور بیان ہے جو علم بیان کے اصول وضوابط پر مشتمل ہے۔ علم بیان کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

''الفاظ ومعانی کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے یا واضح کرنے یا زوردار بنانے کی ہر ممکن کوشش کا نام علم بیان ہے۔''

علم بیان کی ضرورت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''لفظوں کے استعمال، ترکیبوں کی نزاکت اور وسعت، محاوروں کی چستی ومعنویت، تشبیہات کی ندرت وشہرت اور اشارات وکنایات کے رشتے جہاں مضبوط ہوتے ہیں وہ علم معانی وبیان کا میدان ہے، جہاں زبان کی بناوٹ اور تازگی کے لیے اصول اور ضابطے آپ کی مدد کرتے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ علم بیان کے بغیر کلام میں زور، طاقت، ندرت، نزاکت اور معنویت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس کے اصول ومبادی کے جانے بغیر آدمی کلام پر مکمل طور سے قادر نہیں ہوسکتا۔ ہر زبان میں اس کی اہمیت وضرورت مسلم ہے۔ اس کتاب میں اس حقیقت سے واقف کرانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

لفظ کے حقیقی معنی چھوڑ کر دوسرا معنی مراد لینے کی چار صورتیں کلام میں رائج ہیں۔ متروکہ، مہجورہ، متعذرہ، مترادفہ۔

حضرت مولانا نے چوتھی صورت حقیقت مترادفہ کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''ایک ہی لفظ کبھی کبھی کئی معنوں کے لیے موضوع ہوتا ہے تو سوال ہوتا ہے کہ اس کو تمام

معنوں میں استعمال کریں یا کسی ایک معنی میں؟

جواب یہ ہے کہ اگر دونوں معنی متضاد ہیں تو سیاق وسباق کے مطابق ایک معنی میں استعمال ہوگا، دوسرا متروک یا مہجور ہوگا۔ یہیں سے حقیقت معکوسہ بھی پیدا ہوتی ہے۔ ہماری زبان کا یہ عجیب پہلو ہے کہ ایک لفظ جس کے لغوی معنی بھی ہیں مگر وہ استعمال ہوتا ہے تو نہ اپنے موضوع لہ کے لیے، نہ اپنے جز ولازم کے لیے، بلکہ لغوی معنی کی ضد کے لیے ہوتا ہے، اس لیے نہ حقیقت ہے نہ مجاز بلکہ حقیقت معکوسہ ہے۔ جیسے کبیر داس کو شکایت ہے:

چلتی کو گاڑی کہیں بنے دودھ کا کھویا
رنگی کو نارنگی کہیں کھڑے پیڑ کو سویا

کسی کا چلنا اور اسے گاڑ دینا دونوں الگ الگ حقیقی معنی ہیں اور تقریباً متضاد ہیں مگر چلتی ہوئی ریل کو گاڑی کہنا جھوٹ بھی ہے مذاق بھی۔ پھر بھی عوام وخواص کہتے ہیں کہ گاڑی خریدی ہے یعنی چلنے والی موٹر۔ تو بول چال نے جھوٹ کو سچ بنا دیا۔ یہیں سے حقیقت اور مجاز کا جنم ہوتا ہے۔"

(۶) نجم سحر:

(۷) دار ورسن تک:

یہ دونوں کتابیں حضرت مولانا کے شعری کلام کا مجموعہ ہیں۔ حضرت مولانا کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو شعر وشاعری بھی ہے، جوہر تخلص تھا، قادر الکلام اور عمدہ شاعر تھے، ہر صنف سخن کو برتا اور خوب برتا۔ حمد، نعت، نظم، منقبت، مرثیہ، سہرا، غزل ہر ایک میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی شاعری کے جوہر دکھلائے ہیں۔ اپنی شاعری کی ابتدا وارتقا اور اس کے موضوع کے متعلق رقم طراز ہیں:

"۱۹۳۸ء میں غالباً پہلی غزل لکھی تھی، ایک شعر اب تک نہیں بھولا:

اگر جذب محبت ہے تو وہ خود سمجھ لیں گے
کبھی تصویر آئینے کو دکھلائی نہیں جاتی

دیوبند پہونچا تو عامر عثمانی، خیری غازی پوری، سعید سلطان پوری کے ساتھ شعر وشاعری

کا چرچا رہا۔ایک مشاعرے میں پہلی مرتبہ غزل اس وجہ سے پڑھی کہ عامر عثمانی کا اصرار تھا اور روش صدیقی صدارت فرما رہے تھے۔اس شعر پر خوش ہو گئے:

قفس میں بند کیا ہوتے قفس سارا چمن ہی ہے
کوئی صیاد ہے شاید لباس باغبانی میں

بہرائچ میں رافت، جمال وصفی اور شوق بہرائچی کے ساتھ رہنے سے شاعری لازم سی ہوگئی تھی ۔مگر ۱۹۵۰ء میں گونڈہ آ کر چھوٹ گئی۔اب کبھی کبھار کچھ کہہ لیتا ہوں میری شاعری کا موضوع ہے غم دوراں۔ جب عمرہ پہ جاتا ہوں تو نعت ہو جاتی ہے۔کہیں دل پر چوٹ پڑتی ہے تو نظم یا غزل بن جاتی ہے۔'' (دارورسن تک)

مولانا کی شاعری بامقصد اور بامعنی ہوا کرتی تھی، وقتی شغل اور دل بہلانے کے لیے ان کی شاعری نہیں تھی۔ان کا مطالعہ ومشاہدہ بہت وسیع تھا، کائنات کی رنگینیوں، فطرت کی بوقلمونیوں اور زمانہ کی انقلاب انگیزیوں کا بغور مشاہدہ کر کے ان کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے تھے۔زبان و بیان پر ان کو بے پناہ قدرت تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں برجستگی بھی ہے اور دل کشی بھی، شگفتگی بھی ہے اور دل آویزی بھی، سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی، گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔وہ محض تخیلات کے پروں سے پرواز کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ مشاہدات ومحسوسات کو شعری جامہ پہنانے کا ہنر جانتے ہیں۔چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

کہیں پانی کہیں آنسو کہیں موتی کہیں شبنم
تری آنکھوں کے اتنے زاویوں کو ہم نہیں سمجھے
غرور حسن ، طاقت کا نشہ ، احساس محرومی
انہیں تینوں نے جوہرؔ ہم کو مارا ، ہم نہیں سمجھے

ہم حوادث میں رہے کوہ و بیاباں کی طرح
اور ہوں گے ترے سانچے میں جو ڈھل جاتے ہیں

تکلم برمحل ورنہ خموشی اصل فطرت ہے
ہوا جب تک نہ چھیڑے کوئی پتہ ہل نہیں سکتا

نعت سرورکونین ﷺ کے چند اشعار دیکھیں:

خاک سے پیدا نور سے بہتر جن وملائک دیکھ کے ششدر
لائے گئے جو عرش بریں پر صلی اللہ علیہ وسلم
دل گرمایا عشق جگایا جلوہ گہ حق اس کو بنایا
ڈھالے حسن وفا کے پیکر صلی اللہ علیہ وسلم
عہد نبوت فیض کا موسم سامنے سب کے دونوں عالم
آئینہ حق قلب منور صلی اللہ علیہ وسلم

(۸) مساوات:

۱۷ر صفحات کا یہ کتابچہ ترجمان اسلام شوکت منزل غازی پور نے ۱۹۸۴ء میں شائع کیا ہے، جس میں انسانوں کے درمیان مساوات اور برابری کے حوالے سے قرآن وحدیث اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی اہمیت وضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ نسلی مساوات، قانونی مساوات، کھانے پینے میں مساوات، کفن دفن میں مساوات، میدان جنگ میں مساوات، شادی بیاہ میں مساوات، جیسے عنوانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ ایک مرتبہ شائع ہونے کے بعد اب نایاب ہے۔

(۹) امالی شیخ الاسلام (تین حصے)

اس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کے درس ترمذی کی تقریریں مولانا نے بڑے اہتمام سے محفوظ کی ہیں۔ والدنا المعظم حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی علیہ الرحمہ اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے درس ترمذی کی کئی سال کی قلمی کاپیاں، جوانھوں نے جمع کررکھی تھیں، جو حضرت شیخ کے ذہین تلامذہ نے دوران درس

نوٹ کررکھی تھیں،مولانا ان سب کو بغور پڑھتے، پھران سب کی روشنی میں ایک جامع اور مرتب تقریر تیار کرتے، الفاظ وکلمات حضرت شیخ ہی کے رکھتے، کہیں کہیں ترتیب درست کرنے کے لئے ضروری لفظ بڑھاتے۔ بہت محنت سے یہ کام کرتے اور درس ترمذی میں اس سے کام لیتے، اس کے لئے حوالہ اور مراجع کا مسلسل مطالعہ کرتے۔کتاب الحج تک غالباً یہ سلسلہ مکمل ہوگیا تھا، اس کی ایک قسط مولانا نے شائع بھی کی تھی مگر باقی ماندہ حصہ چھپ نہ سکا۔مولانا کے ذخیرہ کاغذات میں ان شاءاللہ محفوظ ہوگا، اخلاف کی ذمہ داری ہے کہ یہ گرانمایہ علمی خزانہ منصۂ شہود پر لایا جائے۔"(سراپا اعجاز:ص۴۵۴)

(۱۰) دلائل حنفیہ:

اس میں احناف کی طرف سے غیر مقلدین کے اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ایک مرتبہ طبع ہونے کے بعد اب نایاب ہے۔

❑❑❑

مرد خود آگاہ و خدا مست
مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

محمد عرفات اعجاز اعظمی

اے کہ تو مجموعہ خوبی.......:

مولانا محمد افضال الحق صاحب اخاذ ذہن کے سلیم الطبع ،غیور انسان تھے۔مضبوط اعصاب مستحکم قوت فیصلہ اور غیر متزلزل قوت ارادی کے مالک تھے۔ جفاکشی اور خلوص ومحبت اور ملت اسلامیہ کے تئیں دردمندی ودل سوزی ان کی ذات میں رچی بسی تھی۔شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے شرف شاگردی کی نسبت رکھتے تھے اور ان سے اس قدر والہانہ تعلق ومحبت اور عقیدت تھی کہ انہیں کے نقوش قدم کا تتبع کرتے اپنی پوری زندگی گزاردی۔ان کی طرف سے تفویض کیے گیے کاموں کو تادم حیات فریضہ کی طرح ادا کیا۔حضرت شیخ کے تعلق سے مولانا کا والہانہ پن دیکھنا ہوتو اس خاص نمبر میں شامل مولانا کی مختصر اور ناتمام آپ بیتی ’’دارالعلوم دیوبند میں دو سال‘‘ ملاحظہ کیجیے کہ کس طرح عقیدت ومحبت اور بے ساختگی کے ساتھ حضرت شیخ کے تذکرہ سے اپنی آپ بیتی کو سجایا ہے۔

مولانا کی ذات اور ان کے کمالات وصفات اگر انہیں کے لفظوں میں کہا جائے تو ’’بے پناہ‘‘ تھے۔وہ بیک وقت کئی جہتوں میں کام کرنے والے انسان تھے۔رسمی فراغت کے بعد سے یعنی ۱۹۴۲ء سے ضعف وکمزوری اور بیماری کے شباب تک یعنی ۲۰۰۸ء تک مسلسل تدریس میں لگے رہے۔تدریس کے ساتھ اسفار کا سلسلہ بھی اخیر تک جاری رہا۔سفر تو کہنا چاہیے کہ ان کی خمیر میں

شامل تھا۔سفر ان کی زندگی کے کسی حصے کا ارتعاش نہیں بلکہ ان کی پوری عمر کا تسلسل تھا۔ان کے اسفار محض ہوا خوری یا تبدیلی آب ہوا یا ذوق سفر کی تسکین کے لیے نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے ہر سفر کا محرک ملت اسلامیہ کا درد یا کوئی نہ کوئی سوز ہوا کرتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ دوران سفر آرام کے لیے نہ ریزرویشن کی دردسری تھی اور نہ ہی بیٹھنے یا لیٹنے کے لیے سیٹ کی مغز ماری۔جمعرات کا دن ہے، سبق پڑھا رہے ہیں، چھٹی ہوئی، بیگ اٹھایا اور دہلی کے لیے نکل گئے۔اس کے لیے نہ کوئی پلاننگ اور نہ ہی کوئی اعلان واطلاع۔شاگرد واحباب نے پوچھ لیا کہ حضرت کہاں جا رہے ہیں؟ بہت ہی سادگی سے فرمادیا کہ ''دہلی جا رہا ہوں، فلاں کام سے، سنیچر تک واپس آجاؤں گا۔'' یہ ایک دن کی بات نہیں بلکہ اکثر وبیشتر یہ وقوعہ ہوتا ہی رہتا تھا۔کسی نے ریزرویشن کے بارے میں پوچھ دیا تو بہت سادے انداز میں فرمادیا کہ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟ شاہ گنج سے جنرل ٹکٹ لے کر بیٹھ جاؤں اور دہلی اتر جاؤں گا، اور دہلی سے بیٹھوں گا شاہ گنج اتر جاؤں گا۔''

ایک مرتبہ والد صاحب حضرت مولانا کی خدمت میں موجود تھے۔درمیان کلام حیدرآباد جانے کی بات آگئی تو مولانا نے اپنی لکنت زدہ زبان سے خاص انداز میں فرمایا کہ ''ایں حیدرآباد جانا کیا ہے حیدرآباد جانا کیا ہے، ارے مغل سرائے سے بیٹھے حیدرآباد اتر گئے، وہاں جو کام کرنا ہوا کیا، پھر حیدرآباد سے بیٹھے مغل سرائے اتر گئے۔اس میں مشکل کیا ہے اور سوچنے والی کیا بات ہے؟'' والد صاحب جب ان کے پاس سے اٹھے تو فرمایا کہ دیکھے کتنی آسانی سے مولانا حیدرآباد جا کر واپس بھی آگئے۔یہ صرف ان کی زبان نہیں بلکہ ان کا حال بھی یہی ہے۔ان کے لیے حیدرآباد جانا ایسے ہی ہے کہ یہاں سے بیٹھے وہاں اتر گئے اور وہاں سے بیٹھے یہاں اتر گئے۔

مولانا کے سفر زیست کی ایک سمت شاعری بھی ہے۔یہ کہنا تو شاید صحیح نہیں ہوگا کہ انہیں شاعری سے شغف تھا مگر طبیعت کی موزونیت کی وجہ سے اس طرف بھی کچھ نہ کچھ التفات ضرور رکھتے تھے۔مولانا نے اشعار کہے اور خوب کہے۔مولانا کی شاعری روایتی قسم کی گل وبلبل اور رخسار وعارض والی نہیں ہوتی تھی۔ان کی شاعری مقصدی اور بامعنی ہوا کرتی تھی۔وہ اپنے کلام سے سکہ بند ادبا کی طرح صرف زبان وادب اور اپنے مالوف نظریات کی خدمت نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی شاعری اس سے بلند تر مقاصد کے لیے ہوا کرتی تھی۔وہ اپنے کلام سے زبان وادب

کے ساتھ وطن اور قوم وملت کی بھی خدمت کرنا چاہتے تھے۔اور خدا نے ان کی ذات میں یہ صلاحیت رکھی بھی تھی کہ وہ ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے اپنے کلام موزوں کا استعمال کریں۔

اردو ادب کی زمرہ بندی اور تحزبیت مثلاً ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت وغیرہ کے اصول وضوابط اور قواعد وقوانین سے مولانا کو شاید بس واجبی سی واقفیت رہی ہو۔ کیوں کہ مولانا کی خدمت کا میدان الگ تھا اور یہ وادی دوسری ہے۔ان کی خدمات کے تنوع اور رنگارنگی کو دیکھتے ہوئے شاید یہ اندازہ کرنا غلط نہ ہو کہ مولانا نے اپنے سفر مطالعہ میں اس وادی کی سیر شاید نہ کی ہو۔ اور پھر انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ ان تحریکات کے اغراض ومقاصد سے لاعلمی کے باوجود مولانا کا کلام بہت سے جدیدیوں سے جدید اور بہت سے نام نہاد ترقی پسندوں کی ترقی پسندی سے ہزاروں قدم آگے تھا۔

اس پس منظر میں مولانا کی ایک نظم ''بارہ برس کا لڑکا رکشہ چلا رہا ہے'' ملاحظہ ہو:

بارہ برس کا لڑکا رکشہ چلا رہا ہے
کچھ ٹھیکروں کی خاطر موتی لٹا رہا ہے
ماں باپ کی غریبی ، ناداریوں کا چکر
باہیں پکڑ کے لایا تعلیم سے سڑک پر
کرتے کی ہر پھٹن سے غربت جھلک رہی ہے
ایک شاخ گل ہے لیکن الٹی لٹک رہی ہے
چکّا نہیں کھسکتا لیکن چلا رہا ہے
سارا بدن سمیٹے طاقت لگا رہا ہے
لادے شکر کی بوری پھر سیٹھ کی سواری
پیروں میں کپکپی ہے رکشا ہوا ہے بھاری
کشتی بھنور میں پھنس کر چکر لگا رہی ہے
طاقت لرز گئی ہے ہمت چلا رہی ہے

پیسے حرام کے ہیں دیر اس قدر لگادی!
غرا کے سیٹھ جی نے کچھ بھیک سی تھمادی

آنکھوں میں خون اترا غیرت کی ٹھوکروں سے
غربت نے آنکھ پونچھی گھر کی نزاکتوں سے
رکشا گھما کے لوٹا دولت کدے پہ تھوکا
بے چارہ تھا اکیلا ماں باپ کا سویرا

اس نظم سے اگر مولانا کا نام ہٹا دیا جائے تو کون یقین کرے گا کہ اس نظم کا شاعر کوئی مولوی ہے۔ اس نظم میں جو درد ہے، جو کرب ہے، جو سوز ہے، جو تڑپ ہے، دولت کی غلط تقسیم کے خلاف جو احتجاج ہے، اس کو دردمند دل رکھنے والے محسوس کر سکتے ہیں۔ انہیں الفاظ کا جامہ دینا مشکل ہے۔

مولانا کی شخصیت نگاری:

مولانا کا قلم نظم ونثر دونوں میں یکساں رواں تھا، ان کو دونوں اصناف سخن پر یکساں عبور و قدرت حاصل تھی۔ ان کے قلم میں شستگی اور شگفتگی تو تھی ہی جو ہر ادیب کے قلم کا خاصہ ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ مولانا کی تحریریں حق گوئی، غیرت وحمیت اور بے باکی سے مرکب ہوا کرتی تھی۔ ان کی نثر رواں پانی اور خوشگوار ہوا کی طرح سبک اور سہل ہوا کرتی ہے۔ عربیت وفارسیت زدہ تراکیب سے خالی خالص اردو زبان ہوتی ہے۔ مولانا نے نثر میں اپنے کمالات دکھلائے اور خوب دکھلائے۔ انہیں کے دم قدم سے کتنے رسالوں کی آبرو تھی اور انہیں کے قلم کی روانی پر کتنے ماہناموں کی زندگی منحصر تھی۔ مولانا نے نثری ادب کے بیشتر صنف کو برتا اور ہر صنف میں خوب سے خوب تر کی جستجو میں ان کے قلم کا سفر جاری رہا۔ مضامین ومقالات کا ایک انبوہ ہے جو ان کے قلم سے نکل کر مجلوں اور رسالوں کی زینت بنا۔ ''درس قرآن'' اور ''درس حدیث'' ان کے قلم کے مستقل عنوان تھے۔ ''یادش بخیر'' کے عنوان سے انہوں نے بیسیوں مضامین میں اپنی گذشتہ یادوں کو سمیٹا ہے۔ شخصیت نگاری اور تذکرہ نویسی سے بھی مولانا کو خاصا شغف تھا۔ معروف، کم معروف اور گمنام ہر

طبقہ کے لوگوں کا تذکرہ مولانا نے لکھا ہے اور لکھ کر انہیں زندہ جاوید کر دیا ہے۔

مولانا کی تذکرہ نویسی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ جب وہ کسی شخصیت کا خاکہ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو بغیر کسی تکلف وتصنع کے اور بغیر کسی زیب داستان کے بلاکم وکاست لکھتے چلے جاتے تھے۔ زیرتذکرہ شخصیت سے متعلق یادیں جس ترتیب سے لوح ذہن پر ابھرتیں اسی فطری ترتیب سے قرطاس پر بکھیرتے چلے جاتے۔ بعض خاکے پڑھنے کے بعد بے اختیار یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ مولانا نے لکھنے کے بعد نظر ثانی کی بھی زحمت نہیں کی کہ مبادا تحریر کے فطری بہاؤ پر کوئی خراب اثر پڑ جائے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ مولانا صرف اپنی یادیں شخصیت سے متعلق رقم نہیں کرتے بلکہ اس شخصیت کی ترجیحات ورجحان اور مختصر لفظوں میں پوری زندگی کا نچوڑ پیش کر دیتے ہیں۔ زمانہ قریب کی ایک معروف بزرگ شخصیت حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندوی کی حیات کا خلاصہ کس خوبی سے صرف ایک پیراگراف میں پیش کر دیا ہے، ملاحظہ ہو:

> ''قاری صدیق احمد صاحب فرشتہ نہیں انسان تھے، اس لیے گذر گئے، مگر ایسے انسان تھے جن کو ڈھالنے کے لیے انبیا واولیا تشریف لاتے تھے، جن کا سانچہ قرآن پاک تھا، یا حدیث پاک تھی۔ ان کا چلنا پھرنا پڑھنا پڑھانا وعظ وتبلیغ اور تعویذ ودعا جو کچھ تھا، نہ پیسہ کے لیے تھا نہ شہرت واقتدار کے لیے، صرف خدمت کے لیے تھا۔ اور یہ سارے کام بے تکان اور بے پناہ کرتے تھے۔ صرف آخرت اور شوق قبولیت کے لیے کہ اللہ راضی ہو جائیں، حضور ﷺ کے سامنے رسوانہ ہونا پڑے، مسلمانوں کا کام ہو جائے۔'' (''فکر اسلامی'' بستی، قاری صدیق نمبر)

قاری صاحب کا موضوع زندگی، ان کا خلوص، ان کی محبت، عوام وخواص کے درمیان ان کی بے پناہ مقبولیت کو کس خوبصورت انداز میں بیان کیا اور ان کے اس دنیا سے چلے جانے پر جس البیلے انداز میں اس کا ماتم کیا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''.......قاری صاحب کا موضوع کیا تھا؟ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے، ان کا موضوع خدمت، اور خدمت اسلام کی، مسلمانوں کی، علم کی۔ اس خدمت میں ان کے خلوص، ان کی شخصیت اور ان کی بے پناہ محبت نے جادو بھر دیا تھا۔ پھر ہر طبقہ کے اکابر کے احترام اور عزت افزائی نے دلوں کو ان کی محبت سے معمور کر دیا تھا۔ وہ جدھر گئے سر آنکھوں پر بٹھائے گئے، جس

مٹی کو چھودیا سونا بن گئی، جس سمندر میں کود پڑے پایاب ہو گیا، جدھر سے گذر گئے زمین وآسمان چہکنے لگے۔علما نے سر پر اٹھا لیا، تاجروں نے مال ودولت نچھاور کردی، لوگوں نے قدم چوم لیے، عوام نے دل کھول کر اس میں مجسمے نصب کر لیے۔اس لیے جب وہ چلے گئے تو بوڑھے اور جوان رو پڑے، عورتیں اور بچے سر پیٹ کر رہ گئے، علم وعمل دعائیں دینے لگے، ملک بھر سے لوگ ان کی قبر پر مٹی ڈالنے کے لیے بڑی بے تابی سے اٹھ کر آ گئے۔ وہاں دیکھا تو:''

''زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے''

(''فکر اسلامی''بستی قاری صدیق نمبر)

مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے بیشتر خاکے تاثراتی نوعیت کے ہیں۔اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اپنے قبیلے کی ریت کے مطابق مولانا نے بھی کسی شخصیت پر اسی وقت قلم اٹھایا جب وہ دنیا سے جا چکی تھی۔مگر یہ بات مسلم ہے کہ مولانا متعلقہ ذات کا ہو بہو رنگ ونقش کچھ اس طرح کاغذ پر مرتسم کر دیتے ہیں کہ وہ شخصیت قاری کو چلتی پھرتی اور متحرک محسوس ہونے لگتی ہے۔قاضی مجاہدالاسلام صاحب کا سراپا مختصر لفظوں میں کس خوبصورت انداز میں کھینچا اور ان کی ذات کا تعارف کس اچھوتے انداز میں کرایا، دیکھتے چلئے:

''قاضی مجاہدالاسلام بے داڑھی مونچھ کا ایک مختصر بوڑھا آدمی، شکل وشباہت بہت معمولی مگر پیشانی بلند اور چمک دار۔ میں نے ان کو دارالعلوم سے نکلتے دیکھا، پھر مولانا منت اللہ رحمانی کی نگاہ انتخاب نے ان کو امارت شرعیہ کے کاموں میں الجھا دیا تھا مگر انہوں نے اپنی گہری بصیرت، فقہی تنوع اور عبقریت کی بدولت مولانا سجاد کی طرح امارت شرعیہ کے پورے ڈھانچے کو متحرک کر کے رکھ دیا۔انہوں نے بڑے بڑے کام اٹھائے مگر اپنی جرأت مندی، بالغ نظری اور عزم ومحنت سے ہمیشہ ان کاموں پر قابو یافتہ ہو کر چلاتے رہے۔اس لیے وہ تمام دفاتر آج بھی کھلے ہوئے ہیں جن میں بیٹھ کر قاضی صاحب تقریر کرتے تھے یا لکھا کرتے تھے یا بحث و مباحثہ کو آخری شکل دیتے تھے، حتی کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے بنانے میں بھی وہ شریک تھے اور آج اس کی سربراہی کے سب سے بڑے عہدے پر بھی۔اور جاتے جاتے اس کی طرف سے اسلامی پرسنل لاء کی ایک جیتی جاگتی تصویر انہوں نے سپریم کورٹ کو بھی عطا کی ہے، ہائی کورٹ کو بھی،

عالم اسلام کو بھی۔اسی جرأت، اولوالعزمی اور بصیرت کا نام تھا قاضی مجاہدالاسلام۔''(دانشور)

قاضی صاحب عمر میں مولانا سے دس بارہ سال چھوٹے تھے۔مولانا کی دارالعلوم سے فراغت ۱۹۴۲ء کی ہے اور قاضی صاحب کی ۱۹۵۰ء کی ہے۔عمر کے اس تفاوت اور خردی اور بزرگی کے اس فرق کے باوجود جو کہ ہمارے زمانہ میں تذکرہ نویسی کے لیے قریب قریب ایک حجاب بن گیا ہے، مولانا نے کھل کر قاضی صاحب کی فقہی بصیرت اور ان کے کمالات کی داددی ہے۔اور اگر اس کو بھی ذہن میں رکھا جائے کہ قاضی صاحب اور مولانا کے درمیان بارہا فکری اختلاف اور قلمی جنگ ہوئی ہے تو اس سے مولانا کی کشادہ قلبی اور وسیع النظری کھل کر سامنے آجائے گی۔مولانا نے خود اس اختلاف کا ذکر کیا ہے:

''سیمینار کے سلسلے میں میرا ان کا بارہا اختلاف ہوا ہے اور انہوں نے خط کے ذریعہ مجھے سیمینار میں واپس آنے پر اصرار کیا تھا اور میں واپس بھی ہوا تھا مگر ان کی بشاشت میں کوئی فرق نہیں آیا۔میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ کسی اہم سوال میں پہلے فقیہان ہند سے رائے لے کر جب انہیں اختلاف ہو تو اس کو بحث کے لیے پیش کیجیے مگر قاضی صاحب اس کو طول عمل سمجھتے تھے۔مجھے قاضی صاحب کے خلوص میں نہیں مگر ان کے طریقہ کار میں اختلاف تھا اور یہ اختلاف پھر بہت سے لوگوں کو ہوتا چلا گیا۔اس لیے قاضی صاحب نے اصلاحات بھی فرمائی ہیں اور طریقہ کار بھی بدلے ہیں۔''(دانشور)

زمانہ قریب کی ایک عبقری شخصیت حضرت مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی کا ماتم مولانا نے ان الفاظ میں کیا:

''مولانا وحیدالزماں دیوبند کی اس خاک سے پیدا ہوئے تھے جس نے ایک سے ایک نائب رسول، محدث، مفسر اور فقیہ پیدا کیے مگر عربی زبان کا ایسا ماہر، عربی درس وتدریس کا ایسا مجتہد، عربی ادب کا ایسا فنکار جس کے شاگرد ساری دنیا میں اس کا فن پھیلا رہے ہیں اور اس کی نقل اتار کر دنیا کو علم وادب کا نمونہ دکھاتے ہیں، صرف ایک پیدا ہوا''وحیدالزماں''لوگ کہتے ہیں کہ سنیچر کی شام ۱۴/ذی قعدہ کو وہ سپرد خاک کر دیئے گئے، مگر ان کا لب ولہجہ، ان کا انداز، ان کا نظم و ضبط اور ان کی شوخی گفتار اس وقت بھی نگاہوں میں رقصاں ہے، کانوں میں گونج رہی ہے اور

دماغوں کو فکر کی بلندی عطا کر رہے تو میں کیسے کہہ دوں کہ وہ فنا ہو گئے۔'' (دانشور)

پھر مولانا کیرانوی کی ذات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کی علمی و عملی کمالات اور ان کی شب و روز کی جد و جہد اور ان کی فکر کے محور کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا وحید الزماں کا خمیر جن عناصر سے اٹھایا گیا تھا، وہ چار تھے۔ علم و فضل، نظم و ضبط، فکر و نظر اور جرأت و بے باکی۔ ان کے شاگردان کے علم و فضل کا نمونہ ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کا دارالاہتمام، دار جدید اور عمارتوں کے نقشے ان کے نظم و ضبط کے گن گا رہے ہیں۔ جمعیۃ علما کی مجلس عاملہ ان کے فکر و نظر کی گواہ ہیں۔ اور جرأت بے باکی کے دوست و دشمن سب شاہد ہیں۔ اس لیے وہ صدیوں زندہ رہیں گے اور ملک ملک ہماری نسلوں کی اصلاح و تربیت کرتے رہیں گے۔........''

''وہ محسوس کرتے تھے کہ دارالعلوم لکیر کا فقیر ہے، اس کو کتابی تعلیم سے اٹھ کر فنی تعلیم پر لگانا چاہیے، جس کی دارالعلوم میں بڑی گنجائش ہے۔ اس لیے اگر طریقہ تعلیم، نظام تعلیم بدل دیا جائے اور نصاب تعلیم میں جزوی ترمیم ہو جائے تو دارالعلوم سے ایسے افراد اٹھ سکتے ہیں جو عصر حاضر کے تمام تقاضے اسی شکل و شباہت، اسی انداز فکر سے پورے کر سکتے ہیں۔ آپ ان سے اس موضوع پر بات کیجیے تو ان کی نگاہوں سے چنگاریاں چھوٹنے لگتی تھیں اور آپ محسوس کرتے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شیخ چلی کا منصوبہ نہیں ہے بلکہ ایک مفکر کا حوصلہ اور ایک رہنما کا درد دل ہے۔'' (دانشور)

''انقلابی خطیب'' کے عنوان سے مولانا نے مشہور خطیب مولانا حقانی گجراتی کا خاکہ لکھا ہے اور ہو بہو ان کی خطابت کا چربہ کاغذ پر الفاظ کی صورت میں اتار کر رکھ دیا ہے۔ گویا ایک انقلابی خطیب کا خاکہ ایک انقلابی قلم کار نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے۔ مولانا حقانی اپنی تقریروں میں زیب داستان کے لیے بہت کچھ بڑھا دیتے تھے جو مولانا کے اصطلاح میں ''بے صفحہ'' کی بات ہے۔ مولانا حقانی کی جادو بیانی اور ان کی بے صفحہ کی باتوں کا تذکرہ مولانا نے دلچسپ انداز میں کیا ہے:

''میں نے گونڈہ بستی، ڈومریا گنج اور بلرام پور میں ان کا قیام دیکھا ہے، تقریریں سنی ہیں اور پانچ پانچ ہزار عورتوں کا سناٹا دیکھا ہے۔ حالانکہ مشہور بات ہے کہ چار عورتیں ایک جگہ

خاموشی سے نہیں بیٹھ سکتی ہیں، پھر ہزاروں عورتوں میں سناٹا۔سکون اور شوق پیدا کر دینا حقانی صاحب کا فن تھا، عجیب وغریب فن جسے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔اس فن کے لیے دو چیزیں ان کے کام آتی تھیں، ایک تو بے صفحہ کی کہانیاں، دوسری ان کی بے پناہ خطابت کا جوش۔وہ جب عورتوں کے فضائل بیان کرتے تھے، پھر ان کی کمزوریوں کا جائزہ لیتے تھے تو ان کی خطابت، ان کا جوش بیان، ان کی روانی اور حاضر دماغی دیکھ کر مجھ جیسے لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔اور یہ ان کا انفرادی مقام تھا جہاں اچھے سے اچھا مقرر کبھی نہیں پہونچ سکا۔''(دانشور)

حقانی صاحب چونکہ باقاعدہ عالم نہیں تھے۔اصلاً وہ ایک قوال تھے پھر ان کے اندر صالح انقلاب برپا ہوا اور ہندوستان کے مذہبی افق پر ایک بڑے عوامی خطیب بن کر چمکے۔اس پس منظر میں مولانا نے حقانی صاحب سے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ بیان کیا ہے۔آپ بھی اس لطیفے کا لطف لیجیے:

''کسی سفر میں ایک عالم صاحب نے از راہ شکایت حضرت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند سے عرض کیا کہ'' آپ حضرات نے حقانی جیسے جاہل کو ہم لوگوں پر مسلط کر دیا ہے''تو قاری صاحب نے برجستہ فرمایا کہ''ہم لوگوں نے آپ کے دسیوں جاہل برداشت کیے، اور آپ سے ہمارا ایک جاہل برداشت نہیں ہوتا۔''(دانشور)

انداز بیاں اور:

مولانا کے ذہن کی طرح مولانا کا قلم بھی بہت سیال تھا۔ان کے لکھنے کا ایک انداز ہے۔وہ لکھتے لکھتے اچانک رک جاتے ہیں اور سوال قائم کرتے ہیں اور پھر خود ہی سوال کا جواب دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

مسعود خان وکیل صاحب جن کو مولانا نے اکیسویں صدی کا سرسید کے نام سے یاد کیا ہے۔ان کو ایک ایسے عالم کی تلاش تھی جو تعلیم بھی دے سکے، انتظام بھی سنبھال سکے اور دیانت دار بھی ہو۔وہ اپنی اسی جستجو کو لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔مولانا نے ان کی اس جستجو پر سوال قائم کیا اور پھر خود ہی جواب دیا:

''سوال یہ ہے کہ خان صاحب کسی دیانت دار کو تلاش کرنے مجھ جیسے مدرسہ کے ملا کے

پاس ریاض العلوم میں کیوں آئے؟ کسی کالج، کسی یونی ورسٹی، کسی جامعہ اور مسلم یونی ورسٹی کیوں نہیں گئے۔''

''صحیح بات یہ ہے کہ اس موقع پر نگاہ کسی کالج، کسی جامعہ، کسی یونی ورسٹی یا انگلستان و امریکہ کی طرف نہیں اٹھتی اور نہ ہی اٹھ سکتی ہے۔ اگر اٹھے گی تو مذہب کی طرف، خدائی علاج اور رسولوں کی زندگی کی طرف۔ یا ان کے نائبین، صالحین اور اولیاء اللہ کی طرف اٹھے گی۔ کیوں کہ وہاں حضرت عمر فاروق، امام غزالی، شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسم اور مولانا حسین احمد مدنی جیسے ائمہ دین ملیں گے، ان کے غلام ملیں گے، ان کا انداز ملے گا۔ وہاں امانت و دیانت خلوص اور سچائی کے نمونے ملیں گے اور نمونوں کے مطابق ڈھالنے والے افراد اور کتابیں اور مضامین ملیں گے۔ اسی لیے مسعود خان انہیں وادیوں میں تلاش کرنے نکلے جہاں سنگ پاروں کو ہیرا بنانے والے رہتے ہیں۔ یعنی مدارس اسلامیہ۔'' (دانشور)

بابو عزیز الرحمان صاحب امام و متولی جامع مسجد اعظم گڑھ کی زندگی قابل رشک زندگی تھی اور ان کی موت معمہ بن کر رہ گئی۔ ان کی موت پر مولانا نے کئی سوالات قائم کیے اور پھر ترتیب وار سب کا جواب بھی دیا:

''ان کی موت ایک معمہ بن گئی اور معمہ کی ابتدا وہیں سے ہوئی جب گھر کی اونچی دیوار پھاند کر نکل گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ گھر کی خاردار اونچی چہار دیواری پھاند کر دوسری طرف کس طرح کود گئے؟ جب کہ بیماری کی وجہ سے اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ چڑھ جائیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ گھر سے نکل کر وہ ایک کنویں پر گئے پھر آگے دوسرے کنویں کا تختہ اکھاڑ کر اس میں کیوں کود گئے؟ اتنی طاقت کہاں سے آئی؟ (۳) ان کے والد مختار صاحب جس کنویں میں گرے تھے وہاں ان کو کون لے گیا؟ (۴) اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ بلا کسی اوزار کے تختے توڑ کر اس میں کود ے تھے (۵) تقریباً بیس گھنٹوں کے بعد اس میں سے نکالے گئے تو نہ کوئی خراش، نہ زخم، نہ بدبو، نہ ٹوٹ پھوٹ، اور وہ پانی میں سیدھے کھڑے تھے نماز کی نیت باندھے ہوئے تھے (۶) ایک گھنٹہ تک ان کے ہاتھ پاؤں اور عقل وحواس سے کون کام لیتا رہا۔ اگر وہ مسلمان روح تھی تو ڈبویا کیوں؟ اور اگر کافر روح تھی نماز کی نیت اور چہرے کا کعبہ کی طرف گھومنے کا کیا سوال ہے؟ اس کے قسم بہت سے سوالات حل طلب ہیں۔''

جوابات:

(الف) حاضرات کے علم سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اوپر کوئی روح آتی تھی اور ان کے دماغ پر مسلط ہوکر ادھر ادھر لے جاتی تھی۔ برے برے خیالات پوری طاقت سے پیدا کرتی تھی جس کی شکایت انہوں نے مجھ سے بھی دوبار کی تھی، پھر ان کے لڑکوں نے فون پر بتایا تھا۔ مولانا اعجاز صاحب سے بھی معلوم ہوا تھا۔

(ب) کسی پنڈت نے ان کے والد مختار صاحب پر جادو کر کے ان پر اپنا موکل مسلط کر دیا تھا، وہ کافر تھا اور کسی خاص مہینہ میں مسلط ہوا تھا۔ اس لیے اس میں تکلیف زیادہ رہتی تھی۔ وقت مقررہ کا صاف مطلب ہے کرتب یا جادو۔

(ج) یہ سلسلہ مختار صاحب سے شروع ہوکر بابو صاحب تک مسلسل رہا۔

(د) انسانوں پر جنات یا ارواح مسلط ہوجاتے ہیں تو ان کی رگوں میں دوڑتے ہیں۔ دماغ اور اعضا پر حاوی ہوجاتے ہیں مگر دل کے اندر نہیں جاسکتے۔ اس لیے ایمان متاثر نہیں ہوتا۔

(ہ) اگر ہیضہ یا طاعون سے مرنے والے کی شہید سے برابری ہے تو یہاں انہیں کسی خبیث روح نے پانی میں ڈبو کر مارا ہے۔ اس لیے وہ بدرجہ اولی شہید ہوئے۔ اور شہید مرتا نہیں ہے، عالم برزخ میں زندوں کی طرح رہتا ہے۔ اس لیے ان کا کھڑا ہونا، نماز کی حالت، نیت باندھنا اور چہرے کا قبلہ رخ پھر جانا شہادت کی علامت ہے اور عالم برزخ میں کامیابی کی بھی۔

(و) ۳۲ رگھنٹوں میں ظاہر ہے کہ وہ منکر نکیر سے فارغ ہوگئے تھے، تو بعد کے حالات اہل ایمان کی طرح اور فضل خداوندی کی طرح معلوم ہوتے ہیں جو ان کی ایمانی قوت، رحمت الٰہی اور شہادت کی وجہ سے ظاہر ہوئے۔ خدا انہیں مبارک کرے۔

(ز) عالم برزخ کی باتیں یقین سے کون کہہ سکتا ہے مگر علامات اچھے ہیں۔ خدا مغفرت فرمائے اور اہل وعیال کو خیر وعافیت سے رکھے۔'' (دانشور)

مولانا کے لکھنے کا یہ خاص انداز تھا۔ انہیں جب قاری کو کوئی دلچسپ اور اہم بات بتلانی ہوتی تھی تو وہ اسی طرح سوال وجواب کا سلسلہ قائم کر دیتے تھے تاکہ قاری کے ہر طبقہ کے ذہن سے بات قریب تر ہوجائے اور بغیر سر کھپائے آسانی سے بات سمجھ میں آجائے۔ رحمہ اللہ تعالی رحمة واسعة

❑❑❑

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی اور ان کی شاعری

مولانا محمد اشہد اعظمی صاحب

معلم ومربی پیرومرشد حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوّر اللہ مرقدہ اپنے استاد گرامی قدر مخلص وباصفا مردمومن مولانا افضال الحق جوہر قاسمی نوّر اللہ مرقدہ کا ذکر بکثرت کرتے، کبھی درسگاہ میں ان کے اندازِ درس وتدریس کو بتا کر ان کی قابلیت وصلاحیت پر رشک کرتے، کبھی نجی مجلسوں اور محفلوں میں ان کے مزاج کی سادگی اور عجز وانکساری کو لطف لے لے کر بیان کرتے، اور کبھی طلبہ سے عمومی خطاب میں ان کے اوصاف وکمالات کا ذکر کرتے، اور فرماتے کہ اللہ تعالی نے انھیں بے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا علم وحکمت کے اعلی منصب پر تھے، ورع وتقوی میں بھی ان کا ایک مقام تھا، عزم وارادہ اور حوصلے کی بلندی کا تو کہنا ہی کیا، باطل قوتوں کے سامنے دبنا اور جھکنا ان کے ضمیر نے کبھی گوارہ نہیں کیا، بڑے ہی بے باک اور بے جگر تھے۔ غرضیکہ مولانا ان سے بے حد متأثر تھے، ان کا ذکر خیر اتنے تواتر سے کرتے کہ ان کی عظمتِ شان دل ودماغ کی گہرائی میں جاگزیں ہوگئی ہے۔

ہر ذہین وذکی الحس شخص جس کی طبیعت موزوں اور ذوق عمدہ ہو، اس کو شعر وشاعری سے لگاؤ اور دلچسپی کا ہونا ایک فطری چیز ہے، حضرت مولانا موصوف کو مبدأ فیض سے ذہانت و ذکاوت، فہم وفراست کا وافر حصہ ملا تھا، ساتھ میں ذوق سلیم اور موزونی طبع سے بھی نوازے گئے تھے۔ اس لیے شاعری تو گھٹی میں پڑی تھی، لیکن مولانا نے اسے بطور فن استعمال نہیں کیا، بلکہ وقت اور ماحول کے تقاضے کے مطابق کبھی موقع ملا تو کچھ کہہ لیا۔ درد اور غم لاحق ہوا اور دل جلا تو اشعار نظم

اور غزل کے پیکر میں ڈھل گئے، وجد اور سرمستی کی کیفیت طاری ہوئی، حبّ الٰہی اور عشق نبوی میں طبیعت جھومی تو نعت اور حمد کی صورت اختیار کر لی۔ غرضیکہ مولانا ایک اچھے اور منجھے ہوئے قادر الکلام شاعر تھے، خوب سے خوب تر شعر نکالتے، جوہر تخلص کرتے تھے، دو مجموعہ کلام ''نجمِ سحر'' اور ''دارورسن تک'' کے نام سے مطبوع ہیں۔

مولانا شعر دور طالب علمی میں کہنے لگے تھے، آپ کی پہلی غزل ۱۹۳۸ء کی ہے، جس وقت آپ کی عمر محض پندرہ سال تھی، اس غزل کا ایک شعر آپ نے اپنے مجموعہ کلام ''دارورسن تک'' میں ذکر کیا ہے:

اگر جذب محبت ہے تو وہ خود ہی سمجھ لیں گے
کبھی تصویر آئینے کو دکھلائی نہیں جاتی

دارالعلوم دیوبند کے زمانہ قیام میں ملک کے نامور شاعر اور مشہور قلمکار صاحب ''تجلّی'' جناب عامر عثمانی کے ساتھ شعر و ادب کی مجلسوں اور محفلوں میں حاضری ہوتی، جہاں مولانا کی شاعری کو پنپنے کا موقع ملا، اور خوب پروان چڑھی۔ نیز ایک مشاعرہ میں بھی شرکت کی، اپنا کلام سنایا اور خوب داد و تحسین سے نوازے گئے۔ چنانچہ اپنے مجموعہ کلام ''دارورسن تک'' کے حرف آغاز میں مولانا رقم طراز ہیں:

''دیوبند پہنچا تو عامر عثمانی، خیری غازیپوری، سعید سلطانپوری کے ساتھ شعر و شاعری کا چرچا رہا، ایک مشاعرہ میں پہلی مرتبہ غزل اس وجہ سے پڑھی کہ عامر کا اصرار تھا اور روش صدّیقی صدارت فرما رہے تھے، اس شعر پر خوش ہوگئے:

قفس میں بند کیا ہوتے قفس سارا چمن ہی ہے
کوئی صیّاد ہے شاید لباسِ باغبانی میں

دیوبند کے بعد آپ بہرائچ آئے، رافت، جمال، وصفی وغیرہم شعراء کے ساتھ بزم سجاتے رہے اور شعر و شاعری لازم سی ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے کلام میں رمزیت، استعارات، معنویت، تشبیہات کا بہترین استعمال، زبان و بیان کی شستگی، کلام میں برجستگی و روانی، انداز میں نرالا پن خوب نظر آتا ہے، جو آپ کی شاعری کو گرانمایہ کر دیتا ہے۔

مولانا حد درجہ فعّال اور متحرک شخص تھے، رکنا اور ٹھہرنا اور تھک کر بیٹھ جانا ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ چنانچہ ہمارے مولانا سناتے تھے کہ مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور کے زمانہ قیام میں جب کہ آپ کے قویٰ کسی قدر کمزور ہونے لگے تھے، آپ کا یہ معمول سا تھا کہ جمعرات کو اسباق سے فارغ ہو کر شاہ گنج سے دہلی روانہ ہو جاتے، ٹکٹ بھی جنرل بوگی کا ہوتا، اور سنیچر کو مدرسہ میں حاضر ہو جاتے۔ سبق کا گھنٹہ ہوتا فوراً درسگاہ میں حاضر ہوتے، کبھی سفر کی تکان اور مشقتوں کا ذکر نہیں کرتے، اور نہ ہی چہرے مہرے سے اس کا اظہار ہونے دیتے۔ قوم کے ساتھ ہمدردی، ملّت کی رہنمائی، مسلمانوں کی زبوں حالی پر افسوس اور ان کے حل کی تلاش، ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کے سچے مصداق تھے۔ یہی درد ان کے دل کی آواز اور ان کے جذبات کا پرتو تھا، جس نے خونِ جگر نچوڑ لیا اور صفحۂ قرطاس پر نقش ہو کر شاعری کی صورت اختیار کر لی۔ آپ نے اپنی شاعری کا موضوع غمِ دوراں انتخاب کیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ ان کے کلام میں جس چیز نے جگہ بنائی ہے، وہ سوزِ دروں اور گداز دل کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ چند اشعار سے آپ بھی محظوظ ہوں:

کھٹکھٹا دینا ذرا دیر و حرم کے بام و در
سرخ آندھی آگئی صحن چمن تک آگئی

خون روتی ہے کلی اور آگ برساتے ہیں پھول
جب محبت کی گھٹن صحنِ چمن تک آگئی

ظلم کے ہر وار پر ہوتا ہے ظالم بے نقاب
زندگی جب ہار کر دار و رسن تک آگئی

جب غمِ دوراں کا فتنہ حشر ساماں ہو گیا
ہر کشاکش بڑھ کے شیخ و برہمن تک آگئی

حسن کی گمراہیوں کو آئینہ دکھلا دیا
شاعری جب عشق کے معیارِ فن تک آگئی

مولانا کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں اور نظموں کو عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں، اور

عنوان اسی غزل یا نظم کے مکمل مصرعہ کو یا مصرعہ کے ایک ٹکڑے کو بناتے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا غزل میں ''دارورسن تک آ گئی'' کو عنوان بنایا ہے جو کہ مصرعہ کا ایک ٹکڑا ہے۔ نیز آپ کی غزلیں حسن پرستی آوارگئ فکر، سستی جذباتیت، محاکات کی رنگ آمیزی، اور طرزِ اظہار کی شوخی کے تام جھام سے پاک ہوتی ہے۔ ان میں رعنائی ودلبستگی اور دل لگی کا وہ سامان نہیں ہوتا ہے جو متغزلین شعراء کا عام مذاق ہے، اور غزل کے بنیادی عنصر میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ مولانا نیک صالح، عالم باعمل، پاکیزہ نفس اور پاکیزہ خیال شخص تھے، اور یہ پاکیزگی ان کے کلام میں بھی در آئی، جس کی وجہ سے آپ عام شعراء کی فہرست سے الگ ہوکر امتیازی شان کے ساتھ قد آور معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کی یہی پاکیزہ خیالی اور نیک نفسی آپ کی شاعری کو حب نبوی کے اس دربار میں حاضر کرتی ہے، جہاں محبت کے جام پہ جام لنڈھانے سے بھی سیرابی نہیں ہوتی، بلکہ مزید کی طلب ہوتی ہے، اور محبّ اپنے محبوب کا نام لے کر ہر آن ترقی کا زینہ طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اور محبوب کی معمولی سے معمولی ادا کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور فراق وجدائی کا تصور محو کر کے اپنی جان محبوب کے قدموں پہ نچھاور کرنے کو اپنے لیے مایہ افتخار سمجھتا ہے۔ ایسی ہی کچھ محبت مولانا کو محبوب دوعالم حضرت محمد ﷺ سے تھی، جن کی ہر ادا کو اپنی نقل وحرکت میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کرتے، اور آپ کی سیرت کا پرتو بننے کی جدّ وجہد کرتے، اور اسی وارفتگئ شوق میں اپنے کلام کو ڈھال کر شوق اور جذبہ کی آگ کو فروزاں کرتے اور خود بھی جلتے اور دوسروں کو بھی جلانے کا انتظام کرتے:

اٹھا دیجئے حجاب دیدہ و دل رحمت عالم
جو مدت سے کھڑے ہیں طالب دیدار دیکھیں گے

اب دل ہی نہیں لگتا احباب کی محفل میں
بخشی ہے محبت نے ہر وقت کی تنہائی

آئی ندا کہ دیدہ و دل بھی پڑھیں سلام
نعت رسول پاک سنانے کا وقت ہے

خاک سے پیدا نور سے بہتر، جن وملائک دیکھ کے ششدر
لائے گئے جو عرش بریں پر صلی اللہ علیہ وسلم

دل گرمایا عشق جگایا جلوہ گہ حق اس کو بنایا
ڈھالے حسن وفا کے پیکر صلی اللہ علیہ وسلم

عہد نبوت فیض کا موسم سامنے سب کے دونوں عالم
آئینہ حق قلب منور صلی اللہ علیہ وسلم

علم ویقیں کی لا کر مشعل ہیرے ڈھونڈے جنگل جنگل
ہیرے بن گئے راہ کے پتھر صلی اللہ علیہ وسلم

صبح ازل سے شام ابد تک پیدائش سے کنج لحد تک
ہر منزل ہر موڑ منور صلی اللہ علیہ وسلم

بچے پیارے بوڑھے پیارے سب کے ساتھی سب کے سہارے
سب میں شامل سب سے بڑھ کر صلی اللہ علیہ وسلم

کوثر دوزخ جنت کیا ہے برزخ روح فرشتہ کیا ہے
دیکھ آئے آنکھوں سے جا کر صلی اللہ علیہ وسلم

مسکینوں کو پاس بٹھا کر پھیلا دی رحمت کی چادر
غربت لی دولت ٹھکرا کر صلی اللہ علیہ وسلم

عقبی ان کی سمت نظر تھی دنیا ان کی راہ گزر تھی
اب تک ہے ہر راہ معطر صلی اللہ علیہ وسلم

فکر انوکھی ہمت عالی بول نرالے چال نرالی
ہر لمحہ شایان پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

پتھر برسے منہ نہیں موڑا جان پہ آئی حق نہیں چھوڑا
اللہ اللہ آپ کے تیور صلی اللہ علیہ وسلم

لاچاروں کے آنسوں پوچھے ہاتھ بٹائے مزدوروں کے
غم کی پرسش گھر گھر جاکر صلی اللہ علیہ وسلم

عزت دولت شوکت کیا ہے سورج چاند کی رفعت کیا ہے
دعوت حق پر سب ہیں نچھاور صلی اللہ علیہ وسلم

انساں پر الہام کا منظر دیکھ کے سب ہی کھا گئے چکر
مان گئے پھر شان پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

حشر میں ڈھونڈھیں گے سہارا اول آخر انسانوں کا
سب پہ کھلیں گے آپ کے جوہرؔ صلی اللہ علیہ وسلم

❏❏❏

نمونہ نگارشات:

دارالعلوم دیو بند کے دو سال
۶۰۔۱۳۵۹ھ ۴۱۔۱۹۴۰ء

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

۸؍شوال ۱۳۵۸ھ کی صبح دیو بند پہونچا۔عیسوی سن ۱۹۳۹ء تھا۔برادرم قاری ضیاء الحق کے ہمراہ گیا تھا۔ہم دونوں دارالعلوم مئو اعظم گڑھ میں مشکوۃ ،ملاحسن ،میبذی، مقامات اور مختصر المعانی پڑھ کر آئے تھے۔

مئو سے دیو بند:

دارالعلوم جانے کا کچھ پہلے سے شوق تھا، کچھ یہ بھی ہوا کہ رجب کے مہینے میں دارالعلوم مئو میں ایک استاذ کے معاملہ میں اسٹرائک ہوگئی اور آدھے لڑکے نکل گئے۔مگر ہماری جماعت میں ۲۴؍لڑکے تھے اس میں سے بہت کم نے اس میں حصہ لیا تھا۔اس اسٹرائک کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہماری جماعت کا سب سے بہتر اور معقول لڑکا ''شیخ محمد'' بھی اس میں شریک ہوگیا۔جس کی وجہ سے سالانہ امتحان کے لیے تکرار کرانے میں سہولت ختم ہوگئی۔کیوں کہ اتنی بڑی جماعت کو تکرار میں مطمئن رکھنا شیخ محمد کا کمال تھا۔وہ شرح جامی سے برابر تکرار کرایا کرتے تھے۔اور اللہ کا بندہ ساری کتابوں کی تکرار اکیلے کراتا تھا۔اس سال صرف مقامات کی تکرار میرے ذمہ تھی جس میں عقل کی ضرورت کم ہوتی ہے، یادداشت سے کام چل جاتا ہے۔جب کسی نے ہمت نہیں کی تو اس ناکارہ نے ہامی بھر لی اور تکرار شروع کرادی:

''قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند''

شیخ محمد کی تفہیم کا انداز، اس کے مزاج کی سنجیدگی اور مختلف مزاجوں کو برداشت کرنے کی ہمت کے لئے اس کا نام کافی تھا۔ اس لیے اس کی جگہ بیٹھنا صرف بیوقوفی کی علامت تھی مگر اس لیے قابل قبول ہوگئی کہ دوسرا کوئی وہاں بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے مجھے تکرار کرانی پڑی اور اس سے میرا یہ فائدہ ہوا کہ دیوبند جانے کا حوصلہ بڑھ گیا۔

علما کی بے حرمتی:

دیوبند کے اساتذہ کا رعب اس قدر تھا کہ ''شیخ الاسلام''، ''شیخ الادب'' اور ''شیخ المعقولات'' کے صرف القاب سن کر طلبہ گھبرا جاتے ہیں مگر یہ رعب ہم لوگوں پر اس وجہ سے کچھ کم تھا کہ اسی سال دارالعلوم مئو میں حضرت مولانا میرک شاہ صاحب کشمیری جیسا محدث، مفسر، ادیب اور فقیہ ہمیں نصیب ہو گیا تھا، جن کو لانے کے لیے مدرسہ والوں نے مولانا اسلام الحق کو پا گنجی جیسے استاذ کو اس وجہ سے گھر بھیج دیا تھا کہ وہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے نقش قدم پر گامزن اور جمعیۃ علما کا انداز فکر رکھتے تھے۔ اور مدرسہ میں اکثریت مسلم لیگی حضرات کی تھی۔ اس غلط کاروائی سے طلبہ کو بہت صدمہ ہوا مگر طاقت کے سامنے معقولیت فریاد کرتی رہ گئی۔ بالآخر مدرسہ میں مقیم تمام طلبہ پیدل چل کر چھ میل گئے اور مولانا اسلام الحق صاحب سے کوپا گنج میں تعزیت کر کے واپس آ گئے۔ فجر کی نماز ہم لوگوں نے دارالعلوم مئو میں پڑھی تھی مگر ہم لوگوں سے کسی نے بھی باز پرس نہیں کی۔ کس کس سے باز پرس کرتے بے چارے؟۔

مولانا میرک شاہ صاحب:

مولانا کشمیری سے ہم نے مشکوۃ، ملاحسن اور مقامات شروع کی تو ہم لوگوں کو حیرت ہوگئی کہ مولانا نے ہم سے ملاحسن کے سبق کا مقام پوچھا اور عبارت پڑھنے کے بعد سر اٹھا کر پورے سبق کی برجستہ اور مدلل تقریر کر ڈالی، اور ہم عش عش کرتے رہ گئے۔ مولانا کشمیری سے مطمئن ہو کر ہم نے سال پورا کر لیا کہ ان سے بہتر بھلا کون پڑھا سکتا تھا؟۔

فرشتۂ غیب:

ہم دارالعلوم دیوبند پہونچے، پھاٹک پر سامان لیے کھڑے تھے، ہمیں معلوم نہیں تھا کہ کوئی کمرہ جدید طلبہ کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے حیران تھے کہ جائیں کہاں؟ دفتر کہاں ہے کہ کچھ

پوچھیں؟ چندمنٹ کے بعد دارالعلوم مئو کے ایک طالب علم مولوی صفی اللہ صاحب گورکھ پوری آ گئے جو پچھلے سال سے یہاں پڑھ رہے تھے اور ناشتہ کے لیے دوکان جا رہے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہمیں ہمارے سامان کے ساتھ دارجدید لے گئے۔ وہ کمرہ نمبر ۲۱ میں رہتے تھے اور یہ بہت مشہور کمرہ تھا۔ یہاں سے ''اتحاد'' نامی ایک پرچہ بھی نکلتا تھا اور یہی کمرہ انجمن'' نادیۃ الاتحاد'' کا بھی دفتر تھا۔ مولوی صفی اللہ صاحب کے بعد داخلے کے تمام مراحل آسان ہوگئے۔ وہاں عجیب بات یہ نظر آئی کہ آپ پھاٹک پر آیئے، ایک احاطہ پار کیجئے، پھر مولسری کا احاطہ پار کیجئے، تب کوٹھے پر جایئے تو وہاں ''دفتر تعلیمات'' ملے گا اور وہیں سے ہر طرح کی معلومات مل سکیں گی۔ اگر ابتدائی معلومات کے لیے پھاٹک کے پاس کوئی جگہ ہوتی تو ہم جیسے جدید لڑکے حیران نہ ہوتے مگر وہاں کے لوگوں کو اس کا مطلق احساس نہیں۔

امتحان داخلہ:

دفتر سے فارم داخلہ ملا، اس پر ۹۵ رنمبر پڑا تھا۔ امتحان کے لیے میرا فارم وہاں کے ایک استاذ کے پاس گیا۔ وہ مختصر مگر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ آدمی تھے۔ غالبًا ان کا نام مولانا ظہور صاحب تھا۔ مشکوۃ پڑھوائی ترجمہ اور مطلب پوچھ کر ملاحسن کھولی تو پوچھا سُلّم پڑھی ہے؟ میں نے کہا نہیں صرف ملاحسن پڑھی ہے۔ آرڈر ملا کہ ''جاؤ سُلّم پڑھو''۔ ملاحسن پڑھوا کر دیکھ لیتے کہ یہ کتاب اس کو آتی ہے یا سلم پڑھنا ضروری ہے تو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ مگر اتنے خشک لب ولہجے اور اس قدر ٹھس! مولانا نے سلم، میبذی وغیرہ کتابیں لوٹا کر مجھے بہت مایوس کیا مگر دل نہیں ٹوٹا۔ اور بھائی ضیاء الحق صاحب نے امتحان دیا تو وہ موقوف علیہ میں ترقی پا گئے۔ اس طرح زندگی میں پہلی مرتبہ بھائی صاحب سے ایک سال پیچھے ہوگیا۔ ان کو تعجب تھا کہ رمضان میں افضال نے مجھ کو ملاحسن تکرار کرائی تو میں پاس ہوگیا اور یہ کیسے گر گیا؟ میں نے کہا ملاحسن کھولی گئی مگر بغیر پڑھوائے حکم سنا دیا گیا تو میں کیا کرتا؟ بالآخر میں نے کتابیں لے لیں اور پڑھائی شروع ہوگئی۔ میں نہ کسی دوسرے مدرسے سے واقف تھا، نہ بھائی صاحب کو چھوڑ کر جانے کے لیے گھر کے لوگ راضی ہو سکتے تھے۔ تن بہ تقدیر پڑھنے لگا۔ دو ایک دن دل ضرور متاثر رہا اور نئے داخلے والوں کو دیکھ کر بھی متاثر ہوتا رہا مگر پھر پڑھنے میں لگ گیا تو اسباق کی ندرت اور انوکھے پن نے سب بھلا دیا۔

بچوں کی آزمائش:

ایک یہ تھا امتحان داخلہ۔ اور دوسال پہلے میں باندہ گیا تھا۔ قاری صدیق صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک پندرہ سال کا بچہ قاری صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک خط دیا اور اسے پڑھ کر قاری صاحب نے پوچھا ''تم نے کیا پڑھا ہے؟'' اس نے کہا کافیہ۔ قاری صاحب نے کوئی صیغہ پوچھا، دوتین سوالات کیے اور وہ برجستگی سے جوابات دیتا چلا گیا۔ قاری صاحب مسکرائے اور ایک مدرس کو بلا کر حوالے کر دیا کہ جاؤ اسے داخل کرلو۔ بہت سے اساتذہ کو دیکھا ہے کہ امتحان داخلہ باقاعدہ مطالعہ فرما کر لیتے ہیں، تاکہ طالب علم کی لیاقت اور اپنی لیاقت کو ٹکرائیں اس لیے اچھے اچھے طلبہ ذراسی غفلت، لکنت یا کوتاہی سے گر جاتے ہیں اور ان کا دل ٹوٹ جاتا۔ مگر یہ ظالم اپنی عادت میں تبدیلی نہیں لاتے، صلاحیتوں سے والی بال کھیلتے رہتے ہیں۔

درس وتدریس:

میری سلم مولانا عبدالسمیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھی، میبذی مفتی شفیع صاحب (پاکستان) کے پاس تھی۔ ان دونوں حضرات سے سبق پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ مفتی محمد شفیع صاحب میبذی میں حکما کی رائے اور ان کا مسلک پڑھاتے تھے پھر متکلمین کی رائے بھی بتاتے تھے۔ اور مولانا عبدالسمیع صاحب (مولانا عبدالاحد صاحب مرحوم کے والد ماجد اور مولانا بلال صاحب کے جد محترم) کا سبق، سبق نہیں تھا، وہ گھول کر پلا دیتے تھے۔ مشکل سے مشکل مضامین اپنی دلچسپ تقریر کے ذریعہ ذہن میں اتار دیتے تھے۔ کوئی پیچیدہ بات ہوتی تو سمجھانے کے بعد پہلی صف میں بیٹھے کسی طالب علم سے پوچھ لیتے ''او چچا! کیا سمجھے؟'' اور جوان کو صحیح جواب دیدیتا اس سے بہت خوش ہوتے، خوب شاباشی دیتے اور جھوم جھوم جاتے۔ عموماً مختصر المعانی جگہ جگہ دلچسپ شعروں کی وجہ سے جلد سمجھ میں آجاتی ہے مگر سلم کی بحث ''**جعل الكليات والجزئيات**'' وہ معمہ ہے کہ عقل حیران ہوجاتی ہے مگر مولانا عبدالسمیع صاحب سے وہاں بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کسی سنگلاخ زمین سے گزر رہے ہیں یا کسی پہاڑی پر چڑھ کر پار آئے ہیں۔

میں بھی سامنے بیٹھتا تھا اس لیے کبھی کبھی مجھ سے بھی پوچھ لیتے تھے ''کیا سمجھا؟'' میں

چونکہ ملاحسن پڑھ کر آیا تھا اس لیے ان کی پوری بات دہرا دیا کرتا تھا۔اس پر بہت شاباشی دیتے تھے اور دل باغ باغ کر دیتے تھے۔

مولانا عبدالسمیع صاحب کو مختصر المعانی،سلم العلوم اور میر زاہد جیسی پیچیدہ کتابوں کے پڑھانے میں اور سمجھانے میں بھی مہارت حاصل تھی۔وہ بچوں کا دل بڑھانے میں بسا اوقات ایسی عجیب عجیب باتیں کر دیا کرتے تھے کہ آج نہ استاذ یقین کریں گے اور نہ طالب علم۔

خلوص مجسم:

سلم یا میر زاہد میں اگر کوئی طالب علم الجھ گیا اور مولانا نے محسوس کرلیا کہ وہ ان کی بات سے مطمئن نہیں ہوا تو فرماتے کہ ''چچا! کل مولوی ابراہیم سے پوچھ کر آؤں گا تب بتاؤں گا۔'' پھر وہ گھر جاتے،آپ کا گھر سفید مسجد کے پاس تھا اور اس کے قریب ہی علامہ بلیاوی بھی تشریف رکھتے تھے۔کتاب لے جا کر ان سے پوچھتے:''یہاں پر میں یوں کہوں تھا اور وہ یہ کہے تھا۔'' اس پر حضرت علامہ کتاب کی عبارت یا مسئلہ یا سوال حل کر دیا کرتے تھے۔پھر حضرت الاستاذ سبق میں آ کر اس لڑکے کو آواز دیتے اور فرماتے ''مولوی ابراہیم صاحب یوں کہتے تھے۔''

آج کس کا دل گردہ ہے کہ کسی ہم سبق ساتھی سے اس طرح پوچھے! اپنے اساتذہ سے پوچھنے میں جھجھک آتی ہے۔اس طرح علی الاعلان کہہ کر اس کے مطابق عمل کر کے بچوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنا مولانا کی بے نفسی،ان کے خلوص وللّٰہیت کی علامت ہی نہیں ان کی کرامت تھی۔ورنہ میں نے بہت سے اساتذہ علماء اور ماہر فن کو دیکھا ہے کہ طلبہ کے سوال پر ان کی بھنویں تن جاتی ہیں،غصہ آ جاتا ہے۔بعض بزرگ فرما دیتے ہیں کہ ''گستاخی کرنے پر علم سے محروم ہو جاؤ گے۔''ایک صاحب نے مشکوۃ کے سبق میں ڈانٹ کر فرمایا ''سبق چلنے دو،تم کو پوچھنا ہے تو کمرے میں آ کر پوچھ لینا۔'' مگر وہ عبدالقادر بھی بڑا پکا تھا،کہنے لگا ''حضرت! جب کمرے میں آ کر ہی پوچھنا ہے تو سبق بھی وہیں پڑھ لیں گے۔درس گاہ میں کتاب لانے کی کیا ضرورت ہے؟''اس پر استاذ بزرگوار سناٹے میں آ گئے اور لگے اپنی بات کا مطلب سمجھانے۔لاحول ولاقوۃ

آج کل ہم لوگ ڈیوٹی پوری کرتے ہیں،بے مطالعہ پڑھا کر وقت کاٹ لیتے ہیں یا بہت خلوص ہوا تو محنت سے سبق پڑھا کر کام ختم کر دیتے ہیں۔مگر مولانا عبدالسمیع صاحب کی طرح

کتاب یا مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس طرح محنت کرنا، اس قدر حوصلہ بڑھانا اور اس طرح اپنے کو بے قیمت بنانا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جس کے دل میں سلف کا خلوص، باپ کی شفقت اور استاذی کا جذبہ ہو۔ اس طریق کار اور اس خلوص سے جو لوگ تیار ہوتے ہیں وہ استاذ کامل بن کر نکلتے ہیں۔ اور وہ ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے خلوص ومحبت کے نظارے دیکھے ہیں۔ اس لیے وہ اس کی نقل اتار کر لوگوں کو خلوص ومحبت کا مزہ چکھاتے ہیں۔ ہم چنیں مسلسل۔ خوبی علم سے نہیں عمل سے ہوتی ہے۔

عظمت شخصیت:

داخلے کے وقت کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ جد محترم حضرت حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی نے فیض آباد سے ایک صاحب کو حلوا وغیرہ دے کر کہا تھا کہ دیوبند جا کر پہونچا دیجیے گا۔ وہ ٹی ٹی نہیں بلکہ ان سب کے نگراں (ریلوے کے ایک بڑے افسر) تھے۔ مغل سرائے سے سہارن پور تک طوفان میل سے جایا کرتے تھے۔ صبح کو دیوبند آئے، اسٹیشن پر ایک بزرگ سے پوچھا ''مدرسہ کدھر ہے؟'' انہوں نے کہا کہ ''میں بھی ادھر چل رہا ہوں میرے ساتھ آیئے۔'' دونوں تانگے پر بیٹھ گئے، تانگہ مدنی منزل پر رکا، اور وہ بزرگ اتر گئے۔ ان سے بھی کہا کہ آیئے! مہمان خانے میں ان کا سامان رکھ دیا اور وہ بیٹھ گئے۔ ذرا دیر کے بعد وہ بزرگ بھی آ گئے، اتنے میں چائے آ گئی، ناشتہ آ گیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی یہی بزرگ ہیں تو پسینے پسینے ہوگئے کہ مجھ جیسا گنہگار اور مولانا نے میری اتنی خاطر فرمائی۔ وہ اپنی ٹائی اور شرٹ بوٹ پر شرمارہے رہے تھے۔

شیخ کی کرامت:

پھر ہم دونوں بھائی بلائے گئے۔ شیخ نے پوچھا ''آپ ان صاحب کو پہچانتے ہیں؟'' ہم نے کبھی دیکھا نہیں تھا، انکار کر دیا۔ فرمایا ''تمہارے دادا کے یہاں سے آئے ہیں۔'' پھر سامان دیدیا اور ہم نے محمد سمیع صاحب کو لے جا کر دارالعلوم کی ایک جھلک دکھلائی۔ مگر وہ اپنی انگریزی چال ڈھال کے باوجود حضرت کی شفقت سے بہت متاثر تھے، کہنے لگے کہ ''میں نے نام تو سنا تھا

مگر ملاقات آج ہوئی۔ عجیب شخصیت ہے۔'' چھ مہینے کے بعد وہ پھر دیو بند آئے تو میں انہیں پہچان نہ سکا کہ یہ وہی ریلوے انسپکٹر صاحب بہادر سامنے کھڑے ہیں۔ سر پر ٹوپی، چہرے پر داڑھی اور جسم پر کرتا پائجامہ، دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اور حضرت شیخ کی کرامت بھی معلوم ہوگئی کہ ایک حرف نہیں فرمایا مگر اپنی محبت وشفقت اور برتاؤ سے انہیں بدل ڈالا۔ اسی لیے اقبال نے کہا:

''نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں''

پرانا دیو بند:

اس قسم کے واقعات دیو بند کی زندگی میں بار بار دیکھنے میں آئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تربیت کی بنیادی اینٹ کوئی اہم شخصیت ہے۔ اگر ایسی شخصیت کہیں میسر ہو جائے تو وہاں پتھروں سے ہیرے نکل آتے ہیں، ورنہ ہیرے بھی پتھر بن جاتے ہیں۔ دیو بند ان ہی لعل بدخشاں کی تلاش میں جاتے ہیں لوگ۔ اور بھیجتے ہیں بھیجنے والے۔ مگر یہ ساٹھ برس پہلے کی بات ہے، آج ایسے واقعات نہیں ہوتے، کیوں نہیں ہوتے؟ اس کو اہل دیو بند بتائیں گے!

مجھے دار العلوم سے جو کتابیں ملی تھیں ان کے لیے دو گھنٹے خالی تھے، اس میں جا کر میں ''حماسہ'' حضرت شیخ الادب صاحب کے پاس اور ''میر زاہد'' مولانا عبد السمیع صاحب کی خدمت میں سماعت کرتا تھا۔

درس ادیب:

حضرت شیخ الادب صاحب کا انداز درس پر مغز، تقریر مرعوب کن، شکل وشباہت اور اوقات کی پابندی دیکھنے کی چیز تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ مولانا میرک شاہ صاحب سے بہتر کوئی ادب کیا پڑھائے گا؟ لیکن حضرت شیخ الادب کا درس ایک بہتا ہوا دریا تھا۔ ایک ایک لفظ کی تحقیق، ابواب، معانی، صلات کا استعمال، پھر اعراب کے لحاظ سے معانی کی تبدیلی پر سیر حاصل بحث کرتے۔ سبق زور شور سے پڑھاتے تھے اور پورا گھنٹہ منٹ اور سکنڈ اس پر خرچ کر ڈالتے تھے۔

درمیان میں اگر کسی نے ٹوکنے کی ہمت کر ڈالی تو فرماتے ''مولوی صاحب! مولوی صاحب! آپ نے سنا نہیں میں نے ابھی یہ کہا تھا۔'' پھر قدرے تشریح کر کے سبق پر آ جاتے اور جوش وخروش سے پڑھانے لگتے۔ تقریر کی روانی میں اگر مدرسے کا گھنٹہ بج گیا تو تقریر ختم، کتاب

بند اور حضرت کتاب لے کر گھر کی طرف روانہ۔ چلنے میں چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے، تیز چلنے کے عادی تھے۔ راستہ متعین، انداز متعین، وقت متعین اور یہ بھی طے تھا کہ جو سامنے آئے گا اسے سلام ضرور کریں گے۔ بڑے سے بڑا ہو یا چھوٹے سے چھوٹا، طالب علم ہو یا ملازم! وہ انتظار کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ سلام میں پہل کرنا ان کی عادت بن گئی تھی۔ بہت سے لوگ سوچتے تھے کہ سر اٹھا کر دیکھیں تو سلام کریں مگر وہ چلے جا رہے ہیں، سر جھکا ہوا ہے، نظر اٹھی نہیں کہ ''سلام علیکم'' فرما دیا اور آگے روانہ۔

لاحول ولاقوۃ:

راستے میں کوئی بے تمیزی یا شور شرابا یا پھوہڑ پن نظر آ گیا تو چلتے قدم رک جاتے اور فرماتے ''مولوی صاحب! مولوی صاحب! لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' کبھی غصہ آ جاتا تو بھی لاحول پڑھ دیتے اور جس پر لاحول پڑھ دیا وہ پسینے پسینے ہو جاتا، سہم کر کھڑا ہو جاتا اور وہاں بالکل سناٹا چھا جاتا۔ آنے جانے میں اگر کوئی لڑکا کتاب پڑھتا یا تکرار کرتا ہوا مل جاتا تو بہت خوش ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ ارشاد دیوبندی کی جو پہلوان قسم کا آدمی تھا، ایک پشاوری سے لڑائی ہو گئی۔ دونوں غصے میں کھڑے ہو گئے۔ ارشاد خان نے پشاوری کو اٹھا کر پٹک دیا۔ نو درے میں طلبہ نے بھیڑ لگا دی، جب تک کہیں سے شیخ الادب صاحب نکل آئے۔ ارشاد خان نے ان کی جھلک دیکھ لی اور چھوڑ کر بھاگا تو دارالعلوم کی چہار دیواری کے باہر جا کر سانس لی۔ شیخ الادب صاحب نے اس پشاوری کو دلاسہ دیا، گرد جھاڑی اور ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگے کہ کہاں چوٹ لگی ہے اور مسلسل ''لاحول ولاقوۃ'' کا ورد جاری تھا۔ ساتھ میں ''استغفر اللہ'' بھی کہتے جاتے تھے۔ پھر مولوی ارشاد نے جا کر شیخ سے معافی مانگی تھی۔

رعب داب:

شیخ الادب کے قصے مزے لے لے کر لوگ بیان کرتے تھے اور جو لوگ بڑے جیالے بنتے تھے ان کی بھی اگر کبھی شیخ سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو قدرتاً سہم جاتے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیوں سہم گیا؟ اس قدر ان کا رعب داب تھا اور قدرتی طور سے تھا۔

سعید سلطان پوری نقل اتارنے میں بڑی مہارت رکھتا تھا، کبھی چھٹی کے دن سر پر صافہ

باندھ کر تین چار کتابیں بائیں طرف سینے پر رکھ کر، ذرا سا خمیدہ ہو کر ان کی طرح چلتا تھا تو لڑکے بہت محظوظ ہوتے تھے۔ اسی طرح کبھی حضرت مہتمم صاحب کی ''سبح اسم ربک'' کی نقل کرتا تھا تو شبہہ نہیں ہوسکتا تھا کہ قاری طیب صاحب نہیں پڑھ رہے ہیں۔ سریلی آواز اور پھر آواز میں زیر و بم آہستگی، روانی اور دلکشی ایسی کہ آدمی سنتا ہی رہ جائے۔ کیوں کہ دارالعلوم کے یہ دونوں حضرات افسانوی انسان تھے۔

میں اب بھی دیوبند جاتا ہوں تو مسجد کے چھوٹے دروازے کے برابر کی کھڑکی سے گزرتے ہوئے قدم سنبھل جاتے ہیں کہ حضرت شیخ الادب کی نظر نہ پڑ جائے۔

ہائے دارالعلوم:

پچھلے سال (۱۹۹۸ء) دارالعلوم جانا ہوا تو پھاٹک سے احاطہ مولسری دار جدید ہوتا ہوا مدنی گیٹ تک گیا اور بہت سے مولوی صاحبان، مولانا صاحبان ملے، آمنے سامنے ہوئے مگر کسی ایک نے بھی سلام نہیں کیا۔ پوری فضا سلام سے خالی الّا یہ کہ کوئی شناسا مل جائے۔

شخصیت:

ہمارے دور میں دو شخصیتیں ایسی تھیں کہ جس احاطے اور جس مجمعے سے گزر جائیں، سناٹا چھا جائے مگر اب دارالعلوم میں ایک فرد بھی ایسا نہیں جس کے گزرنے سے احاطہ مولسری یا احاطہ باغ یا دار جدید میں سناٹا چھا جائے۔ ایک بزرگ تھے شیخ الادب، دوسری شخصیت تھی شیخ الاسلام حضرت مدنی کی۔

تربیتی سانچہ:

یہی فضا ہوتی ہے جہاں شیطان بھی آتا ہے سر جھکا کر رہتا ہے اور اسی میدان میں لوگ آتے ہیں تو اپنا ماضی کھرچ کر یہاں کے رنگ میں ایسے رنگ جاتے ہیں کہ دارالعلوم سے نکلنے والے ہر شخص پر پورے ملک کو اعتقاد رہتا تھا کہ علم، دین اور سنجیدگی کا مجسمہ ہوگا۔ مگر وہ فضا بگڑتی چلی گئی اس لیے کہ وہ سانچہ رہ گیا نہ اس سائز اور معیار کے علما و اساتذہ۔

اگر یہ رنگ دیکھا تو پھر مولانا وحید الزماں صاحب میں دیکھا مگر ان کے معاصرین نے ان کو دارالعلوم میں صرف اس وجہ سے دبا دبا کر رکھا کہ ہم سب سے اونچا ہو جائے گا اس کا سر۔ پھر

بھی وہ حضرت شیخ الادب کی جگہ پُر کر سکتے تھے اور اپنے طلبہ، درس گاہ، کمرے اور آمد و رفت کے انداز میں وہ اس قدر مرعوب کن تھے کہ ان کی ادا، ان کا انداز خود ایک استاذ تھا۔ ان کے النادی الادبی کے سدھے ہوئے لڑکے پورے دارالعلوم میں ممتاز رہتے تھے۔ جس طرح حضرت شیخ الادب کے پاس جتنا علم، جتنا فن اور جس قدر ذہانت تھی وہ سب طلبہ اور دارالعلوم کو نذر کر دیتے تھے، یہی حال مولانا وحید الزماں صاحب کا تھا۔ اس لیے ان کے بنائے ہوئے لڑکوں کے پاس عربی ادب، عربی زبان، اسلامی انداز، مہذب سلیقہ اور ایک دوسرے کا لحاظ سب سے بہتر ملتا ہے اور وہ آج پوری دنیا میں نمایاں ہیں۔

سفر حج:

حضرت شیخ مالٹا سے ۱۹۲۰ء میں ہندوستان آئے تو یہاں انگریزی سامراج ان کو دشمن نمبر ایک سمجھتا تھا۔ حضرت شیخ نے ۱۹۴۰ء تک سات آٹھ سال برطانوی جیلوں میں گزارے تھے اور ہمیشہ سر بکفن تیار رہتے تھے۔ شوال میں ہم لوگ پہونچے تو چند ہفتے بعد سفر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ بہت سے علما و فضلا آپ کے ہمراہ ہو گئے۔ وہاں شیوخ مکہ و مدینہ نے بڑا استقبال کیا۔ کیوں کہ پچیس برس پہلے مسجد نبوی کے شیخ الحدیث اور شیخ الکل تھے۔ وہاں ہر فن کی کتابیں پڑھاتے تھے اور ہر ملک کے طلبہ کو ان کے مسلک کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔

حیرت ناک فیصلہ:

حضرت شیخ واپس آئے تو سہ ماہی امتحان ہو چکا تھا، ایک دن تعلیمات کا چپراسی تلاش کرتا ہوا آیا اور افضال کو اپنے ساتھ دفتر تعلیمات میں لے گیا۔ میں سخت حیران تھا کہ میرا بلاوا کیوں ہوا؟ کیا غلطی ہوئی؟ کیا شکایت ہوگئی؟ کس نے کی ہوگی؟ کیوں کی ہوگی؟ وساوس کے اس طوفان میں اڑتا ہوا جو وہاں پہونچا تو یہ دیکھ کر حیرانی اور بڑھ گئی کہ خود حضرت شیخ تشریف رکھتے ہیں اور حضرت شیخ الادب صاحب بھی ہیں۔ میں سلام کر کے بیٹھ گیا کہ جو کچھ بھی ہو۔

حضرت شیخ نے دریافت کیا ''کیا پڑھتے ہیں آپ؟'' میں نے کتابیں بتا دیں۔ بھائی عزیز سے کہا ''ان کا فارم نکالیے۔'' مجھ سے پوچھا ''امتحان دیا ہے؟'' میں نے کہا جی ہاں، تو بھائی عزیز سے فرمایا ''نمبر بتائیے۔'' انہوں نے ہر کتاب کے نمبر بتا دیئے کہ ہر کتاب میں پچاس

نمبرات ہیں، میٹرک میں ۴۸؍ ہیں۔ فارم لے کر دیکھا، غالباً یہ دیکھا ہوگا کہ کون سی کتابیں پڑھی تھیں، کون سی مطلوبہ تھیں اور کیا نتیجہ رہا تھا داخلہ کا؟۔

حضرت شیخ نے ذرا دیر کے بعد فرمایا ''اگر آپ کو مطلوبہ کتابیں دے دی جائیں تو پڑھ لیں گے آپ؟'' میں نے عرض کیا ضرور کوشش کروں گا۔ پھر شیخ الادب صاحب جو تعلیمات کے کرتا دھرتا تھے، حضرت شیخ تو سال میں دو چار مرتبہ یہاں تشریف لاتے تھے، ان سے کچھ فرمایا، انہوں نے ہامی بھر لی تو مجھ سے فرمایا ''جایئے آپ'' میں سلام کیا اور چلا آیا۔ لیکن یہ سمجھ لیا کہ شاید کتابوں پر نظر ثانی ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ صبح کو معلوم ہوا کہ مجھے جلالین، صدرا، میر زاہد اور حماسہ مل گئیں۔ خدا کا شکر ادا کیا اور یہ کتابیں پڑھنے لگا۔

واللہ اعلم:

مگر آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ حضرت شیخ سے کس نے کہا اور کیا کہا تھا؟ میں نے تو کبھی کچھ نہیں کہا تھا، نہ کسی سے سفارش کرائی تھی، نہ اتنی ملاقات تھی کہ جا کر کچھ عرض کرتا، نہ اب مجھے کتابوں کے لوٹنے کی کوئی شکایت تھی مگر سمیع صاحب کے واقعہ کے بعد حضرت شیخ نے پہچان لیا تھا کہ حاجی صاحب کا پوتا ہے۔ حاجی صاحب نے حضرت کے والد ماجد کے ساتھ گنج مرآباد میں پھر مدینہ منورہ میں برسہا برس گزارے تھے۔ اس لیے حضرت شیخ فیض آباد جاتے تھے تو ان سے ضرور ملنے جاتے تھے اور انہیں ''چچا'' کہا کرتے تھے۔ اس وجہ سے خیال کیا ہوگا، یا حضرت مولانا ضرغام الدین صاحب نے لکھا ہوگا جن سے میں نے کافیہ تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اور بڑے شفیق استاذ و مربی تھے۔ مربی ایسے کہ بچوں کی نشست و برخاست، ہنسی مذاق اور کھیل کود سب پر نگاہ رکھتے تھے اور ہر چیز میں سلیقہ، صفائی اور عمدگی پر زور دے کر آدمی میں کچھ بننے کا شوق ابھار دیتے تھے۔ یہ فن تربیت کا سب سے مشکل سبق ہے۔ جس محبت سے وہ منع کرتے تھے، جس شفقت سے غلطی پر سمجھاتے تھے یا شرارت پر جس طرح آنکھیں لال پیلی کرتے تھے اور ہم لوگ سہم جاتے تھے، وہ ان کے سب سے بڑے ہتھیار تھے۔

یہ ہمارے استاذ محترم جب بھی کسی مولانا کا نام لیتے تھے تو ''مولوی'' کہتے تھے مگر جب مولانا حسین احمد مدنی کا نام لیتے تو ہمیشہ ''مولانا'' کہتے تھے۔ ہم لوگ حیران تھے کہ وہ مولانا کتنے

بڑے ہوں گے جن کو ہمارے استاذ مولانا کہتے ہیں۔اس طرح انہوں نے ہمارے دلوں میں حضرت شیخ کی عظمت کے بیج ڈالے تھے۔وہ عمر میں حضرت شیخ سے بڑے تھےاور حضرت شیخ الہند کے بہت معتبر اور سنجیدہ شاگرد تھے،میاں اصغر حسین صاحب کے ساتھیوں میں سے تھے۔استاذ کے حکم سے حضرت میاں صاحب جون پور گئے تھے اور مولانا ضرغام الدین صاحب فیض آباد تشریف لائے تھے۔یہاں روافض سے مقابلہ کرنے میں اور بدعتی حضرات کی ریشہ دوانیوں سے کترا کر نکلنے میں اپنی عمر گزار دی اور اہل حق کے لیے ایک وسیع میدان بنا گئے۔لوگ آج تک ان ہی لائنوں پر چل رہے ہیں۔خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔(آمین)

طفرہ محال ہے:

جب مجھے میری مطلوبہ کتابیں مل گئیں تو صبح کو حاضری لینے میں میرا نام پہلی مرتبہ میر زاہد کی جماعت میں آیا تو مولانا عبدالسمیع صاحب نے نام لے کر فرمایا ''تو تو سلم میں تھا،تیرا نام میر زاہد میں کیسے آ گیا؟'' پھر خود ہی فرمایا ''اچھا!طفرہ محال ہے پھر یہ کیسے ہوگیا؟''میں نے کہا ''حضرت! محال ہوتا تو یہاں کیسے واقع ہو جاتا؟''اس پر ہنس کر رہ گئے اور میں میر زاہد پڑھنے لگا۔

جلالین:

میری جلالین مولانا ریاض الدین صاحب بہاری کے پاس گئی۔اوپر والی درس گاہ میں سبق ہوتا تھا۔مولانا بہت کم بولتے تھے مگر مفتی تھے کام کی بات کہتے تھے۔جلالین بہت مختصر اور قرآن فہمی میں مدد دینے والی تفسیر ہے۔یہ آدمی کو ادھر ادھر بھٹکنے نہیں دیتی،پھر اس کے سہارے پورا قرآن نظر سے گزر جاتا ہے۔اگر استاذ کامل ہو تو قرآن فہمی کی بہترین مشق کرا سکتا ہے۔اس میں لغت بھی ہے،نحو وصرف بھی ہے،معانی و بیان بھی اور تفسیر بھی۔جہاں جہاں اختلافات ہیں وہاں قول فیصل بھی۔جلالین کے سبق میں زیادہ تر عبارت میں پڑھتا تھا یا مولوی سعید بھاگل پوری۔یہ جوڑی سال بھر چلتی رہی حتی کہ ششماہی کے بعد حضرت الاستاذ کی طرف سے ہم دونوں کے سوا کسی تیسرے کو عبارت پڑھنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔

طلب کی آزمائش:

مولوی سعید بھاگل پور سے آیا تھا،حضرت شیخ الادب کے کسی شاگرد نے خصوصیت سے

بھیجا تھا۔اس لیے ان کے پاس بہت جاتا تھا۔اوران سے کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتا تھایا عربی مشق کیا کرتا تھا۔ کہنے لگا کہ جب پہلے سال آیا اور شیخ الادب صاحب سے سبق پڑھانے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے فرمایا''میرے پاس وقت خالی نہیں ہے۔'' پھر سوچ کر بتایا''اگر صبح تہجد کے بعد آجاؤ تو پڑھادوں گا۔''یعنی ڈھائی بجے رات کو۔میں صبح کو پہونچ گیا علم الصیغہ لے کر۔ دیکھ کر انہیں تعجب بھی ہوا اور خوش بھی ہوئے۔سبق بھی شروع کردیا مگر تین دن کی مستعدی دیکھ کر فرمایا ''اب مغرب بعد پڑھ لیا کرو۔''اس لیے مغرب کی نوافل کے بعد پڑھ لیتا ہوں۔اس کی نحوصرف بہت اچھی تھی،عبارت صاف اور تیز پڑھتا تھا۔میری نحو وصرف بہت کمزور تھی مگر روانی سے پڑھتا چلا جاتا تھا۔صاف اور تیز پڑھتا اس لیے کام نکل جاتا تھا اور میری کمزوری چھپ جاتی تھی۔استغفراللہ

صدرا:

صدرا فلسفہ قدیم کی اہم کتاب ہے اور مجھے اس وقت ملی تھی جب امتحان سہ ماہی ہو چکا تھا۔اس میں'' جزء لا یتجزی'' باطل کرنے کے لیے اقلیدس سے مدد لی ہے اور اقلیدس کے ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔اس لیے ایک صاحب کے ذریعہ درجہ فارسی کے ایک استاذ سے رابطہ کر کے اقلیدس کے چند ضروری سبق پڑھے۔پھر صدرا کے چھوٹے بڑے اسباق کو پڑھا تو سمجھ نہیں سکا۔پھر پڑھا اور پھر پڑھا،چوں کہ میبذی یاد تھی اس لیے حکما کا جو دعوی ہے وہ معلوم تھا اور جس طرح حکمانے جزءلایتجزی کو باطل کیا ہے وہ بھی یاد تھا تو صدرا بار بار پڑھنے سے حل ہوتی چلی گئی، حتی کی اقلیدس کی مدد سے چھوٹے بڑے تمام اسباق جس میں چند مشکل بحثیں تھیں وہ حل ہوگئیں۔ اس حل کرنے میں بعض بعض اسباق کو آٹھ آٹھ مرتبہ پڑھنا پڑا مگر جب تک سمجھ میں نہیں آگیا میں پڑھتا رہا اور حل کرتا رہا۔جب دل مطمئن ہو جاتا تو سمجھ لیتا تھا کہ بس۔

استاذ محترم:

اس کے استاذ مولانا عبدالجلیل صاحب تھے،ان کو فقہ کی کوئی کتاب دینی چاہئے تھی، معلوم نہیں کس مشابہت سے فلسفہ دیدیا گیا تھا؟اور وہ مدرسہ کی لاج رکھنے کے لیے پڑھاتے بھی تھے۔وہ بہت کم آمیز اور غصیلے نظر آتے تھے،اس لیے کبھی ہمت نہیں پڑی کہ جا کر دو چار سطریں پوچھ لیتا یا کوئی مسئلہ حل کر لیتا۔ایک مرتبہ حسب عادت سبق میں کچھ پوچھ لیا تو استاذ محترم ناراض

ہو گئے اور سخت لال پیلے ہو گئے۔ اس لیے کبھی حوصلہ نہیں ہوا کہ ان سے کچھ پوچھوں۔ مگر ایک کوفت سی اس وقت سے ضمیر میں ہوتی رہی کہ مطمئن بھی نہیں کرتے اور ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ آخر کیا کریں ہم لوگ؟۔

تازیانہ:

مجھے اس کی الجھن اس قدر بڑھی کہ آج تک یاد ہے۔ مگر اس الجھن کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس ۵۵ رسالہ ''درس زندگی'' میں جب بھی کسی بچے نے کسی وقت کچھ پوچھا یا اعتراض کیا یا سوال کیا تو اسے برا نہیں جانا، اسے سمجھانے کی پوری کوشش کی۔ اور اگر نہیں سمجھ سکا تو دوسرے دن بھی سمجھایا۔ کیوں کہ بچوں کو مضامین سے مطمئن کرنا میرا فرض ہے۔ اسی لیے میں ان طلبہ کو سمجھانے کی زیادہ کوشش کرتا ہوں جو کم ذہین ہوں۔ ان سے سوال کرتا ہوں، پھر سمجھاتا ہوں، پھر سوال کرتا ہوں۔ اس طرح طلبہ کا ذہن کتاب سے مربوط ہو جاتا ہے اور یہ سب دَین ہے مولانا کی ناراضگی کی۔ اس کتاب میں یونانی فلسفہ قدیم کو مدلل کر کے پیش کیا گیا ہے۔

یونانی فلسفہ:

دراصل حکمائے یونان ہزاروں برس سے اس میں مختلف الرائے رہے ہیں کہ دنیا کی اصل کیا ہے؟ ایک گروہ کہتا ہے ''زمین و آسمان اور کائنات کا وجود ایک واجب الوجود کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اس کا وجود ایک عقلی ضرورت ہے۔'' پھر وہ کہتے ہیں ''عناصر چار ہیں اور ان چاروں میں جو مشترک چیز ہے وہ ہیولی اور صورت جسمیہ ہے، جس سے کائنات مرکب کی گئی ہے اور مرکب کرنے والے واجب الوجود نے پہلے عقل اول کو پیدا کیا اور پھر دوم، سوم کو۔ ان سب نے مل کر پوری کائنات کھڑی کر دی۔'' یہ تھی حکما کی اٹکل۔

اگر چہ یہ مطلق کافرانہ فلسفہ تھا مگر دوسری صدی میں اہل اسلام نے اسے قبول کر لیا تھا اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل سے نبرد آزما رہے تھے۔

حکما کا دوسرا گروہ اس میں ترمیم کر کے اس طرف گیا کہ کائنات کی بنیاد ہیولی اور صورت جسمیہ سے نہیں بلکہ اجزائے فردہ سے ہے (وہ اجزا جو تقسیم در تقسیم کے بعد باقی رہ جاتے ہیں اور تقسیم نہیں ہو سکتے۔ جزلایتجزی)

پہلا گروہ اس فلسفے کو غلط کہتا ہے اور اجزائے فردہ کو محال کہتا ہے مگر ہماری کتابیں (صدرا شمس بازغہ وغیرہ) اسی نظریے کو پڑھاتی اور آج تک پڑھاتی چلی آرہی ہیں کہ ''اجزائے فردہ'' باطل اور غلط ہیں۔

انوکھا نظریہ:

ہماری درس گاہوں میں جب یہ مسائل آتے تھے تو اساتذہ مولانا محمد قاسم صاحب کا استدلال پیش کرتے تھے کہ وہ قدیم وجدید دونوں کی تردید کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ قیامت ضرور آئے گی اور خدا کے حکم سے آئے گی اور اس کا اعلان ہے ''**ومزقناهم كل ممزق**''۔ اس سے اجزائے فردہ کا ثبوت نکلتا ہے، لہٰذا یہی مسلک صحیح ہے۔ مگر ہمارے اساتذہ پڑھاتے یہی تھے کہ اجزائے فردہ باطل ہیں۔ یہ عجیب تضاد تھا۔ لیکن اس طرح حکما نے کسی واجب الوجود کا جو محض وہمی یا عقلی مجسمہ تیار کیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور ایک ایسے خدا کا وجود ثابت ہوا جو علم، ارادہ، فیصلہ اور پوری کائنات پر قدرت کاملہ رکھتا ہے اور اپنی پسند کا مالک ہے۔

جدت طرازی:

اس لیے مولانا محمد قاسم صاحب کا نظریہ اور استدلال بالکل انوکھا ہے مگر متروک۔ کیوں کہ وہ حکمائے یونان کے ہر طبقے سے بالکل مختلف اور متضاد ہے۔ حکمائے یورپ کے تمام نظریات سے مختلف بلکہ متضاد ہے۔ ہمارے اساتذہ کرام مولانا محمد قاسم صاحب کے نظریے کو بیان کرتے ہیں مگر ثابت کرتے ہیں حکمائے یونان کا نظریہ۔ اس لیے مجھے درس گاہ میں یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی کہ جزلایتجزی کو باطل بھی کرتے ہیں اور مولانا نانوتوی کا نظریہ بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ کیا بات ہے؟ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا، نہ سمجھ سکا۔

میرا خیال ہے کہ یہ تضاد اب تک قائم ہے۔ میبذی، صدرا اور شمس بازغہ پڑھانے والے معلوم نہیں کب تک ان نظریات کو سر پر اٹھائے پھریں گے اور ان پر نظر ثانی نہیں کریں گے؟

حکمائے یورپ:

ایک اور بات یہ بھی ہے کہ یہی یونانی علوم جنہیں عربوں نے منقح اور واضح کر کے غرناطہ اور اندلس سے یورپ پہونچایا تھا تو یورپ نے ان ہی حکما کی بنائی ہوئی رصد گاہوں میں جھانک کر

دیکھا تھا اور انکار کر دیا تھا کہ فلک اول دوم سوم چہارم کچھ نہیں ہے اور عقل اول دوم اور سوم سب واہمہ ہیں۔اور جب واہمہ ہیں تو زمانہ افلاک کی گردش کا نہیں، زمین کی گردش کا نام ہے۔اور اس کی گردش سورج کے ارد گرد ہورہی ہے اور چاند زمین کے ارد گرد گھوم رہا ہے۔اس طرح ایک نظام شمسی کا تصور پیدا کر دیا گیا۔جب کہ قرآن کہتا ہے"کل فی فلک یسبحون"(یٰس) تو حکمائے یورپ نے ہمت کر کے یونان کے فلسفے کی آدھی کائنات اجاڑ دی۔انہوں نے کہا کہ ہیولی اور صورت جسمیہ بھی واہمہ ہیں۔عناصر اربعہ بھی عناصر نہیں ہیں بلکہ کائناتی مرکبات ہیں۔عناصر سو کے قریب ہیں۔پھر اہل یورپ نے بعض حکمائے یونان کے اس نظریے کو قبول کرلیا کہ"کائنات میں مشترک عنصر جز لایتجزی ہے اور وہ ایک واقعہ ہے اس کو وہمی دلائل باطل نہیں کر سکتے۔

اجزائے فردہ:

چنانچہ ایٹم بم بنا کر جز لایتجزی کا تجزیہ کر کے یہی دکھا دیا کہ قدرت نے ان اجزا کی تقسیم کیوں نہیں جائز کی؟ وہ طاقت کا بے پناہ خزانہ ہیں، انہیں بند رہنے دو، ورنہ فوراً قیامت آجائے گی تو تجربہ کر کے ان کا ٹھوس وجود بھی تسلیم کرلیا گیا۔

علمی معمہ:

حیرت ناک واقعہ یہ ہے کہ یونانی فلسفہ یورپ پہونچ کر کیا سے کیا ہو گیا اور وہی فلسفہ عربوں میں آیا، ہندوستان اور مصر وشام آیا تو لوگ اس کو حرف آخر مان کر دنگ رہ گئے۔اور پھر اس سے اس قدر مرعوب ہو گئے کہ اسلامی عقائد کی تعبیر میں گروہ در گروہ ہو گئے۔جن لوگوں نے اسلامی عقائد کی پرواہ نہیں کی وہ حکما کہلائے، جنہوں نے ان کو عقل کی آخری کسوٹی سمجھ کر اس میں اسلامی عقائد کو پیش کیا اور حقیقی تعبیرات بدل ڈالیں وہ معتزلہ کہلائے۔ایک اور گروہ تھا جس نے یونانی فلسفے کو عقائد اسلامی پر اثر انداز نہیں ہونے دیا، اور نہ تعبیرات میں فرق آنے دیا بلکہ محنت کر کے ایسی تعبیرات ایجاد کیں کہ اسلام اسے قبول کر سکے۔یہ متکلمین اسلام اشاعرہ اور ماتریدیہ تھے جنہوں نے حکما کے نظریات کو بھی باقی رکھا اور اسلامی عقائد کو بھی۔اس سے ایک بڑا فتنہ ٹل گیا اور اسلام عقلیت پرستی سے مرعوب نہیں ہوا۔لیکن آج کی دنیا میں جب یونانی فلسفے کے پرخچے اڑ گئے ہیں اور یورپی فکر نے اسلام کو چیلنج دینا شروع کر دیا ہے تو پھر ضرورت ہے کہ اسلام کے دفاع کے

لیے سائنس اور فلسفہ جدید کو حاصل کر کے اسلامی عقائد کو صحیح ثابت کیا جائے اور یونانی واہمے سے آنکھیں پھیر کر حقائق کو قبول کرلیا جائے ۔جیسا کہ بہت سے حضرات نے مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات دیئے ہیں۔اوراس طرح کے لوگ اسلام کی توانائی کے لیے مسلمانوں کی رگوں میں نیا خون داخل کررہے ہیں۔کیوں کہ یورپ کا فلسفہ اسلام کے تصورات وعقائد سے زیادہ قریب ہے۔

لکیر کے فقیر:

سوال یہ ہے کہ ایسے حالات میں میبذی،صدرا کے ہزار سالہ پرانے فلسفے کی جگہ جدید فلسفے کو کیوں نہیں پڑھایا جاتا؟اور کیوں نہیں اس راستے کو قبول کیا جاتا جس پر چل کر فلسفہ جدید کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی چند قدم چل گئے ہیں اور کئی باتوں میں خاصی رہنمائی فرما گئے ہیں۔ان کی تجدید پر غور کیوں نہیں ہوتا۔

کاش اہل دیوبند،اہل سہارن پور اور درس نظامیہ کے شائق اس درد کو محسوس کرسکیں اور اسلامی حقایق کو بے کم وکاست حیران یورپ کے سامنے پیش کر سکتے۔

سفر افغانستان:

اس پہلے سال کا اہم واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب افغانستان تشریف لے گئے تھے۔ظاہر شاہ کا زمانہ تھا،وہاں کے علما،صلحا اور درباری لوگوں نے دارالعلوم کا بڑا استقبال کیا۔کیوں کہ علمائے دیوبند وہاں پہونچ چکے تھے۔دوایک دن حضرت قاری صاحب کے خیالات کی جانچ ہوتی رہی پھر ظاہر شاہ سے ملاقات ہوئی تھی۔اور مختلف مجلسوں میں حضرت قاری صاحب کی علمی گفتگو بھی ہوئی۔قاری صاحب فرماتے تھے کہ شروع میں فارسی بولنے میں تکلف ہوا مگر مسلسل اسی میں لگے رہنے سے جھجک ختم ہوگئی اور آسانی سے کام چلنے لگا۔

حضرت قاری صاحب نے اپنی استقبالیہ تقریر میں فرمایا تھا کہ وہاں جب کسی مشکل میں پھنستا تو میں خواب میں دیکھ لیا کرتا کہ مجھے ایسے موقع پر کیا کرنا چاہیے؟کس کے ساتھ رہنا چاہیے؟ میں روزانہ حضرت (مولانا حسین احمد) مدنی کو خواب میں دیکھتا کہ میری رہنمائی فرمارہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت قاری صاحب یہ بیان کرتے ہوئے جذباتی ہوگئے تھے۔

باب الظاہر:

جب واپس آنے لگے تو ظاہر شاہ نے حضرت قاری صاحب کو ۶۰ ؍ ہزار روپے دیے۔ ان ہی روپیوں سے دوسرے سال باب الظاہر کی تعمیر ہوئی اور میرے سامنے اکابر دارالعلوم نے تالاب کے کنارے اس کی بنیاد رکھی، اور اس کے کمروں اور برآمدوں کی تعمیر ہمارے دیوبند سے واپس آنے کے بعد تک ہوتی رہی۔ چنانچہ جب بعد میں دیوبند آنا ہوا تو ہم نے اوپر جا کر باب الظاہر کو دیکھا، اس کا سلسلہ مدنی گیٹ کی طرف سے مکمل ہو گیا تھا، ورنہ وہاں صرف بجنور منزل والا اکیلا کمرہ تھا۔ یہ قصہ ۴۰۔۱۹۳۹ء کا ہے۔ جب کہ آج ۱۹۹۹ء (۱۴۲۹ھ) ہے۔

شیخ کی کرامت:

حضرت قاری صاحب کے خواب، ان کی رہنمائی اور مشکلات کے حل کے لیے جو بات قاری صاحب نے فرمائی تھی، بہت دنوں تک دارالعلوم میں گونجتی رہی اور جلوس بھی یادگار رہا جو قاری صاحب کو اسٹیشن سے لے کر آیا تھا۔

کمرہ نمبر ۲۱:

ایک مرتبہ دارالعلوم میں مجلس شوری یا کوئی اور مجلس تھی، اس میں مولانا حبیب الرحمان صاحب (مولانا آزاد کے صدیق محترم) اور مولانا احمد علی صاحب لاہوری تشریف لائے تھے۔ حضرت شیخ حج سے واپس آچکے تھے۔ سات آٹھ اکابر کا جلوس حضرت شیخ کے گھر سے چلا تو حضرت شیخ بھی ہمراہ تھے۔ یہ اکابر دار جدید دیکھ رہے تھے، آدھے سے کم احاطہ بن چکا تھا۔ یہ قافلہ چلتے چلتے پچھم کی طرف مڑ گیا اور سیدھے ہمارہ کمرے ۲۱ پر آ گیا۔ ہم نئے تھے، گھبرا گئے مگر مولانا صفی اللہ، مولانا شمس الدین مبارک پوری، مولانا رشید احمد بریلوی پرانے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ حضرات کمرہ دیکھنے آرہیں ہے۔ وہ تشریف لائے اور سیدھے کمرہ میں داخل ہوئے اور چارپائیوں کے بیچ سے تالاب تک آ کر واپس ہو گئے۔ یہ تمام حضرات طلبہ کی رہائش کا انداز اور کمرے کی صفائی ستھرائی دیکھ کر واپس ہونے لگے تو حضرت شیخ نے ہنس کر فرمایا ''ابھی جھاڑو دی گئی۔'' مولانا صفی اللہ وغیرہ مسکرا کر رہ گئے ہم نئے لوگ تماشہ دیکھ کر رہ گئے۔ تب سمجھ میں آیا کہ مولانا صفی اللہ کہا

کرتے تھے کہ جب مہمان آتے ہیں اور کمروں کی رہائشی صورت دکھانی ہوتی ہے تو حضرت شیخ وغیرہ اس کمرے میں آجاتے ہیں۔اس لیے چار پائیاں سیدھی رکھا کرو، بستر وغیرہ ٹھیک رکھا کرو۔ چنانچہ سب ٹھیک تھا مگر کسی نے مزید صفائی کے لیے جھاڑو دیدی تو حضرت شیخ نے ٹوک دیا اور مسکرا کے چلے گئے۔ہم لوگوں کے لیے یہ مسکراہٹ صفائی کی شاباشی تھی۔

لطیفہ:

دوسروں کو سلام کرنا مجھے ہمیشہ سے اچھا لگتا ہے مگر حضرت شیخ الادب نے کئی مرتبہ پہلے سلام کر کے اتنا شرمندہ کردیا کہ ہر مسلمان کو سلام کرنا چاہتا ہوں، چاہے پہچانوں یا نہ پہچانوں۔

کمرہ ۲۱ کے بائیں طرف مدنی گیٹ کے قریب پانی کا نل لگا ہوا تھا،اس سے پورا علاقہ پانی لیتا تھا۔عصر کے وقت میں پانی لینے گیا تو ایک صاحب کہیں سے آگئے۔میں ان کو سلام کرلیا، ہم دونوں اجنبی تھے۔انہوں نے جواب تو دیا مگر منہ بنا کر۔ایسی مڈبھیڑ عصر کے وقت کئی دن ہوئی تو ایک دن بڑے غصہ میں مگر تمیز سے پوچھا کہ ’’آپ مجھے سلام کیوں کرتے ہیں؟‘‘میں نے سادگی سے کہہ دیا کہ میں سب کو کرتا ہوں، آپ کو بھی کردیا۔جب تک کوئی اور لڑکا آگیا میں نے اس کو بھی سلام کردیا۔پھر ایک دن عصر کے بعد سامنا ہوا تو اس مرتبہ اس نے پہل کر کے سلام کردیا اور میں جواب دے کر چلا آیا۔اتفاق سے وہ لڑکا حضرت شیخ کے گھر کے ساتھ دارالشفا کے جو کمرے ہیں ان میں رہتا تھا، جہاں بعد میں مولانا شبیر، مولانا محمد احمد، مولانا وکیل احمد فیض آبادی رہتے تھے۔ اس لیے وہاں بھی سلام علیکم ہونے لگی۔کبھی میں پہل کرتا کبھی وہ لیکن اب وہ لڑکا غصہ نہیں ہوتا تھا۔ وعلیکم السلام کہہ کر مسکرادیتا تھا۔چوں کہ ارشاد دیوبندی میرا اہم سبق تھا اور اس سے اس لڑکے کے تعلقات اچھے تھے،اس لیے ایک روز ملاقات کے بعد تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ محمد ارشد صاحب مرادآبادی ہیں۔پھر دوطرفہ سلام ہونے لگے اور ہوتے رہے عمر بھر۔

خلوص:

پھر ہم دونوں میں ایسے بہتر تعلقات ہوگئے کہ عمر بھر یاد رہیں گے۔ایک مرتبہ ارشد صاحب میری تلاش میں ۲۱ نمبر کمرے پر آئے تو میں موجود نہیں تھا،میری چار پائی باہر ٹوٹی پڑی تھی۔وہ دیکھ کر واپس گئے،اپنی چار پائی ٹھیک کرائی، بان لا کر بنوائی اور خود اٹھا کر لائے اور میری

جگہ بچھا کر چلے گئے۔ میں نے وہ چارپائی بنتے ہوئے دار الشفا میں دیکھی تھی مگر وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے لیے یہ عنایت کی جائے گی۔ اس درجہ کا مخلص انسان تھا ارشد۔

ارشد نے حکمت پڑھی اور والد صاحب کے ساتھ مطب کرنے لگے۔ آج کل ان کے بچے ارشاد وغیرہ مطب کر رہے ہیں۔ خدا آباد رکھے اس خاندان کو۔ میں امروہہ آیا تو حکیم صاحب سے بہت ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر اب برسوں سے نہیں ہوئی۔

نظام حیدر آباد:

اس سال کا ایک واقعہ اور بتادوں۔ ۱۹۴۰ء میں دار العلوم میں حضرت شیخ اور مسلم لیگی گروپ میں کشمکش ہوتی رہتی تھی، اس کا اثر دار العلوم کے اندر بھی تھا۔ اور ایک گروہ حضرت مدنی کی مخالفت میں کمر بستہ رہتا تھا جس کا تعلق لوگ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سے جوڑ دیتے تھے۔ اس زمانے میں وہ دار العلوم کے صدر مہتمم تھے اور حضرت قاری طیب صاحب مہتمم تھے۔ صدر مہتمم کا تعلق نظام حیدر آباد سے تھا اور بہت تھا۔ جب کہ نظام حیدر آباد کا اصرار تھا کہ حضرت مدنی کو دار العلوم سے علیحدہ کر دیا جائے، حتی کہ وائسرائے ہند کے اشارے پر نظام نے کہہ دیا تھا کہ ان کو دار العلوم سے علیحدہ کر دیجیے ورنہ ہزار روپیہ کا ماہانہ وظیفہ بند کر دیا جائے گا اور دار العلوم کی مجلس شوری نے اس پر غور کر کے حافظ محمد یوسف صاحب گنگوہی کے کہنے پر نظام کو لکھ دیا تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی دار العلوم کے صدر مدرس ہیں اور رہیں گے۔ آپ وظیفہ بند کر دیں گے تو خدا حافظ ہے۔

اسٹرائک کا ٹکٹ:

ایسے ماحول میں کسی نئے مسئلے پر دار العلوم کے طلبہ میں ہیجان پیدا ہوا اور اسٹرائک کی تیاری ہونے لگی۔ طلبہ میں سخت ہیجان نظر آیا تو مولانا صفی اللہ مجھے لے کر کہیں جانے لگے اور کہا کہ چلو تمہیں تماشہ دکھائیں۔ میں سازشوں سے ہمیشہ نابلد رہا ہوں مگر مولانا کے ساتھ چلا گیا۔ وہ احاطہ باغ کی طرف ایک تنگ وتاریک کمرے میں لے گئے جہاں آزادی کے ٹکٹ بنائے جا رہے تھے۔ ہم دونوں کے جانے سے وہاں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ اس کمرے میں مَیں نے محمود نانوتوی کو دیکھا جو مسعود نانوتوی کا بھائی تھا اور میرا ہم سبق تھا۔ مولانا مسعود فارغ ہو چکے تھے اور مولانا صفی اللہ کے ہم سبق تھے، اور پچھلے سال جمعیۃ الطلبہ کے صدر رہ چکے تھے۔ جب جلوس نکل رہا تھا تو صدر

جمعیۃ الطلبہ گھوڑے پر سوار ہوکر آگے آگے چل رہا تھا۔اسی صدر کا چھوٹا بھائی اسٹرائک کی سربراہی کرر ہا تھا۔اس دوران جمعیۃ الطلبہ کا صدر مجلس شوری میں بیٹھا کرتا تھا۔

ہم دونوں وہاں سے واپس آ گئے ،دوسرے دن ظہر کے بعد ہم نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا چاروں طرف آزادی کے ٹکٹ تقسیم ہورہے ہیں اور ہر طالب علم پر ذمہ داری ڈال دی گئی کہ اسٹرائک کو کامیاب بنائے۔

اسٹرائک واپس:

اسٹرائک والوں کی بدقسمتی کہ شام کی گاڑی سے حضرت مدنی پنجاب کے سفر سے واپس آگئے اورانہوں نے مسجد دارالعلوم میں آکرلڑکوں کی خوشامد نہیں کی بلکہ ڈانٹا اور بہت ڈانٹا اورفرمایا ’’اسٹرائک واپس لے لو۔‘‘ پھر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تعریف کی ان کی علمی شان کو سراہا، پھر فرمایا’’اگر تم نے اسٹرائک واپس نہیں لی تو میں خصوصی اوقات میں بددعا کروں گا۔‘‘ کون بدنصیب تھا جو شیخ کی اس برہمی اوراس قدر خطرناک دھمکی سے سہم نہیں جاتا؟ چنانچہ صبح ہوئی تو نہ کوئی اسٹرائک نہ کوئی ہلچل۔سب چیزیں ختم اورٹکٹ تقسیم ہونے کے باوجود ختم۔پڑھنے پڑھانے کا ماحول حسب حال۔

میں نے دارالعلوم مئو کی اسٹرائک دیکھی تھی ،پھر دارالعلوم دیوبند کی اسٹرائک کا اعلان دیکھا،تیاریاں دیکھیں اور واپسی کا پرسکون ماحول دیکھا۔اس میں حضرت شیخ کی شخصیت کا دلنواز اثر دیکھا اور ایسی شخصیت دیکھی جو اپنی حمایت میں ہونے والی اسٹرائک کو اس طرح واپس کراسکتی ہے۔بعد میں دارالعلوم میں کئی کئی اسٹرائکیں ہوئیں اوران پر مولانا فخر الدین صاحب جیسی ہستیاں اور مولانا اسعد صاحب جیسے مقبول شخص بھی کوئی اثر نہیں ڈال سکے۔مولانا منت اللہ،مولانا منظور نعمانی اور حضرت قاری صاحب وغیرہ کوئی اثر نہ ڈال سکے۔اوراس وقت ایک مرد قلندر کے ذرا سے تیور پر دارالعلوم کے درودیوار مسکرانے لگے۔ویسا نظارہ میں نے اپنی عمر میں بہت کم دیکھا ہے اس لیے وہ لمحات مجھے اب تک یاد ہیں۔

باہمی اعتماد:

ایک مرتبہ اعلان ہوا کہ دارالحدیث میں ترجمہ قرآن ہوگا اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی

بیان فرمائیں گے۔ چنانچہ دارالحدیث اندر سے باہر تک طلبہ سے کھچا کھچ بھر گئی۔ مولانا عثمانی نے تعوذ اور بسم اللہ کی تفسیر بیان فرمائی۔ پھر کسی نے اڑا دیا کہ ''تفسیر بھی سیاست ہے۔'' طلبہ نے جانا بند کر دیا اور تین دن بعد وہاں کوئی نہ گیا۔ اس قدر وہاں اندرونی کشمکش بھی تھی لیکن ایک مرتبہ مدنی گیٹ سے اکابر کا ایک وفد دارالحدیث کی طرف جا رہا تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا شبیر احمد عثمانی آگے آگے چل رہے ہیں اور شیخ مدنی احتراماً ان سے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ یہ تھا باہمی احترام اور تعلق کا منظر۔

دارالعلوم کا دوسرا سال آیا تو ۶۰۔۱۳۵۹(۴۱۔۱۹۴۰ء) میں نے اس آخری سال میں دورے کے اسباق میں زانوئے ادب اکابر دیوبند کے سامنے تہہ کیا۔

ترمذی:

صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک ترمذی حضرت شیخ مدنی کے پاس شروع سے آخر تک ہوتی تھی۔ میں نے پہلی صف میں شیخ کے سامنے کتاب رکھ دی اور وہیں سال بھر تک بیٹھتا رہا۔ میرے دائیں کونے میں ایک دراز ریش سفید پوش ریٹائرڈ تحصیل دار تھے جو شوق سے حدیث پڑھنے آتے تھے۔ ان کے بعد دائیں طرف ایک بنگالی صاحب نے جو بنگال کے مشہور مدرسہ عالیہ کی طرف سے دارالعلوم کا انداز درس سیکھنے کے لیے بھیجے گئے تھے، اور انہیں سو سے اوپر مدرسہ ماہانہ تنخواہ دیتا تھا۔ تحصیل دار صاحب تو سال بھر کچھ نہیں بولے البتہ پورا درجہ انہیں ''چچا'' کہتا تھا کہ سب سے بڑے تھے مگر وہ ناراض ہو جاتے تھے۔ پشاوری بھی چچا کہتے تھے۔

وہ بنگالی عالم حضرت شیخ سے کبھی کبھی سوالات ضرور کرتے تھے اور ہمیشہ حجۃ اللہ البالغہ یا ابن عربی یا غزالی کے حوالے سے سوال کرتے تھے اور حضرت شیخ پوری توجہ سے سوال سنا کرتے تھے، باقی دوسرے تمام حضرات کسی پرچے پر لکھ کر سوالات کرتے تھے مگر جواب ہر ایک کا ملتا تھا۔

انداز درس:

اس وقت دورے میں ۱۹۹؍طلبہ شریک تھے۔ سب سے بڑی عمر تحصیل دار صاحب کی تھی اور غالباً سب سے چھوٹی عمر راقم الحروف کی تھی۔ (کیوں کہ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں ۱۶؍سال کا تھا) اسی طرح ایک اور طالب علم غالباً لاہور کا تھا، مولانا احمد علی کے خاندان سے متعلق تھا، اس کی عمر

بھی بہت کم تھی ۔ ورنہ پشاوری وسرحدی بڑی عمر والے تھے جن کے بال پک رہے تھے۔ میرے چچا اور والد کی عمر کے تھے۔ تحصیل دار صاحب تو دادا تھے۔

جن طلبہ کو عبارت پڑھنے کا شوق تھا وہ نام لکھا دیتے تھے اور حضرت شیخ سبق شروع کرنے کے لیے ترتیب سے نام پکارا کرتے تھے۔ ان میں سب سے پرکشش آواز لاہوری لڑکے کی تھی ۔ بہت صاف، بہت صحیح اور رواں عبارت پڑھتا تھا۔ آخر میں میرا نام بھی تھا۔ تقریباً ۳۰؍ آدمی ہوں گے جو عبارت پڑھنے کی ہمت کیا کرتے تھے۔ یہی حال بخاری جلد اول میں تھا، دونوں کتابیں نو بجے سے بارہ بجے دوپہر تک ہوا کرتی تھیں۔

رات میں بخاری ''کتاب المغازی'' ہوتی تھی تو شیخ خود خطبہ دیتے تھے۔ عبارت پڑھتے اور قسطلانی جیسی طویل شرح لے کر اس طرح عبارت پڑھتے تھے کہ صرف متن شرح نہیں۔ عربی لہجہ، بلند آواز، شاندار عبارت کے ساتھ ساتھ ''ترجمۃ الابواب'' اور احادیث کی تشریح وتوضیح سے بڑا لطف آتا تھا۔

درسی کاپی:

بہت سے لڑکے شیخ کی تقریر لکھا کرتے تھے۔ مظہر اللہ قاسمی سرونجی کی کاپی بہت صاف اور خوش خط ہوتی تھی ۔ میں اس قدر تیز لکھتا تھا کہ تقریر ختم ہوئی اور قلم رک گیا۔ میں ترمذی کی تقریر کبھی کبھی عربی میں لکھا کرتا تھا مگر تقریر چونکہ اردو میں ہوتی تھی اس لیے اردو نقل بہتر ہوتی تھی ۔

عربی تقریر:

جب حضرت شیخ ۱۳۴۶ھ میں تشریف لائے تھے تو عربی میں سبق پڑھاتے تھے مگر لڑکے تکلف محسوس کرتے تھے، اس لیے اردو بولنے لگے۔ فرماتے تھے کہ ''مجھے عربی بولنے میں تکلف نہیں ہوتا مگر اردو میں عربی عبارتوں کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔''

حضرت شیخ فقہی انداز میں ترمذی میں خوب بولتے تھے مگر بخاری کا انداز دوسرا ہوتا تھا۔ جہاں کہیں امام بخاری نے فقہی ابواب میں اپنا رنگ دکھایا ہے وہاں بھی اکثر ترمذی کے حوالے کر دیا کرتے تھے اور وہیں جواب دیتے تھے۔

حضرت شیخ ہر مسئلہ میں تمام احادیث کے سامنے اپنے کو جواب دہ سمجھتے تھے اور ان تمام کے درمیان سے اپنا فقہی موقف نکال لاتے تھے اور ثابت کر دیتے تھے۔

وسعت درس:

حضرت شیخ کی تقریر بندھی ٹکی نہیں ہوتی تھی۔ اگر ان کی دس سال کی تقریریں جمع کر دی جائیں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس کس پہلو سے آپ نے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے۔

حضرت شیخ کا کمال اس وقت سامنے آتا تھا جب کوئی بے وقوف لڑکا سوال کرتا اور اوٹ پٹانگ سوال کرتا۔ مگر شیخ نہ اسے ڈانٹتے، نہ خفا ہوتے، بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کرتے تھے۔ کسی بے وقوف کو اہمیت دینا بڑے دل گردے کا کام ہے، پتہ نہیں خدا کس سے کیا کام لے لے!

ترمذی میں ''رفع یدین''، ''قرأۃ خلف الامام''، ''سور کلب'' جیسے چند مسائل میں ایک ایک ہفتہ تقریر ہوتی تھی اور مسئلہ کا کوئی پہلو تشنہ نہیں رہتا تھا۔

امام نووی، حافظ ابن حجر، امام بخاری اور ائمہ مجتہدین کے ساتھ ساتھ مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کی ''تحفۃ الاحوذی'' کا بھی جواب دیا کرتے تھے۔ اور میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی کے خلاف شان کوئی بات کہی ہو۔ اختلاف رائے کی حد تک پوری تفصیل سے بحث ہوتی تھی۔

ترجمۃ الباب اور ربط احادیث پر بڑا زور دیا کرتے تھے۔ ترمذی اور بخاری میں تو اس کا خاص اہتمام ہوا کرتا تھا۔

ہمارے زمانہ میں شمائل ترمذی شیخ الادب صاحب پڑھایا کرتے تھے اور اس میں چوں کہ ادب کی چاشنی بھی ہے اس لیے شیخ الادب صاحب اپنا فن دکھایا کرتے تھے۔

انوکھا مناظرہ:

ایک مرتبہ حضرت شیخ ملتان سے واپس آئے تھے تو ایک مکرانی بوڑھے طالب علم نے پوچھ لیا کہ حضرت! آپ ملتان تشریف لے گئے تھے، مناظرہ میں کیا ہوا؟

شیخ نے فرمایا کہ ''غیر مقلدین حضرات سے احناف کا مناظرہ تھا اس میں لمبی بحث موضوعات پر ہوتی رہی۔ میں نے عرض کیا کہ بلا کسی موضوع کے متعین کیے ہوئے جلسے کی کاروائی جاری رکھیے۔ اور میری طرف سے صرف ایک پیش کش ہے کہ آپ کے علمائے محترم میں سے کوئی

صاحب میرے سامنے بخاری شریف ایک ورق پڑھ دیں اور میں آپ کے علما کے سامنے بخاری شریف ایک ورق پڑھ دوں۔ جو صحیح بخاری پڑھ دے وہ جیت جائے ،اس میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر شیخ نے فرمایا کہ'' کوئی غیر مقلد عالم تیار نہیں ہوا تو میں جیت گیا اور چلا آیا۔'' اس پر پوری دارالحدیث ہنسی اور مسرت سے جھوم گئی۔

لطیفہ:

بخاری کے سبق میں کسی نے پرچہ دے کر چند سوالات کیے،اس میں شیخ نے فرمایا کہ '' چائے کی تین صفات ہیں۔لب دوز،لب سوز اور لب ریز۔لیکن جیسی چائے آپ لوگ پیتے ہیں وہ مکروہ ہوتی ہے۔'' مکرانی پھر بولا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ'' چائے کے معاملے میں مجتہد ہوں ،اور مجتہد پر دلیل واجب نہیں۔'' اس لیے ایک مرتبہ شیخ متھرا روڈ تشریف لائے ، ایک مولانا نے اہتمام سے چائے بنوائی اور مجتہد صاحب کے روبرو پیش کر کے داد تحسین وصول کرنی چاہی۔حضرت شیخ سے دریافت کیا کہ حضرت چائے پسند آئی ؟ ارشاد ہوا کہ چائے ٹھیک بنی ہے مگر بکس سے نکال کر بنائی گئی ہے۔وہ بھاگتے ہوئے گھر میں گئے ، بیوی نے بتایا کہ بکس کے اندر سے نئی چائے نکال کر بنائی تھی۔وہ واپس آئے اور تصدیق فرمائی کہ جی ہاں،اصل یہ ہے کہ چائے بہت چغل خور ہے۔اگر پانی کچا رہ جائے ،دودھ کچا رہ جائے ،جل جائے ،شکر کم ہو جائے تو چائے اسے برداشت نہیں کرتی،ضرور شکایت کردے گی۔ برتن صاف نہیں تھا، پیالی خراب تھی تو ہر بات کو بے تامل بیان کردے گی۔خصوصاً وہ چائے جو مولانا آزاد پیا کرتے تھے کہ دودھ بھی پڑ جائے تو میلی ہو جائے۔

نیند کا مٹکا:

رات کے وقت بارہ بجے تک سبق ہوتا تھا تو نیند ضرور آتی تھی۔کچھ لوگ اونگھتے ضرور تھے۔اور باہر سے لوگ ایک پرچہ لکھ دیا کرتے تھے کہ فلاں صاحب جھوم رہے ہیں۔حضرت شیخ کچھ فرماتے نہیں تھے،البتہ پرچہ بلند آواز سے پڑھ کر سناتے ضرور تھے۔اس سے دو کام ہو جاتے تھے،ایک تو ''الدرس خیر من النوم'' ہو جاتا تھا،دوسرے یہ کہ پوری جماعت تازہ دم ہو جاتی تھی،اور پھر سبق میں حاضری ہو جاتی تھی ،ورنہ جمع غائب ہو جاتی تھی۔اور وہ صاحب اٹھا کر مٹکے

تک ضرور بھیج دیئے جاتے تھے۔

کاموں کا ہجوم:

ایک دن سبق پڑھا رہے تھے اور نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ چند جملے بولنا مشکل ہوجاتا تھا۔ پھر نیند، پھر نیند،تو فرمایا کہ کاموں کے تسلسل سے۱۴؍دن ہوگئے سونے کا وقت نہیں ملا۔ہم لوگوں نے گزارش کی کہ اس وقت سبق ملتوی کردیا جائے تو مجبوراً قبول فرمایا مگر گھر پہونچے تو وہاں پر بہت سے مہمان موجود تھے،ان کی خاطر تواضع میں سارا وقت سونے کا پھر نکل گیا۔ برداللہ مضجعہ

درسی انہماک:

پنجاب سے صبح واپس تشریف لائے ،ناشتہ فرمایا اور سبق کے لیے دارالحدیث آ گئے۔ سبق پڑھا کر گھر تشریف لائے اور رات میں جمعیۃ العلما ہند کی مجلس عاملہ کی میٹنگ تھی،اس میں شرکت کے لیے ظہر بعد روانہ ہوگئے۔اگر ان کو آرام کرنے میں لطف آتا تو صبح سیدھے دہلی چلے جاتے اور رات میں مجلس عاملہ اطمینان سے کرتے۔مگر سبق کی ذمہ داری کا زبردست احساس انہیں دیوبند سے گزرنے نہیں دیتا تھا۔اس لیے اتر کر سبق پڑھاتے ،تب آگے بڑھ سکتے تھے۔اس کا نام تھا احساس ذمہ داری اور طلبہ سے محبت وخلوص اور دارالعلوم سے لگاؤ۔

ہم سے دوسال پہلے دارالتفسیر کی تعمیر ہوگئی تھی،انجینئر لوگ حیران تھے کہ نیچے ہال کی جو لمبی کمان ہے وہ نازک ہے۔اس کے اوپر دارالحدیث ہے،اس کے اوپر دارالتفسیر کی اتنی بڑی عمارت کو نچلی عمارت برداشت کرسکے گی یا نہیں؟۔

یہ مسئلہ جب شیخ کے سامنے آیا تو ارشاد فرمایا کہ عمارت کا بنانا ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کی ضروریات پوری کریں،لیکن باقی رہنے کی ذمہ داری اللہ تعالی کی ہے۔جو نقشہ ہے اسی کے مطابق بننے دیں اور وہ عمارت بن گئی۔بحمدللہ ۶۰؍برس ہوگئے اب تک باقی ہے اور اس میں دورۂ تفسیر وغیرہ ہوتا ہے۔

علم سے عمل تک:

حضرت شیخ جب باب السواک پڑھاتے تھے تو گھر سے مسواکوں کا بنڈل آتا تھا اور ہر

طالب علم کو ایک مسواک دی جاتی تھی۔ یہ مسواک ملتی تھی تو اس کی تاکید تھی کہ یہ ہمیشہ استعمال کرنی ہوگی۔

اسی طرح جب بخاری میں زہریلے جانور کے زہر اتارنے کا قصہ آتا تھا کہ ایک صحابی نے گاؤں کے چودھری کا زہر اتارا تھا اور وہ اتر گیا تھا تو ان کے ساتھیوں نے پوچھا کہ تم نے کیا پڑھا تھا؟ تو انہوں نے کہا کہ سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا تھا۔ اس روایت پر شیخ تمام طلبہ کو اس کی اجازت دیتے تھے کہ سورہ فاتحہ دعا وشفا کے لیے استعمال کر لیا کریں۔

وضاحت:

قرآن کے حروف، الفاظ اور معانی الہامی ہیں۔ اس لیے ان کی روحانیت زہر، امراض اور علتوں کے دفاع کے لیے مؤثر ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی روحانی شخص پڑھتا ہے تو تیز اثر ہوتا ہے ورنہ معمولی۔ اس لیے صاحب دل اور صاحب معرفت افراد کی دعامیں اور سورتوں کی زکوۃ دینے والوں کی دعامیں اور عام لوگوں کی دعامیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ مار گزیدہ پر سورہ فاتحہ پڑھ دیجیے یا سورہ اخلاص پڑھ دیجیے تو زہر کا اثر کم ہوگا اور اگر آپ نے ان سورتوں کو بار بار پڑھا ہے یا ان کی زکوۃ دی ہے تو ان دعاؤں کی روحانیت اور آپ کی روحانیت میں ربط باہم ہے۔ اس لیے فوراً اثر ہوگا اور زہر جاتا رہے گا۔ چوں کہ وہ صحابی تھے، ان کی روحانیت ہر ولی کی روحانیت سے برتر تھی۔ اس لیے جب انہوں نے سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کر دیا تو چودھری کھڑا ہو گیا۔ حضور ﷺ نے دم کر دیا تو آنکھیں ٹھیک ہو گئیں، اور بہت سے کام ہو گئے۔

ترمذی کی کاپی:

شیخ کی ترمذی کی درسی کاپیاں میں نے ۲۱ / عدد اکٹھی کر کے ان سب سے ایک تقریر تیار کی تھی، اس کی تصحیح بھی کی تھی، احادیث کی مراجعت بھی کر لی تھی اور وہ رکھی ہوئی ہے اگر چھپ جائے تو معلوم ہوگا کہ شیخ وقت کے پاس علم کا کتنا بڑا خزانہ تھا اور احادیث کی ترتیب وتاویل میں ان کو کس قدر عبور تھا۔ خدا مجھے توفیق دے کہ اسے چھاپ کر عام کر سکوں۔ میرے پاس کتاب الطہارت، کتاب الصلوۃ، کتاب الصوم اور کتاب الحج تک کی درسی تقریر جمع ہے، باقی کو میں نے ملتوی کر دیا تھا کہ اگر یہ ۱۴۰۰ / صفحات چھپ کر آ گئے تو آخر کے ابواب جمع کروں گا۔ وہ بہت مختصر بھی ہیں معلوم نہیں کون مرتب کرے گا کون نہیں؟ میرا ارادہ تھا کہ اصل تقریر اردو میں آ جائے تو پھر

اسے عربی میں منتقل کردیا جائے۔ان شاء اللہ

جذبۂ جہاد:

شیخ جب کتاب المغازی پڑھاتے تھے تو ایک مجاہد کی طرح تقریر بھی کرتے تھے اور جہاد پرزور بھی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم لوگ گھروں پر جا کر بھول جاتے ہو اور تین چیزیں یاد رہتی ہیں۔نون،تیل،لکڑی۔

تم غلام ملک میں ہو،اس میں جہاد کرنا تم پر فرض ہے۔ایک ہندوستان کی وجہ سے تمام ممالک اسلامیہ غلام ہیں اور برطانوی سامراج اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔حضرت شیخ کے ان کلمات میں اس لیے جان تھی کہ برطانوی سامراج کے خلاف انہوں نے برسہا برس جیل کی مصیبتیں جھیلی ہیں۔

ختم بخاری:

آخر سال میں جب بخاری ختم ہوتی تھی تو بہت بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی۔اس زمانے میں ختم بخاری کا میلہ نہیں لگتا تھا۔طلبہ نے آخری حدیث پڑھنے کے لیے اپنے اپنے نام دیئے تھے اور اسی ترتیب سے آپ پرچے پر نام پڑھتے تھے اور ایک حدیث ہر شخص پڑھ لیتا تھا۔مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ آج پرانی ترتیب نہیں چلے گی،نئی ترتیب چل رہی ہے اور میں نے اپنے نام کی پرچی نہیں بھیجی۔افسوس!

چنانچہ ایک نام بولا گیا اور ایک حدیث پڑھی گئی۔جب فہرست ختم ہوگئی تو حضرت شیخ نے بلا پرچے کے آواز دی ''افضال الحق اعظمی'' اور میں نے ایک حدیث پڑھی اور مسرت سے پھر شیخ کو دعا دیتا ہوا نکلا۔

آخری حدیث حضرت شیخ نے پڑھائی اور پھر مختصر تقریر کر کے دعا فرمائی اور بارہ سالہ میرے تعلیمی سلسلے کا آخری مرحلہ بحمد للہ پورا ہو گیا۔

بچی کا انتظار:

شیخ جب پڑھا کر گھر واپس تشریف لے جایا کرتے تھے تو بہت سے لوگ راستے میں بھی مسائل پوچھتے تھے،مشکلات حل کرتے تھے اور شیخ بلا تکلف بات کرتے ہوئے گزر جاتے تھے۔کچھ

لوگ حضرت کے ساتھ گھر تک ضرور جاتے تھے۔ اکثر دوپہر کے وقت بارہ بجے شیخ کی پہلی بچی ریحانہ کھڑی رہتی تھی اور اباجی کی انگلی پکڑ کر گھر تک ساتھ جاتی تھی۔ معلوم نہیں اس بچی کو کیسے معلوم ہوجاتا تھا کہ بارہ بج رہے ہیں اور وہ گھر سے گیٹ تک آجایا کرتی تھی۔

جب حضرت مہمان خانے میں جاتے تو عموماً پورا مہمان خانہ مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ ہر قسم کے مہمان، ہر سائز کے لوگ، ہر خطے کے آدمی ایک ہی دسترخوان پر ایک ہی قسم کے کھانے پر ایک ہی برتن میں کھاتے تھے اور حضرت شیخ اول سے آخر تک شریک رہتے تھے، حتی کہ بیماری کے زمانے میں جب حکیموں نے کہا کہ بڑا گوشت مضر ہے تو آپ کے لیے پرہیزی کھانا بکرے کا گوشت پکایا گیا تو شیخ نے بکرے کا گوشت بھینس کے گوشت میں الٹ دیا کہ ''میں اور کھاؤں مہمان اور کھائیں گے، ایسا نہیں ہوگا۔''

بازار بھاؤ:

۱۳۶۰ھ میں ششماہی امتحان کے بعد دونوں بھائیوں کی شادی کا خط آیا اور ہم اس سے فارغ ہوکر آگئے۔ فتح پور تال نرجا کے ایک ہی خاندان میں دونوں شادیاں ہوئی تھیں۔ واپسی کے بعد یاروں نے ولیمہ کا مطالبہ کیا تو بھائی قاری ضیاء الحق صاحب نے دوستوں اور ساتھیوں کی فہرست بنائی، وہ کم سے کم تعداد پچاس کی ہوگی۔ بھائی صاحب کو پکانے کا شوق بھی تھا اور ذوق بھی۔ بازار سے تین آنے سیر بکری کا گوشت، تین آنے سیر باسمتی چاول اور ایک روپیہ سیر گھی لاکر انہوں نے بریانی پکائی اور سب کے تقاضے پورے کردیئے۔ جب حساب لگایا گیا تو ہماری جیب سے پانچ روپے خرچ ہوئے تھے۔ آج کون باور کرے گا کہ اس میں پچاس آدمی کھا سکتے ہیں؟۔

ہم سبق:

اس دور کے ساتھیوں کی فہرست لمبی تھی مگر یاد نہیں رہی۔ پھر بھی مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مولانا فضل الرحمان امروہوی، مولانا عبدالجلیل سیوہاروی، مولانا ضیاء الحق دہلوی، مولانا شریف الحسن دیوبندی، مولانا ارشاد علی دیوبندی، مولانا عامر عثمانی دیوبندی، مولانا سعید احمد سلطان پوری، مولانا نیاز محمد گڑگانوی، مولانا کفایت اللہ پرتاب گڑھی، مولانا شمس الدین مبارک پوری، قاری عبدالمنان کلکتہ، مولانا سعود احمد جون پوری، مولانا ضیاء الحسن لکھنوی، مولانا سعید احمد بھاگل

پوری،مولانا شرف الدین بلیاوی،مولانا مظہر بقا سرونجی(مکہ مکرمہ) جیسے حضرات اب بھی یاد ہیں، غالبًا عبدالقادر لاہوری بھی تھے۔اور مولانا عبدالباری مبارک پوری،مولانا صفی اللہ گورکھ پوری، حکیم محمد زماں بلیاوی ،مولانا وجدی الحسینی بھوپال،مولانا ضیاء الدین بردوانی،مولانا عبدالسمیع سلطان پوری،مولانا برکت اللہ بلیاوی وغیرہ مجھ سے ایک سال پہلے فارغ ہو چکے تھے۔کچھ دارالعلوم میں موجود تھے، کچھ جاچکے تھے۔

یہ وہ حضرات ہیں جو کام کرتے رہے اوران سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور کام سامنے آتے رہے۔مگراب گنے چنے چند آدمی باقی ہیں جو پرانی یادگار ہیں اورحضرت شیخ کا نام زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

لطیفہ:

ایک مرتبہ دیوبند میں حضرت شیخ کے درسترخوان پر ہم تین ساتھی اکھٹے ہوگئے تھے۔ مولانا عبدالجلیل بستوی،مولانا منظور بجنوری مہتمم مدرسہ شاہی اور راقم الحروف۔کھانے میں ایک مظفرنگر کا دیہاتی شامل تھا۔شیخ نے اس سے خیریت پوچھی،اس نے بچے کی ترقی کے لیے دعا کی درخواست کی۔پوچھا کیا پڑھایا ہے؟اس نے کہا ''انگریجی''۔فرمایا عربی کیوں نہیں پڑھائی ؟وہ خاموش رہا پھر سوچ کر بولا کہ ''حضرت جی!عربی پڑھ کر سکوار (علاقائی عامی لفظ جس کا مفہوم ہے لاغر کمزور، جسے غربت وناداری کے سبب کھانے کو نہ ملے اور سوکھ جائے)بہت ہوجاتے ہیں۔'' شیخ نے ہم تینوں موٹے مولویوں کی طرف اشارہ کرکے اس سے فرمایا کہ یہ تینوں مولوی ہیں اور دیکھو سکوار نہیں ہیں۔وہ دیکھ کر خاموش ہورہا اور ہم لوگ مسکرا کر رہ گئے۔مگر سکوار ہونے کا الزام بھی خوب رہا۔

لطیفہ:

صبح کا وقت تھا،حضرت شیخ کے یہاں ولادت ہوئی تھی،ناشتہ پر کسی دیہاتی نے سن لیا کہ بچہ پیدا ہوا ہے۔اس نے حضرت شیخ کو بڑی لمبی مبارک باددی۔''مباریک مباریک'' حضرت جی!ہم تو مٹھائی کھائیں گے،اندر سے مٹھائی منگوا کر دیدی گئی۔

دارالحدیث میں تشریف لائے تو ترمذی کے سبق میں مکرانی مولوی نے زور سے کہا کہ ''سنا ہے آپ کے یہاں کوئی مہمان آئے ہیں۔مٹھائی چاہیے۔'' شیخ نے فرمایا ''بھائی!جوان کے

گھر بچہ پیدا ہوتا ہے تو مٹھائی مانگی جاتی ہے، بوڑھے کے یہاں کیسی مٹھائی؟'' مکرانی نے برجستہ جواب دیا کہ ''حضرت! جوانوں کے گھر اولاد ہوتی رہتی ہے، بڑھاپے میں مٹھائی واجب ہے۔'' اس جواب سے پوری درس گاہ گونج گئی اور حضرت شیخ بھی ہنسنے لگے۔ چنانچہ ظہر بعد شیخ الادب صاحب کے ابوداؤد کے سبق میں دو طبق لڈو آئے اور ہم لوگوں میں تقسیم ہوئے۔ اس بچے کا نام شیخ نے ارشد رکھا اور آج محترم مولانا ارشد صاحب ہیں۔ خدا عمر دراز کرے، دارالعلوم کے ناظم تعلیمات ہیں۔

اس وقت جو لوگ دارالعلوم میں موجود تھے وہ بہت تھے، مگر ہماری جن سے علیک سلیک تھی ان میں مولانا محمد نعیم دیوبندی، مولانا ضمیر احمد جلال پوری شرح جامی پڑھتے تھے۔ مولانا ریحان الدین سلطان پوری مشکوۃ میں تھے۔ مولانا اسعد صاحب گلستاں پڑھ رہے تھے اور میاں فرید نحو میر میں تھے۔ مولانا ارشاد فیض آبادی کمرہ نمبر ۲۱ رمیں میرے ساتھ تھے اور ہدایۃ النحو وغیرہ پڑھتے تھے۔ بہت پر مذاق، برجستہ، مناظرہ باز لیکن نماز جماعت سے نہیں صف اول میں امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے تھے۔ صاف ستھرے رہتے تھے، مجھ سے ان کی بڑی نوک جھونک رہتی تھی مگر بھائی ضیاء الحق سے بہت بنتی تھی۔ اور مودود جون پوری جیسے بہت سے لوگ تھے جن کے نام نہیں یاد رہے، صورتیں یاد آجاتی ہیں اگر کہیں ملاقات ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ بمبئی میں بس سے جارہا تھا، ایک مولوی صاحب مل گئے، کہنے لگے ''تم افضال ہو''۔ میں نے کہا آپ نے دیوبند پڑھا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہم دونوں ہم سبق ہیں۔ تقریباً تیس برس کے بعد پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ کہنے لگے میں ایک کمپنی میں شریک ہوں، ایک آنے کی شرکت ہے اور صرف چند ہوٹلوں میں جا کر حساب چکتا کرتا ہوں، یہی میری حصہ داری ہے اور میرے مصارف کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

ایسے ساتھی جشن صد سالہ میں بہت مل گئے تھے، مولانا بایزید گجراتی افریقہ سے آئے تھے، مولانا زاہد لاہور سے اور بہت سے ساتھی جو بڑے مولانا بن گئے تھے مگر ملے تو ساتھی بن کر ملے، محبت سے ملے۔

ساتھیوں میں سب سے زیادہ بے تکلفی اور برسوں کا ساتھ مولانا سعید احمد سلطان پوری

سے رہا، وہ جمعیۃ علما ہند کے دفتر میں دادا مشہور تھے۔ مولانا اسعد صاحب بھی انہیں دادا ہی کہتے تھے۔ یہ لقب انہیں احمد آباد سے ملا تھا جہاں وہ قلندری مسجد میں دیوبندی عالم بن کر برسوں رہے تھے، اور احمد آباد کے غنڈوں سے بار بار مقابلہ کیا تھا۔ اس لیے دادا مشہور ہو گئے تھے، اور تھے بھی اپنے مزاج اور کارناموں کے سبب احمد آباد کے دادائے محترم۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

مسلم شریف:

مسلم شریف حضرت علامہ ابراہیم بلیاوی صاحب کے پاس شام کو آخری گھنٹے میں ہوتی تھی۔ مولانا بلیاوی کا سبق بہت شاہانہ ہوتا تھا، آواز بہت تیز نہیں تھی، بالکل اس طرح پڑھاتے تھے جیسے گفتگو کرتے ہوں۔ مگر ہر طالب علم کوشش کرتا تھا کہ ان کی ہر بات کان میں پڑ جائے۔ اس لیے بہت غور سے سنتے تھے۔

علامہ ابراہیم صاحب:

وہ کم بولتے تھے مگر جو کچھ بول دیتے تھے وہ حرف آخر ہوتا تھا۔ اسی لیے حضرت شیخ فرماتے تھے کہ اگر مولانا ابراہیم صاحب پہلے وقتوں میں ہوتے تو آج ان کے اقوال نقل کیے جاتے لیکن جب یہ تبصرہ کسی نے علامہ بلیاوی تک پہونچایا تو فرمایا ''مولوی صاحب! اگر یہ بات ہوتی تو میں ہی شیخ الاسلام ہوتا۔''

مسلم کے درس کی میں نے ترمذی بخاری کی طرح پوری کاپی لکھی تھی مگر کوئی شوقین صاحب مجھ سے مانگ کر لے گئے اور اتنے بے وقوف نہیں نکلے کہ پھر واپس کر دیتے۔ ہوشیار تھے۔

ایک مرتبہ معراج والی روایت آئی تو کسی لڑکے نے پوچھا کہ ''حضرت! فلک الافلاک کی حرکت بہت تیز ہے تو معراج کا سفر کیسے ہوا؟'' علامہ نے برجستہ فرمایا کہ ''مولوی صاحب! کرہ گول ہوتا ہے اور کرہ کی حرکت محور پر نہیں ہوتی، مدار پر ہوتی ہے۔ اس لیے جبریل کو معلوم ہوگا کہ حرکت کہاں سریع ہے کہاں بطی ہے، جہاں حرکت کم تھی وہاں سے گزار کر لے گئے ہوں گے، اس لیے کہ وہی سفر کرا رہے تھے۔''

ضعیف روایت:

سہ ماہی امتحان کے بعد سبق شروع ہوا تو دارالحدیث میں تشریف لائے، فرمایا کہ ''مولوی صاحب! آپ کے ایک ساتھی نے امتحان کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ابن عمر ضعیف راوی ہے۔'' تم دیکھو کہ وہ کیسا راوی ہے؟''

لڑکے ہنسنے لگے مگر پتہ نہیں چلا کہ اتنا بڑا محقق کون تھا؟ علامہ نے بھی نام نہیں بتایا مگر اچھی تفریح رہی۔ پورے دارالعلوم میں بات مشہور ہوگئی کہ ابن عمر ضعیف راوی ہے۔

حافظ صاحب:

اور جب حافظ ابن حجر کا حوالہ دیتے تھے تو فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! حافظ صاحب نے کہا ہے۔ پھر فرماتے کہ حافظ جی وہ ہوتے ہیں جو میاں جی ہوں یا آنکھ سے محروم ہوں۔ مگر حافظ صاحب، ابن حجر عسقلانی کے لیے استعمال کرتا ہوں۔

بعض احادیث کی تاویل ہوتی رہتی ہے اور سبھی کرتے ہیں، اگر تاویل نہ کی جائے تو بہت سی روایات کا جمع ہونا ممکن نہ رہے۔ اس لیے بعض جملوں کے کئی کئی معنی بتائے جاتے ہیں۔ حضرت علامہ کے یہاں ایسا کبھی نہیں ہوا، وہ فرماتے تھے کہ مولوی صاحب! مصنف جو بات کہتا ہے اس کی منشا ایک ہی ہوتی ہے۔ کئی کئی مطلب نہیں ہوتے، اس لیے اس کی منشا معلوم کرنی چاہیے۔

کسی نے کہا کہ بعض حضرات ایک ایک عبارت کے کئی کئی مطالب بیان فرماتے ہیں تو فرمایا کہ مولوی صاحب! یہ اتقان کی کمی سے ہوتا ہے اور متکلم کی منشا ایک ہی ہوتی ہے۔ سبحان اللہ! کیا فرق بتایا ہے۔

نور یا منور:

ایک مرتبہ مجھ سے اور ایک مولوی صاحب سے علم کی تعریف پر بحث ہوگئی اور اس میں سلم اور ملاحسن کے حوالے دیئے گئے۔ کتاب لائی گئی، پھر بھی میں اپنی رائے پر، مولوی صاحب اپنی رائے پر قائم رہے اور ہم دونوں اس پر متفق ہو کر علیحدہ ہوئے کہ اختلاف رائے قائم ہے۔

میں نے جا کر حضرت علامہ سے دریافت کیا تو حسب عادت پوچھا کہ مولوی صاحب! کہاں سے شبہہ ہوا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حجۃ اللہ البالغہ اور ملاحسن کی عبارتوں سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ میں یہ کہتا تھا اور دوسرے صاحب یہ کہہ رہے تھے۔ فرمایا کہ مولوی صاحب! صاحبِ سلم نے جو فرمایا ہے "کالنور والسرور" تو اس نے نور کہا ہے، منور نہیں کہا ہے۔ اور یہ چاند، سورج، ستارے، سب منور ہیں، نور نہیں ہیں۔ نور ان سب کا مبدأ ہے اور ان میں مشترک ہے۔ مسئلہ بحمدللہ حل ہوگیا۔ اس نور اور منور کی تشریح سے ذہن صاف ہوگیا۔ ہم دونوں اس میں امتیاز نہیں کر پا رہے تھے۔

دعوت شیراز:

منگل کے دن حضرت شیخ ،حضرت علامہ اور دوسرے اکابر کا طے شدہ پروگرام کے مطابق شام کو یکجائی کھانا ہوتا تھا۔ مگر ایک جگہ نہیں، جگہ جگہ۔ اس میں یہ شرط ہوتی تھی کہ جس کے یہاں آج جمع ہوں گے وہاں اپنا اپنا کھانا لے کر آویں گے، اور کوئی تکلف نہیں ہوگا۔ تیسری شرط یہ تھی کہ جس کے یہاں آج کا کھانا ہے اسے صرف کسی میٹھے یا نمکین آئیٹم بڑھانے کے اجازت ہے ورنہ وہ برادری سے خارج۔ اس پر حضرت شیخ بہت سختی سے عمل کرتے تھے اور عمل کراتے بھی تھے۔ اور اس کے بغیر دعوت شیراز زیادہ دنوں چل ہی نہیں سکتی تھی۔

ہم دونوں بھائی معمول کے مطابق حضرت علامہ کے یہاں مغرب بعد حاضر ہوتے تھے تو عشا کے قریب دیکھا کہ مولوی محمد زماں اور مولوی برکت اللہ بڑا خوان لے کر حضرت شیخ کے یہاں جا رہے ہیں۔ اور حضرت مولانا سمیع صاحب کو دیکھا کہ ایک ہاتھ میں سالن کا ڈھکا ہوا برتن اور دوسرے میں دسترخوان میں لپیٹی ہوئی روٹیاں لے کر دعوت شیراز میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔ مولانا کی بے نیازی اور سادگی عجیب وغریب تھی۔

یہ دعوت ہے تو معمولی چیز لیکن علماء کرام میں جو صورت حال اور چپقلش رہتی ہے اس کا بہترین علاج بھی ہے۔ آپس میں بیٹھنا، کھانا، پینا بے تکلف باتیں کرنا، ایک دوسرے سے قریب ہونا، ہنسی مذاق اور تفریح میں بھی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں مگر یہ سلسلہ مدارس میں عام طور سے دیر تک نہیں چلتا، حالاں کہ اسے چلنا چاہیے۔

طحاوی شریف:

اس سال طحاوی شریف جیسی کتاب جو امام بخاری ومسلم کے معاصر نے لکھی ہے اور اس میں ان تمام احادیث کی نشان دہی فرمائی جو احناف کے مستدل ہیں۔حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کے پاس تھی۔حضرت الاستاذ کسی باب پر بحث کر کے اس کے مالہ وماعلیہ کی طرف اشارہ کر دیتے تھے، پھر عبارت پڑھوا دیتے۔اس سے کتاب سے ان کی دلچسپی اور اس پر ان کا عبور نظر آتا تھا۔ ورنہ عام طور سے سے یہ کتاب مؤطا امام محمد اور مؤطا امام مالک کی طرح تبرکاً ہوتی ہے۔چند صفحے پڑھا دیئے اور بس نصاب کی تکمیل ہوگئی۔مگر مفتی صاحب نے بتادیا کہ یہ کتاب امام طحاوی کی ہے۔

مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب اپنے علم،فتاوی اور فیصلے کے لیے پہلے سے مشہور تھے مگر سبق میں ان کا علم،ان کی تقریر،ان کی سنجیدگی بہت نمایاں ہوتی تھی۔بڑی سے بڑی بات نہایت آسان طریقے سے سمجھا دیتے تھے۔

ابوداؤد:

میں جس سال دارالعلوم میں داخل ہوا ہوں،حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب پابندی سے ابوداؤد پڑھاتے تھے مگر اس کے بعد اپنے ضعف کی وجہ سے انہوں نے سبق بند کر دیئے تو ظہر بعد حضرت شیخ الادب کے پاس آ گئی۔ظہر بعد فوراً درس گاہ میں حاضری اور فوراً ہی طلبہ کا رجسٹر حاضری کھول کے ان کی حاضری خود ہی لینا شروع کر دیتے تھے۔پھر سبق شروع کراتے تو پورا گھنٹہ جم کر پڑھاتے تھے۔

انداز درس:

پورے سبق میں ایک پاؤں بچھا کر بیٹھتے اور ایک پیر کھڑا رکھتے۔آلتی پالتی مار کر بیٹھنا درس حدیث کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے یا عادی تھے۔سبق میں کوئی چٹکلہ،کوئی دلچسپ جملہ یا واقعہ،تشحیذ اذہان کی کوئی کوشش ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔مگر کتاب حل کرنے میں اور مسائل کا احاطہ کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔حاضری کو یقینی بنانے کے لیے کبھی ابتدا میں حاضری لیتے،کبھی درمیان اور کبھی کبھی سبق ختم ہونے سے ذرا پہلے۔اس لیے طلبہ ان کے سبق میں بہت کم غیر حاضر ہوتے،کیوں کہ کچھ معلوم نہیں کب حاضری لے لیں اور غیر حاضر کر دیں اور ان کی سرزنش سننی پڑے۔

بقیہ کتابیں چند چند اسباق یا صفحے پڑھا دیئے گئے چاہے کوئی پڑھے یا نہ پڑھے اور نصاب کی تکمیل ہوگئی۔

قاری محمد طیب صاحب:

حضرت مولانا فخر الدین صاحب کے انتقال کے بعد مدرسہ مفید الاسلام میرٹھ میں حضرت قاری محمد طیب صاحب سے ملاقات ہوگئی، میں نے دیکھا کہ فرصت میں ہیں تو میں نے چند باتیں عرض کی تھیں اور انہوں نے اس کو قبول بھی فرمالیا تھا۔

ان سے ایک گزارش یہ بھی کی تھی کہ دورے میں جن امہات الکتب کو پڑھاتے ہیں اگر ان میں پڑھانے کی ترتیب بدل دی جائے تو تکرار بھی نہیں ہوگی، فائدہ بھی بڑھ جائے گا۔ مثلاً بخاری میں کتاب الایمان، ترمذی میں کتاب الطہارت و کتاب الصوم، مسلم میں کتاب البیوع، ابوداؤد میں کتاب النکاح وغیرہ۔ تو بہ یک وقت تمام مباحث کا اجرا ہو جاتا۔ غالباً اس گزارش پر کچھ عمل تو ہوا مگر اساتذہ اسے قبول نہیں فرما سکے۔ کیوں کہ نئے سرے سے محنت کرنا دردسر ہے۔ کاپیوں کی مدد سے بوجھ اتارنا آسان ہے۔

سالانہ اجلاس:

سال کا آخر ہوتا تو ہر صوبائی انجمن، ضلعی انجمن اور نادیۃ الاتحاد جس میں مشترکہ انجمن کے اجلاس ہوتے ہیں، اس میں قاری ضیاء الحق صاحب کی شاندار قرأت اور عامر عثمانی جیسے شعرا کی نعت یا نظم پڑھی جاتی تھی۔

عامر عثمانی:

ایک دن عامر عثمانی میرے کمرے پر آ گئے، مجھے باہر لے گئے اور کہا کہ آؤ! حضرت شیخ کے گھر چلیں۔ پھر بتایا کہ ایک نظم لکھ رہا ہوں، اس کا مطلع نہیں بن رہا ہے، اگر حضرت شیخ کو دیکھ آؤں تو میرا مطلع تیار ہو جائے گا۔ ہم دونوں شیخ کے مہمان خانے پہونچے تو ذرا دیر میں حضرت اندر سے باہر تشریف لائے۔ مہمانوں نے مصافحے کیے، ہم لوگ حکماً بیٹھے رہے کہ تعظیماً کھڑا ہونا حضرت کو ناگوار ہوتا تھا، سخت ڈانٹتے تھے۔

کھانا شروع ہوگیا تو عامر عثمانی نے کہا کہ چلو، دیکھ لیا، اب مطلع ہو جائے گا۔ چنانچہ

دوسرے دن رات میں ایک صوبائی اجلاس تھا،اس میں قرأت کے بعد عامر پڑھنے آئے تو حضرت شیخ کی شان میں ایک نئی نظم پڑھنی شروع کردی۔حضرت اگر موجود ہوتے تو کاغذ لے کر پھاڑ دیتے مگر وہ نہیں آئے تھے تو لڑکوں نے دل کھول کر داد دی۔دارالحدیث اندر سے باہر تک بھری ہوئی تھی عامر نے جب مسحور کن آواز میں یہ شعر پڑھا تو دارالحدیث جھوم جھوم گئی:

نہ شوق راحت نہ خوف کلفت امیر بھی ہے فقیر بھی ہے
جو وقت آئے تو قلب باطل پہ اک دلدوز تیر بھی ہے

صبح ہوئی تو بچے بچے کی زبان پر یہ شعر تھا۔اس میں حقیقت،شاعری اور عقیدت تینوں کو سمیٹ کر لوگوں کا دل جیت لیا تھا،اور شیخ کی ہو بہو تصویر اتاری تھی۔خدا اس کی مغفرت فرمائے، بڑا ذہین، بے باک اور دلچسپ شاعر تھا۔

بزم نشاط:

عامر عثمانی نے دیوبند میں ایک بزم نشاط قائم کی تھی،اس کی نشست بہت محدود تھی، صرف شعرا شریک ہوتے تھے مگر شرط یہ تھی کہ غزل تازہ سنائی جائی گے۔اور حاضری بھی ضروری تھی۔اس لیے اگر پندرہ دن میں غزل نہیں ہوتی تو مغرب سے عشا تک دو چار تک بندیا کرنی لازمی تھیں،ورنہ رسوائی ہوتی۔

اس میں عامر کے بھائی افضل صاحب بھی آتے تھے۔جاوید عثمانی آٹھ نو برس کا بچہ تھا مگر خوب پڑھتا تھا۔اور کسی نہ کسی کی غزل لا کر ضرور پڑھتا تھا۔یہی بچہ رام پور سے ایک اسلامی تحریک کا بانی بنا اور اس نے ہندی میں اسلام کو نئی زندگی دیدی۔عامر صاحب نے ایک مرتبہ روش صدیقی سے وقت لے کر ایک مشاعرہ طے کردیا اور صدارت روش صاحب کی تھی۔جوالا پوران کا وطن تھا جو دیوبند سے بہت دور نہیں تھا۔

میری عمر کا پہلا اتفاق تھا کہ میں نے کسی عوامی مشاعرے میں شعر کہے ہوں مگر اس میں میں نے غزل پڑھی اور اپنی غزل پڑھی۔جب میں نے یہ شعر پڑھا تو آواز آئی ''واہ مولانا'' اور یہ آواز صدر مشاعرہ روش صدیقی کی تھی۔میں نے عرض کیا تھا:

قفس میں بند کیا ہوتے قفس سارا چمن ہی ہے
کوئی صیاد ہے شاید لباس باغبانی میں

ایسی زوردار آواز نے مجھے داد بھی دی کہ سیاسی ماحول کی اچھی ترجمانی تھی اور خود مجھے حوصلہ بھی دیا کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔

سفر لاہور:

دارالعلوم میں امتحانات وسط شعبان تک ہو جاتے تھے مگر بخاری شریف آخر شعبان تک ختم ہوتی تھی۔ بخاری ختم کرا کے حضرت شیخ سلہٹ تشریف لے جاتے اور وہاں کی مسجد میں تراویح سنایا کرتے تھے۔ کیوں کہ سلہٹ سے آتے وقت ان لوگوں نے ۱۳۴۶ھ میں اس کا وعدہ لے لیا تھا اور شیخ اس کی پابندی فرماتے تھے۔ غالباً بنگلے والی مسجد کہلاتی تھی، میں نے وہاں ایک مرتبہ ظہر کی نماز پڑھی ہے۔

میرے لیے مشکل یہ پیش آئی کہ چند طلبہ نے تفسیر پڑھنے کے لیے مولانا احمد علی لاہوری صاحب کے یہاں لاہور جانا طے کر لیا تھا۔ وہاں داخلہ ۲۵ر شعبان سے ہوتا تھا اور ہماری بخاری ۲۷ر شعبان کو ختم ہونی تھی۔ اس لیے تردد تھا کہ کہیں داخلہ نہ بند ہو جائے۔ میں نے حضرت شیخ کے گھر پر جا کر عرض کیا کہ یہ مجبوری ہے۔ چند سطریں آپ لکھ دیں، شیخ نے فوراً کاغذ لیا اور لکھ دیا کہ ختم بخاری کی وجہ سے ذرا تاخیر سے جا رہا ہے۔

ہم طوفان میل میں شام کو بیٹھے اور صبح لاہور پہونچ گئے۔ اس وقت دیوبند سے لاہور کا کرایہ ساڑھے آٹھ روپے تھا، اور دہلی کا ساڑھے چار روپے۔ وہاں پہونچے تو سبق شروع ہو چکا تھا۔ میں نے ظہر بعد مولانا احمد علی صاحب کو خط دیدیا۔ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے کہ ’’کون لایا خط؟‘‘ میں نے جواب عرض کیا تو کہنے لگے ’’تم حضرت شیخ کا خط میرے نام لائے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ حضرت شیخ اولیاء اللہ کے امام ہیں، ان کا خط تم میرے نام لائے ہو۔‘‘ ہم سنتے رہے مولانا کا یہ تاثر اور حضرت شیخ کی عظمت کا اندازہ کرتے رہے۔ کتنے عجیب وغریب تھے حضرت شیخ، اور ان کی سادگی سے، ہم لوگ ان سے مل لیا کرتے ہیں۔ اللہ اکبر

عطاء اللہ شاہ بخاری:

اسی طرح آخر سال میں سہارن پور میں کوئی جلسہ تھا اس میں عطاء اللہ شاہ بخاری تشریف لائے تھے۔ پھر وقت نکال کر دیو بند آ گئے ،لڑکوں نے جا کر ان سے گذارش کی کہ دارالحدیث میں تقریر فرما دیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر میں ،مولوی سعید احمد سلطان پوری اور ایک آدمی، یہ تینوں شاہ صاحب کے پاس عصر کے وقت گئے ،شاہ صاحب شیخ کی مختصر مسجد میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے،ہم نے گذارش کی مگر کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور عذر یہ کیا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ جہاں حضرت شیخ موجود ہوں، وہاں عطاء اللہ کی کیا مجال ہے کہ تقریر کردے۔ ہم لوگوں نے پھر اصرار کیا تو فرمایا کہ تم سہارن پور چلو، وہاں تقریر سن لینا، دارالعلوم میں نہیں کر سکتا۔

یہ ادب اس زمانے میں ہماری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس لیے فرید الوحیدی جو میرے ساتھ ساتھ تھا اس نے بڑھ کر شاہ صاحب سے کہا کہ شاہ صاحب! آپ ہم لوگوں کا دل توڑتے ہیں،تو شاہ صاحب نے برجستہ فرمایا کہ تمہارے چھوٹے چھوٹے دل ٹوٹ گئے تو کیا ہوا، میرا دل بہت بڑا ہے۔ فرید نے دوسرا مصرع لگایا تو شاہ صاحب اچھل پڑے اور بچے کو گلے لگا لیا۔ ہم نے عرض کیا کہ یہ حضرت شیخ کا پوتا ہے فرید الوحیدی۔ اس نے شاہ صاحب سے کہا تھا کہ حضرت ہو سکتا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے دلوں میں کوئی ایسا ہو جس کا دل آپ کی طرح بڑا ہونے والا ہو، وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر شاہ صاحب تقریر کرنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے اور سہارن پور جا کر دھواں دھار تقریر فرمائی۔ یہ تھے حضرت شیخ اور یہ تھے عطاء اللہ شاہ بخاری۔

نادیۃ الاتحاد:

میں جس کمرے میں رہتا تھا وہ ۲۱/دار جدید، نادیۃ الاتحاد جیسی انجمن کا دفتر، الاتحاد رسالے کا دفتر اور مولانا صفی اللہ کا کمرہ تھا۔

نادیۃ الاتحاد کسی ضلعی یا صوبائی سطح کی انجمن نہیں تھی بلکہ بلا امتیاز ہر طبقہ کی نمائندہ تنظیم تھی اور اس کا پرچہ تھا ''اتحاد'' جس کے ایڈیٹر مولانا کفایت اللہ پرتاب گڑھی تھے۔ پھر میرا نام اس میں شامل ہو گیا تھا اور آخر میں پورا پرچہ میں ہی تیار کرنے لگا اور رواں قلم سے لکھ لیتا۔

نادیۃ الاتحاد کے روح رواں مولانا صفی اللہ گورکھ پوری تھے جو الٰہ آباد بورڈ کے تمام

امتحانات دیئے ہوئے تھے اور کامیاب تھے۔ مڈل پڑھ کر ادھر آئے تھے، اس لیے حساب کتاب سے خوب واقف تھے۔ پٹھان تھے اس لیے غصہ بہت تھا، بڑی عمر میں پڑھا تھا اس وجہ سے سوچ سمجھ بہت اچھی تھی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمی (مئو) کی خوب خدمت کی تھی اور وہ بہت مانتے تھے، اس لیے مزاج میں سنجیدگی بھی آ گئی تھی۔ پشاوریوں سے مقابلہ کرتے رہتے تھے مگر کبھی دبتے نہیں تھے۔ ایک بڑا سا چاقو ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ کمرے میں سب سے سینئر اور سب سے باوقار تھے۔

حزب اللہ:

ایک مرتبہ بخاری پڑھ کر آیا تو مولانا صفی اللہ کو دیکھا کہ کپڑے درست کر کے، ایک کاپی بغل میں دبا کر مدنی گیٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا مگر پھر پوچھا کہ آپ آدھی رات کے بعد کاپی لے کر کہاں جاتے ہیں؟ کبھی کبھی وہ مجھ کو بہت سیدھا اور شریف سمجھتے تھے، اس لیے بڑا اعتماد کرتے تھے۔ اس وجہ سے میرے احمقانہ اور بے تکے سوال کا جواب دیا تو عجیب وغریب جواب دیا۔

کہنے لگے اور راز دارانہ انداز میں کہا کہ شیخ نے ایک انجمن قائم کر رکھی ہے، اس کی میٹنگ مہینے دو مہینے میں کبھی ہوتی ہے۔ اور جب ہوتی ہے تو عیدگاہ پر ہوتی ہے۔ باہر سے کوئی خاص مہمان آتا ہے تب ضرور ہوتی ہے مگر اسی وقت اور اسی جگہ۔ اس کا نام ہے ''حزب اللہ''

یہ ہیں مولانا صفی اللہ گورکھپوری، دیوریاوی۔ جو آج بھی بحمد للہ حیات ہیں، صحت مند ہیں، اپنے گاؤں میں رہتے ہیں، ایک مدرسہ چلاتے ہیں۔ میری عمر ۷۸ر سال کی ہوگئی ہے اور وہ تقریباً ۸۵ر سال کے ہوں گے۔ ہوش وحواس درست، قویٰ کمزور، صحت بحال اور جذبات حریت پسندانہ۔

مولانا صفی اللہ:

میں نے شروع میں حزب اللہ کے بارے میں کچھ پوچھا تو کہا کہ حضرت شیخ کا راز تھا، ان کے ساتھ گیا۔ دو سال پہلے پھر میں نے پوچھا تو کہنے لگے ''سب بھول گیا کہانی، اب کچھ یاد نہیں۔''

مولانا برکت اللہ حیدرآبادی کے حقیقی چچا، حافظ نعمت اللہ حیدرآبادی کے والد ماجد اور

مولوی قاسم دیوریاوی مہتمم جامعہ مدنیہ کے عم محترم ہیں۔

اثرات:

ان کی خدمات کا یہ عالم ہے کہ تبلیغی جماعت ایک گاؤں میں گئی، وہ جاہل اجڈ پٹھانوں کا گاؤں تھا، ان لوگوں نے جماعت کو مسجد سے باہر کر دیا۔ مولانا صفی اللہ دو چار آدمیوں کو لے کر وہاں پہونچے اور گاؤں کے چودھریوں کو بلایا۔ مولانا کا نام سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے چودھریوں سے کلمہ پوچھا، معنی پوچھے، نماز کے فرائض و واجبات پوچھے اور جب جوابات الٹے سیدھے ملے تو خان بھائی نے تمام خان برادری کو خوب ہی پھٹکارا کہ تم کلمہ نہیں جانتے، اور کوئی کلمہ سکھانے آتا ہے تو اسے نکال دیتے ہو۔ بتاؤ خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟ کہاں جاؤ گے؟ حضور ﷺ کو کیا جواب دو گے؟ پھر سب نے معافی مانگی اور وہاں سے ایک جماعت نکال کر تبلیغ کے لیے لے گئے۔ یہ ہیں آج کے مولانا صفی اللہ، شیر دیوبند، اللہ تعالی ان کی عمر دراز کرے۔

یہی حزب اللہ تھی جس کے ممبران انقلابی رہنما تھے اور حضرت شیخ سے مشورے لے کر ساری دنیا میں کام کرتے تھے۔ **برد اللہ مضجعھم و نور اللہ قلوبھم**

دارالعلوم جیسی تعلیم تو دوسری جگہ بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی بھی ہے لیکن ذہنی تربیت اور اخلاقی تربیت میں اس کا امتیاز آج بھی قائم ہے۔ وہاں کا تعلیمی امتیاز تو حدیث وفقہ، منطق وفلسفہ اور عربی ادب میں تھا۔ تہذیبی امتیاز شکل وشباہت، احترام ومعقولیت میں تھا اور دینی امتیاز ذکر و شغل اور للّٰہیت وحسن سیرت میں تھا۔ اور یہ سب اس وجہ سے تھا کہ اس میں ہر قسم کے بہتر سے بہتر نمونے موجود تھے۔ چنانچہ میں نے بہت سے لڑکوں کو بدلتے دیکھا ہے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق حدیث، تفسیر، فقہ اور منطق جیسے ہر فن میں نمایاں ہونے والے افراد دیکھے ہیں اور یہ سب اساتذہ کے ساتھ مخلصانہ تعلقات کی وجہ سے ہوتا ہے۔

جذبۂ جہاد:

دارالعلوم کے طلبہ کی بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان میں علم اور عمل کے ساتھ ساتھ جہاد کا جذبہ ضرور ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں:

☆ حضرت شیخ الہند، حضرت شیخ الاسلام اور ان کے رفقا مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا منصور

عثمانی جیسے حضرات اس فضا سے اٹھے تھے اور زمانہ کی رہنمائی کر کے گئے تھے۔

☆ مولانا سعید احمد سلطان پوری ہمارے سامنے ابھرے اور اس جذبے سے اٹھے کہ ۱۹۴۲ میں شاہ گنج سے ٹونک تک ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی تھیں اور آخر تک گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک اس طرح کی کاروائیاں کرتے رہے۔

☆ مئو میں آزادی کے بعد پہلی پولیٹکل کانفرنس ہوئی، اس میں جواہر لال جیسے تمام لیڈران آئے تھے، اور جب کانفرنس کے اندر جارہے تھے تو ہمارے ایک قاسمی سلطان پوری ساتھی نے گیٹ پر روک دیا۔ لوگ ''جواہر لال، جواہر لال'' کہتے رہے مگر اس نے کہا کہ مجھے داخلے کا ٹکٹ چاہیے تو جواہر لال رک گئے۔ پیارے لال سے کہا کہ ٹکٹ لاؤ، پھر ٹکٹ دکھا کر اندر گئے اور اس قاسمی مولانا کو اپنی فرض شناسی پر بہت شاباشی دی کہ اپنا فرض اسی طرح انجام دینا چاہیے۔

☆ دارالعلوم میں عام طور سے لڑکے اجملی کیپ اس لیے پہنا کرتے تھے کہ وہ آزادی کی علامت تھی۔ اسی طرح لڑکے گاڑھا یا کھدر اس وجہ سے پہنتے تھے کہ وہ آزادی کی نشانی تھی اور مجاہدین آزادی کا لباس تھا اور اس وجہ سے کہ حضرت شیخ اسے پسند فرماتے تھے۔

شیخ کی نقل:

حضرت شیخ کو برطانوی سامراج اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتا تھا اور حضرت شیخ بھی انگریز کو سمجھتے تھے کہ مشرق وسطی اس کی وجہ سے غلام بنا ہوا ہے۔ اس لیے جب کانگریس نے انفرادی ستیہ گرہ کا پروگرام بنایا تو سرفہرست حضرت شیخ کا نام تھا۔

ایسے ہی ہم لوگ ۱۹۴۱ء میں تیار تھے کہ شیخ جیل جائیں گے تو ہم بھی چلیں گے جیل۔ چنانچہ میں نے آخر سال میں چارپائی باہر کر دی، دری کو بکس میں بند کر دیا اور چٹائی پر اس وجہ سے سونے لگا کہ جیل میں اسی طرح سونا پڑے گا۔ لیکن شیخ نے گرفتاری رمضان کے بعد دی، ہم لوگ رمضان میں لاہور چلے گئے، پھر اپنے علاقے میں چلے گئے۔ حضرت شیخ نے حسن پور مرادآباد جا کر برطانیہ کے خلاف ایک سخت تقریر فرمائی اور گرفتار ہو گئے تو مولانا فخر الدین صاحب نے آ کر درس حدیث کے فرائض انجام دیے۔ پھر حضرت شیخ غالباً ۱۹۴۶ء میں سب کے ساتھ جیل سے رہا ہوئے

اور درس گاہ کو رونق بخشی۔

☆ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ شادی ہوئی تو گھر پر بہترین کپڑے کا کرتا، پاجامہ بنایا گیا مگر میں نے یہ کہہ کر پہننے سے انکار کر دیا کہ یہ موٹا کپڑا نہیں ہے جو حضرت شیخ کا لباس ہے۔

☆ جب ۱۹۴۷ء کا انقلاب آیا اور حضرت مدنی اور مولانا آزاد نے طے کر لیا کہ ہم کو اسی ملک میں رہنا ہے تو اس خوں ریز انقلاب کا سب سے خراب اثر پنجاب، دہلی اور اتر پردیش پر پڑا۔ اس وقت مولانا حفظ الرحمان، مولانا محمد میاں، مولانا احمد سعید جیسے حضرات کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر جو علما میدان میں آئے تھے، وہ فضلائے دیوبند ہی تھے۔ جنہوں نے دارالعلوم میں رہ کر اپنے آپ کو جہاد کے لیے تیار کیا تھا اور حضرت شیخ کی جوتیاں سیدھی کر کے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔

☆ مجاہدانہ ذہنیت کی تربیت گاہ تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے بنائی تھی مگر حضرت مدنی نے اس درس گاہ کو عالمی سطح تک منظّم کر دیا تھا۔ اس لیے ان کے تربیت کردہ حضرات افریقہ، افغانستان، چین، ہندو پاکستان اور روسی مما لک میں سر سے کفن باندھ کر کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں سے دارالعلوم کے جشن صد سالہ میں ملاقات بھی ہوئی تھی اور سفر حج میں کئی افغانیوں کی زیارت ہوئی تھی جو روس سے دو بدو جنگ میں مصروف تھے اور حضرت شیخ کے صحبت یافتہ تھے۔

نادیۃ الاتحاد کا خطبۂ صدارت:

میرے کمرے کے ساتھی مولوی رشید احمد بریلوی دورہ حدیث سے فارغ ہو کر دوسرے سال فنون پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ نادیۃ الاتحاد کا سالانہ جلسہ کیا جائے اور اس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی صدارت رکھی جائے۔ چنانچہ دہلی جا کر وہ طے کر آئے اور نادیۃ الاتحاد کے اجلاس میں انہوں نے دیوبند آ کر روز دار خطبہ پڑھا۔ اس خطبے کا موضوع تھا ''دارالعلوم کا نصاب تعلیم۔''

مولانا سعید احمد اکبرآبادی نوجوان فاضل، دارالعلوم سے فارغ اور یونی ورسٹی سے ایم اے کیے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اپنا حق سمجھتے تھے کہ ہر موضوع پر آخری رائے دیا کریں۔ چنانچہ

خطبہ زوردار لکھا اور اس میں بہت اچھے اچھے مشورے بھی دیئے۔ وہ خطبہ چھپوا کر اجلاس میں تقسیم کر دیا گیا۔

ترمیم نصاب:

ترمیم نصاب کی بحث اتنی زوردار کبھی نہیں ہوئی تھی اور چوں کہ اندرون دارالعلوم کی آواز تھی اس لیے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ مگر ہم نے دیکھا کہ دارالعلوم کے سمندر میں اس پتھر سے کوئی لہر نہیں پیدا ہوئی، لیکن ہم جیسے لوگ اس حد تک سمجھے کہ ہمارے نصاب میں کوئی نقص ضرور ہے۔

حیرت اس وقت ہوئی جب مولانا اکبرآبادی دارالعلوم کی مجلس شوری کے رکن بن گئے اور برسوں رکن رہے۔ جشن صدسالہ ان کی ممبری کے زمانہ میں ہوا۔ دارالعلوم کے نظام میں ردو بدل ان کے سامنے ہوتا رہا اور پھر ترمیم واصلاح کی بحث بھی آئی لیکن مولانا اکبرآبادی، مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے اساطین دارالعلوم بھی، دارالعلوم سے نصاب نہیں بدلوا سکے۔ کیوں کہ حضرت مدنی، مولانا حبیب الرحمان اعظمی اور حضرت علامہ بلیاوی جیسے اساطین دارالعلوم سے کوئی ترمیم واصلاح کی ضرورت بھی نہیں منوا سکا۔ ترمیم کی تجویز تو کرتا.....میں نے بہت سوچا کہ ایسا کیوں ہوا؟ مگر دوٹوک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ علامہ ابراہیم صاحب کا لطیفہ ضرور سامنے آیا کہ تعلیم کے تین عناصر ہیں: (۱) طالب علم (۲) اساتذہ (۳) نصاب تعلیم۔ ہم طلبہ میں شوق نہیں پیدا کر سکتے، اساتذہ کو محنت پر آمادہ نہیں کر سکتے، اب صرف ایک نصاب تعلیم ہے جو بے حس وحرکت جانور ہے، اس کے کان اینٹھتے رہتے ہیں۔

لیکن ایک وجہ اور سامنے آتی ہے کہ ہمارے سامنے فرنگی محل، ندوۃ العلما لکھنؤ، عربک کالج دہلی اور دارالعلوم کے نصابات موجود ہیں۔ فرنگی محل کے درس نظامیہ کا محور معقولات تھا۔ اگرچہ مولانا عبدالحی صاحب نے اپنا محور حدیث وفقہ کو بنالیا تھا۔ ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم علامہ شبلی جیسے علمائے عصر نے مرتب کیا تھا تو اس کا محور عربی ادب تھا اور آج بھی ہے۔ عربک کالج دہلی کا نصاب تعلیم مخلوط قسم کا تھا اور اس کا محور تھا عصری علوم وفنون کا حاصل کرنا، اور اس کے لیے اسلامی علوم کو معاون بنانا۔ اس نصاب سے سرسید جیسے لوگ پیدا کیے گئے اور کئے جا رہے ہیں۔ مگر حسن

اتفاق کہ اسی نصاب سے مولانا قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے حضرات بھی پیدا ہوگئے۔ دارالعلوم کا نصاب تعلیم ایسا بنایا گیا کہ اس میں محور حدیث وقرآن رکھا گیا اور امام ذیلعی کی طرح تفقہ کے لیے پورے ذخیرہ احادیث کو سامنے رکھ کر درس حدیث دیا جانے لگا اور عقائد میں اشاعرہ وماتریدیہ کی تعبیریں قبول کی گئیں۔ معقولات اور دوسرے علوم کو اس حد تک سکھایا گیا جس سے فن آجائے۔ ایسے میں نہ عقائد میں کسی تبدیلی کی ضرورت تھی، نہ فقہ میں، نہ صحاح ستہ میں، اگر ضرورت محسوس ہوئی تو صرف اس کی کہ معقولات کی کتابوں کے ذخیرے میں سے کچھ کم کردیا جائے اور وہ خود کم ہوتی چلی گئیں مگر اس کمی کو ترمیم نصاب کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

اعتراف:

ہمارے نصاب میں دو باتوں کی کمی ضرور ہے اسے اکابر دارالعلوم کو محسوس کرنا چاہیے۔

☆ اول یہ کہ عقائد میں ہم ''نسفی'' اور ''تفتازانی'' کو پڑھاتے ہیں اور پورے ایشاء میں اسی طرح ہے مگر سلفیان حرم اور غیر مقلدین سعودیہ نے آج کل علامہ ابن تیمیہ اور شیخ عبدالوہاب کے نام سے جو عقائد کی کتابیں پیش کی ہیں اور جو بحثیں اٹھائی ہیں اور جتنے زور وشور سے وہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کو کافر ومشرک ثابت کرتے ہیں، اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ ہمارے طلبہ جب سعودی عرب جاتے ہیں تو ان متکلمین اسلام کو کافر ومشرک سننے کے بعد حیران رہ جاتے ہیں کہ ہم کیا کریں؟ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں حقیقت ومجاز کا قائل ہونا کفر ہے۔ قرآن واحادیث میں تاویل، ترجیح راجح اور تعبیر بدلنا کفر ہے۔ اس لیے انہیں نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ان بحثوں کے پیش نظر عقائد کی کتابیں عقیدۃ الطحاوی وغیرہ پڑھائی جائیں اور ان خرافات کے جواب دیئے جائیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔

☆ دوسرے یہ کہ اکیسویں صدی آرہی ہے، وہ قوموں کے اجتماعی مسائل کی صدی ہے، قوموں کے عروج وزوال کو محسوس کرنے کی صدی ہے۔ اس لیے قرآن کو ہم اس طرح پڑھائیں کہ اس نے اجتماعی مسائل پر جو بحث کی ہے اور قوموں کے عروج وزوال کا جو جائزہ لیا ان سب کی نشان دہی کر کے طلبہ کو مطمئن اور منظّم کرنا چاہیے کہ وہ بین الاقوامی زندگی کے مسائل میں قرآن سے استدلال کرسکیں۔

زبردست ٹھوکر:

۱۹۴۰۔۴۱ء کا دور ہندوستان کی زندگی کا عجیب دور تھا۔ایک طرف گاندھی جی کا فلسفہ چل رہا تھا ،ان کی ستیہ گرہ سے حکومتیں مرعوب ہورہی تھیں ،دوسری طرف برطانیہ کی ساری توانائیاں ہندوستان کے سامنے لرزہ براندام تھیں۔تیسری طرف مسلم لیگ علیحدہ ملک وطن کا مطالبہ کررہی تھی اور مولانا آزاد،مفتی کفایت اللہ،حضرت مدنی مشترک زندگی کے مسائل حل کرنا چاہتے تھے،تاکہ اسلامی طاقت منتشر نہ ہوجائے۔

اسی عرصے میں ایک نئی آواز اٹھ رہی تھی۔مولانا مودودی کی آواز،اس وقت مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کا ڈھانچہ نہیں کھڑا کیا تھا،البتہ ان کا ترجمان القرآن اچھا چل رہا تھا۔اجتماعی مسائل پر تبصرہ کرنا اور انہیں ایک خاص شکل میں پیش کرنا مولانا کا خاص مشن تھا۔ان کا استدلال زوردار تھا،مسائل پر نظر ہوتی تھی،زندگی پر تنقید کرنے کا ہنر جانتے تھے اور عصری سیاست میں ہلچل ڈالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔اس لیے ان کی تحریر میں خوب پڑھتا تھا،پردہ وغیرہ ان کی اچھی کتابیں تھیں۔اسی دوران ترجمان القرآن میں مولانا مودودی کی ایک تحریر دیکھی جو بعد کو کتابی شکل میں بہت مقبول ہوئی مگر مجھے وہ مضمون پڑھ کر ایک جھٹکا سا لگا بلکہ ٹھوکر سی لگی۔

مولانا نے لکھا تھا کہ زندگی کے اجتماعی مسائل کے لیے مساجد ٹریننگ ہاؤس کی طرح ہیں۔مولانا کی یہ تحریر اپنے مشن اور تحریک کے لیے موزوں تھی مگر حدیث وقرآن میں مسجد اور عبادت کی جو اہمیت ہے اس کے پیش نظر بالکل برعکس تھی کہ ”زندگی کی تحریکات اصل ہیں اور مساجد کی زندگی اس کا ایک تتمہ ہے۔“ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی مگر میں نے محسوس کیا کہ اس میں کہیں کوئی نقص ضرور ہے۔پھر اور کتابیں دیکھیں تو میرا اندیشہ بڑھتا گیا۔اور حضرت مدنی کی زندگی میں تحریکات بھی تھیں،مسجد بھی تھی،عبادت بھی تھی مگر اس طرح تھی جس طرح حدیث وقرآن میں موجود ہے کہ سیاست اصل نہیں ہے،عبادت اصل ہے،تعلق مع اللہ اصل ہے اور وہ جہاد اصغر ہے،یہ جہاد اکبر۔بہر حال مولانا مودودی کی تحریر سے میرا دل لرز گیا اور میرا وہ اطمینان ختم ہوگیا اور میں دن رات سوچتا چلا گیا۔

پھر میں ۱۹۴۱/۴۲ء میں مولانا محفوظ الرحمان کے ساتھ ان کے مدرسہ نور العلوم بہرائچ میں

بحیثیت مدرس آ گیا تو حافظ لقمان صاحب سے وہ داستان معلوم ہوئی جس میں مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھنے کے لیے علمائے اسلام کو دعوت دی تھی تو اس میں مولانا علی میاں، مولانا منظور نعمانی، مولانا محفوظ الرحمان نامی، مولانا امین احسن اصلاحی جیسے بہت سے لوگ اسلامی زندگی کا نمونہ دکھانے کے لیے جمع ہوئے تھے مگر وہاں سے مولانا مودودی فیل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر ۱۹۵۰ء میں مجھے گونڈہ آنا پڑا تو وہاں مہتمم بنا دیا گیا اور مولانا منظور نعمانی صاحب کو سرپرست۔ اس لیے سال میں کئی مرتبہ مولانا سے ملاقات ہونے لگی۔ ایک مرتبہ دارالاسلام پنجاب کا ذکر آ گیا تو مولانا نعمانی نے فرمایا:

''میرا الفرقان تو مولانا مودودی کا ترجمان تھا مگر وہاں دارالاسلام پہونچ کر مولانا کی جو نجی زندگی دیکھی تو اس میں ایک عام زندگی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ نہ تقوی، نہ امانت، نہ للّٰہیت، نہ شرعی حدود کی رعایت تھی۔ اس وجہ سے میں نے مولانا مودودی صاحب سے تخلیہ میں کچھ عرض کیا مگر کوئی اثر نہیں ہوا تو بہت خاموشی سے لوٹ آیا اور آج بھی ان کی اسلامی زندگی سے مایوس ہوں۔''

مولانا کی گفتگو ان کے اثرات اور ان کی سخت بیزاری سے میرا دل مطمئن ہو گیا کہ خدا کا شکر ہے میں جماعت سے دور ہی دور رہا ورنہ بہہ گیا ہوتا۔

کھانے کا نظم:

دارالعلوم کا دستور تھا کہ مغرب بعد کھانا تقسیم ہوتا تھا، پھر چھٹی کے بعد بارہ بجے دن میں۔ آج کل کھانا کسی قدر آسانی سے مل جاتا ہے لیکن ۱۹۴۰ء میں وہاں سخت سے سخت کشتی ہوتی تھی اور وہاں کے بانس ٹوٹتے تھے اور دنگل جم جاتا تھا تب جا کر روٹی اور دال نصیب ہوتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب پشاوری لڑکے آ جاتے اور اپنی طاقت، غصہ اور گروہ بندی کی وجہ سے سب لڑکوں پر حاوی رہتے۔

دیوبند سے آنے کے بعد مختلف مدارس میں جانے اتفاق ہوا تو دیکھا کہ وہاں کھانا تین وقت تقسیم ہوتا ہے، صبح کا ناشتہ، دوپہر اور شام کا کھانا۔ پھر جہاں جہاں میں رہا، وہاں ناشتے کا انتظام ضرور کرایا۔ کیوں کہ مجھے یاد آتا رہا ہے کہ میں دیوبند میں عشا کے وقت کھانا کھاتا تھا تو پھر

رات گزار کر صبح گزار کر جب دو پہر آتی تھی تب ایک گھونٹ پانی حلق سے اترتا تھا۔ کیوں کہ ناشتے کا نہ دارالعلوم سے انتظام تھا نہ گھر والوں کی طرف سے۔ مجبوراً آدھے دن کا روزہ رکھتے تھے تب بارہ بجے افطار کرتے تھے، خواہ جون جولائی کی گرمی ہو یا سردیوں کے دن ہوں۔ ظاہر ہے کہ روزآنہ کا فاقہ اتنا آسان نہیں ہے مگر اسے گوارہ نہ کرتے تو کرتے بھی کیا؟ جب کہ ہمارے ہی کمرے میں کئی لڑکے روزآنہ ناشتہ کرتے تھے مگر نہ انہیں کبھی محسوس ہونے دیا، نہ کسی نے کبھی کرید وغیرہ کی اور دو سال گزر گئے۔ اس لیے جس مدرسہ میں ناشتہ کا انتظام نہیں ہوتا وہاں ضرور کراتا ہوں۔ کیوں کہ تعلیم اور موسم کو روزہ کی حالت میں جھیلنا بڑا سخت مرحلہ ہے۔ دینی مدارس کو اسے محسوس کرنا چاہیے۔

ورزش:

جہاں آج کل تنور جل رہے ہیں، ۱۹۴۰ء میں ورزش گاہ تھی۔ ایک بڑی سی چہار دیواری تھی اس میں بائیں طرف اکھاڑا کھدا ہوا تھا۔ مجھے کبڈی اور اکھاڑے میں لڑنے کا بڑا شوق تھا، اس لیے وہاں جا کر تفریح کرآتا تھا۔ دارالعلوم نے وہاں ایک صاحب کو مقرر کر دیا تھا جو بنوٹ وغیرہ سکھاتے تھے مگر وہاں اس کا کوئی نظم نہیں تھا، وہ صاحب نام کے استاذ کہلاتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مدنی کو خیال آیا اور آپ نے حضرت مولانا شکراللہ صاحب مبارک پور کو لکھا کہ بنوٹ سکھانے والے دو استاذ بھیج دیں۔ مولانا شکراللہ صاحب کے بھتیجے مولوی عبدالباری دارالعلوم میں پڑھ رہے رھے۔ مولوی شمس الدین مبارک پوری میرے، ہم سبق بھی تھے اور ہم کمرہ بھی۔ جب معلوم ہوا کہ مبارک پور سے استاذ آرہے ہیں تو ہم لوگ وہاں پہونچے، دیکھا تو دو اساتذہ آئے ہیں اور خود حضرت مدنی وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ کچھ شہر کے لوگ بھی آگئے ہیں۔

اساتذہ کی جانچ کے لیے لاٹھیاں آگئی تھیں۔ گول کی لڑائی دکھانے کی فرمائش ہوئی تو استاذ بیچ میں کھڑے ہوگئے، ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا اور چاروں طرف سے لوگوں نے لاٹھیوں سے گھیر لیا تھا۔ جب سب نے بیک وقت لاٹھیاں چلائیں تو چشم زدن میں استاذ صاحب کسی کی لاٹھی کاٹ کر گول سے باہر ہوگئے۔ جب شہر کے چند لڑکوں نے استاذ پر دوبارہ حملہ کر دیا تو وہ خلاف توقع تھا مگر استاذ چالاک تھے، انہوں نے اپنی لکڑی سے اس کے ہاتھ کی لاٹھی روک کر

اپنے کو کنارہ کرلیا مگر اس کے ہاتھ میں چوٹ آ گئی۔ پھر بھی لوگوں نے ان لڑکوں کو ملامت کی کہ نمونے کا کھیل تھا، تم نے یہ کیا کر دیا؟۔

حضرت شیخ جب کتاب المغازی پڑھاتے تھے تو ہم لوگوں کو بڑی غیرت دلاتے تھے اور اس ورزش گاہ کا قیام ان کی مجاہدانہ فکر ہی کا ایک حصہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکے ورزش کر کے طاقتور ہوں۔ بنوٹ سیکھ کر دشمنوں کا مقابلہ کرسکیں اور مجاہدانہ اسپرٹ پیدا ہو۔

حضرت مدنی نے جو حزب اللہ بنا رکھی تھی، غالبًا اس کا ایک پروگرام یہ بھی تھا کہ لڑکے ورزش کریں، بنوٹ سیکھیں، تندرست ہوں۔

دیوبند سے آخری سفر شروع ہوا تو بہت سے دوست اسٹیشن آئے تھے، ریل ہمیں لے کر چلنے لگی تو دونوں طرف آنسو برس رہے تھے اور میں یہ کہتا ہوا دور تک روتا چلا گیا:

محبو! دوستو! رخصت ہیں اب ان جلوہ گاہوں سے
وہ وقت اب آ گیا چھپ جائیں گے جب ہم نگاہوں سے

خدا آباد رکھے یاد کر لینا دعاؤں میں ....اس سے زیادہ یاد نہیں رہا۔

والسلام
محمد افضال الحق جوہر قاسمی
۷/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ-۲۲/جون ۱۹۹۹ء
دارالعلوم گورکھ پور۔ یوپی

❑❑❑

یادش بخیر

استاذ العلما حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

☆ سندیلہ ہردوئی کا مشہور قصبہ ہے وہاں سے قریب ہی ایک بڑا گاؤں ہے جہاں ممبئی کے مشہور قاری معراج احمد صاحب کے نکاح میں شریک ہونے کے لیے گیا تھا۔ جمعہ کے بعد کھانا کھا کر بارات چلی تو سبھی لوگ پیدل تھے، قاضی صاحب بھی، دولہا بھی اور باراتی بھی۔قریب کے ایک گھر پہونچے، ذرا دیر میں نکاح ہوا پھر شربت آیا۔عصر کی نماز پڑھی اور بارات رخصت، نہ چائے، نہ کھانا، نہ دولہا کی سلام کرائی، نہ جوڑا نہ گھوڑا۔اتنی سادہ بارات میں شریک ہونے کا پہلا اتفاق تھا۔ خدا بھلا کرے گاؤں والا کہ انہوں نے شادی بیاہ کو اس قدر مختصر، اتنا آسان اور سستا کر دیا ہے۔ یہ تھا ''رسہی اعظم پور''۔

☆ اس طرح کا ایک واقعہ ممبئی میں دیکھا تھا۔ میں اور قاری صاحب دونوں شادی کے لیے رو کے گئے تھے۔معلوم ہوا کہ نکاح مرغی محلے کی مسجد میں ہوگا۔عصر بعد دولہا آیا، اس کے چند ساتھی آئے، نکاح ہوا اور مغرب سے پہلے سب رخصت۔ کہاں کی چائے، کیسی مٹھائی، کیسا شربت، کیسا کھانا۔عشا بعد لڑکی رخصت۔ یہ قصہ ہے شالیمار ہوٹل کے مالک کا کہ اتنا شاندار دوسرا ہوٹل نہیں ہے مگر خدا کی توفیق اور ان کی ہمت کی بات تھی کہ دولہا خوش آیا اور خوش گیا اور چند گھنٹوں میں شادی بیاہ ختم۔اللہ اکبر

☆ ممبئی گیا تو وہاں ایک بڑے تاجر کی لڑکی کا نکاح دیکھا نہیں سنا کہ لڑکے کو بلا کر نکاح پڑھا دیا اور اپنے سگے بھائی کو بھی مدعو نہیں کیا جو اتفاقاً آ گئے، آ گئے۔اور سب سے عجیب بات یہ کہ اپنی

بٹی کو اپنی گاڑی میں سوار کرکے باپ نے اس کے سسرال پہونچا دیا جیسے ام ایمن کے ذریعہ حضورﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے داماد کے گھر بھیج دیا تھا۔ یہ اس سنت کی اتباع تھی۔ خدا عمر دراز کرے شکیل بھائی کی۔ سبحان اللہ

☆ ہردوئی سے کانپور جارہا تھا، راستے میں ملاؤں آیا تو یاد آیا کہ قطب عالم شاہ فضل الرحمان گنج مرادآبادی کا تعلق اسی قصبے سے تھا۔ ساتھیوں نے خوش خبری دی کہ گنج مرادآباد بھی راستے ہی میں ہے۔ بہت خوشی ہوئی۔

حاضری:

گنج مرادآباد ایک معمولی قصبہ ہے، معمولی بازار ہے، معمولی عمارتیں اور سیدھے سادے لوگ۔ اتر کر مولانا کو پوچھا تو کسی کو معلوم نہیں تھا۔ بابا کو پوچھا تو بتایا گیا کہ قصبے سے باہر ان کی درگاہ ہے، وہاں ایک بڑی مسجد ہے، بابری مسجد کی طرح تین گنبد والی۔ سامنے چند مزارات ہیں، بائیں رہائشی کمرے ہیں اور سب بالکل ہی سنسان۔ وہاں جا کر جہاں اس ولی کامل نے برسہا برس عبادت کی تھی وہاں ہم نے بھی دو رکعت نماز پڑھی مگر مشکل یہ پیش آئی کہ قبریں کئی ہیں۔ کون کس کی ہے؟ اتنے میں آہٹ سی معلوم ہوئی، گھر کی کوئی خاتون تھیں ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے مزار کی کنجی لا کر دیدی اور بتایا کہ بیچ کی قبر حضرت مولانا کی ہے۔ حاضری دی سورہ یس پڑھی، ایصال ثواب کیا مگر ان کی عظمت واحترام اور روحانیت سے دل کانپ رہا تھا۔

درس بخاری:

صحن مسجد میں آئے تو بہت سے واقعات یاد آتے چلے گئے۔ وہ جگہ دیکھی جہاں شیخ وقت درس بخاری دیتے تھے اور اس شان سے کہ علما کی پوری جماعت میں کوئی کسی کو مولوی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کبھی کبھی اس مولوی کو چپت رسید کر دیتے جو بے سمجھے بوجھے کسی کو مولوی کہہ دیتا تھا اور سارا مجمع دم بخود رہتا تھا۔ مولوی کے معنی ''مولا والا'' بتاتے تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے اچھے شاگردوں میں تھے۔ حدیث سے ذوق تھا اس لیے ظہر بعد درس دیا کرتے تھے۔ اور جد محترم حاجی عبدالرحیم صاحب فضلی کو فیض آباد میں دیکھا کہ وہ ظہر بعد پابندی سے بخاری کا ایک دو ورق پڑھا کرتے تھے۔ صرف تبرکاً۔ پھر کتاب کو جزدان میں بند کر کے رکھ دیتے تھے اور

دوسری کتاب پڑھتے تھے۔

حدیث کی مقبولیت:

دادا میاں سے سنا تھا کہ حضرت مولانا فرمایا کرتے تھے کہ آدمی جب حدیث پڑھتا ہے تو اللہ تعالی اس کا منہ چوم لیتے ہیں۔ یہ بات اس طرح وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کو مقبولیت کی معراج حاصل ہو۔اور غالبًا مولانا کے حالات گواہی دیتے ہیں کہ وہ شیخ وقت اور مقبولیت کے اعلی مدارج پر تھے۔اسی لیے ہاتھ اٹھا کر جو دعا فرماتے تھے اسی طرح ہو بھی جاتا تھا۔

میں نے دادا میاں سے سنا تھا کہ حضرت مدنی کے والد محترم جو قریب کے قصبے بانگر مئو میں مدرس تھے۔وہ اپنے بچوں کو لے کر مولانا کی خدمت میں آئے تو شیخ وقت نے فرمایا کہ ان بچوں کو گنگوہ پہونچا دو، میں وہاں حدیث کا نور دیکھتا ہوں۔اور سید حبیب اللہ صاحب فیض آبادی نے بچوں کو گنگوہ پہونچا دیا۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو ان کی توجہات عالیہ نے دیوبند گنگوہ اور مدینہ طیبہ کی خدمت سے شیخ العرب والعجم بنا دیا (رحمہ اللہ تعالی) اتنی دوررس تھی نگاہ ان کی۔

گفتار مولانا:

صحن کے باہر وہ جگہ دیکھی جہاں کھڑے ہو کر انگریز گورنر لاٹوش نے حضرت مولانا سے عرض کیا تھا کہ دعا کیجیے ہماری حکومت ہمیشہ رہے۔تو حضرت شیخ مسجد کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے یہ درخواست سن کر اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ سلطنت کسی کے باوا کی نہیں ہے، خدا کی ہے۔ جب تک انصاف کرو گے قائم رہو گے، جب انصاف چھوڑ دو گے مٹا دیئے جاؤ گے۔اللہ اکبر

ذرا دیکھئے تو انگریز گورنر کھڑا ہے اور اس سے اتنی سخت بات کون کہہ رہا ہے۔ایک ایسا درویش جسے خدا نے قلندری تیور عطا کیے تھے۔پھر لاٹوش نے بچے کے لیے دعا کی درخواست کی اور آپ نے دعا فرما دی اور اس کی بیوی کو دوکان سے لڈو منگا کر عطا فرمایے۔پھر تو صاحب اولاد بھی ہو گیا گورنر۔

الٹی دعا:

میں مسجد کے صحن میں ٹہلتا رہا اور ماضی کے جھروکے سے حضرت مولانا کا دربار دیکھتا چلا گیا۔

یہی وہ صحن مسجد ہے جہاں غالبًا ۱۸۹۰ء میں دادا میاں نے بحیثیت تحصیل دار حاضری دی تھی اور حضرت مولانا سے تمام لوگوں کی طرح دعا کی درخواست کی کہ دعا کر دیجیے میں انچارج تحصیل دار ہوں، مستقل تحصیل دار ہو جاؤں۔ اور حضرت مولانا نے حسب معمول فرمایا کہ سب لوگ دعا کرو۔ سب نے ہاتھ اٹھا دیئے تو فرمایا ''اے اللہ! منشی عبدالرحیم کو کبھی تحصیل دار نہ بنائیو۔''

دادا میاں کہتے تھے کہ میں دعا سن کر حیران رہ گیا۔ میں جناب ڈپٹی وجیہہ الدین صاحب کے ساتھ گیا تھا، وہ بھی حیران ہو گئے کہ شیخ نے الٹی دعا کیسے کر دی؟ کیوں کر دی؟ کیا مصلحت تھی؟ کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے پوچھ سکے کہ آپ نے ایسی الٹی دعا کیوں کر دی؟ مگر اس دعا نے منشی عبدالرحیم کی کایا پلٹ دی۔ ہم نے فیض آباد میں ان کو اس وقت دیکھا ہے جب پولیس لائن کی مسجد میں بڑے سے بڑا عہدیدار آ کر دعا کرواتا تھا۔ چنانچہ سید صدیق حسن اور مسعود علی صاحب کمشنر فیض آباد کو دیکھا ہے، وہ آتے تھے اور چٹائی پر بیٹھ کر مراقبہ کرتے تھے اور ذکر اللہ کی لذت اٹھاتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

نور ایمان:

میں نے مسجد کی بائیں طرف اس کمرے کو تلاش کیا مگر وہ نئی عمارت میں چھپ گیا ہے، ملا نہیں۔ جہاں حضرت مولانا قیام فرماتے تھے۔ دادا میاں کہتے تھے کہ ایک مرتبہ طبیعت بہت الجھ گئی تو آپ کے ساتھ آپ کے کمرے میں چلا گیا۔ آپ نے پوچھا کیسے آئے؟ میں نے کہا کہ دل میں طرح طرح کے خیالات آتے رہتے ہیں، نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

مولانا اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ فرمایا آنکھیں بند کرلو، میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑی دیر میں فرمایا کہ کھول دو آنکھیں۔ میں نے کھول دیں آنکھیں اور پھر چلا آیا۔ فرمایا کہ وہ دن تھا اور آج کا دن ہے کبھی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کوئی شبہہ نہیں ہوا اور مطمئن رہا اور جو وہاں سے نکلا تو میرا دل روشن تھا۔ میں اس کی روشنی میں دور دور کی چیزیں دیکھ لیتا تھا مگر وہ کیفیت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ شاید اسی طرح کی کوئی نورانیت ہوگی جس کو پیغمبر اعظم ﷺ نے فرمایا:

فراست مومن:

''**اتقوا من فراسة المومن فانه ينظر بنور الله**''، یعنی قلب مومن جب ایمان و یقین کی کیفیت سے منور ہوجاتا ہے تو اس میں فراست ایمان پیدا ہوجاتی ہے جس سے عام لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کا لحاظ کرنے کی تاکید فرمائی ہے ''**اتقوا من فراسة المومن**'' اس مقام پر سمجھ میں آتا ہے کہ جب آدمی کا دل و دماغ مطمئن نہ ہوتو کیا کرے؟ کتاب پڑھے؟ نماز پڑھے؟ قرآن یاد کرے؟ اہل اللہ کہتے ہیں کہ احسان کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے یہ کوئی چیز کارآمد نہیں۔ اگر کارآمد ہے تو شیخ کامل کی محبت، کسی صاحب دل سے بیعت اور ذکراللہ کی مشغولیت۔ یہاں تک کہ اس کا دل خدا کی محبت سے معمور ہوجائے۔ اسی محبت سے احسان کی وہ کیفیت ہوتی ہے جسے حدیث جبریل میں حضور ﷺ نے بتایا ہے اور اہل اللہ نے اس کو عملی شکل دیدی ہے۔ اور اسی محبت کے لیے ارشاد ہے کہ ''تمہارا ایمان کامل نہیں ہوسکتا جب تک خدا اور رسول کی محبت ہر چیز سے زیادہ نہ ہوجائے حتی کہ جان مال اور اولاد سے بھی۔'' اور اس محبت کے صرف دو طریقے ہیں۔

اول انبیا یا اولیاء اللہ کی صحبت۔ دوسرا طریقہ ہے ذکراللہ کی کثرت تا آنکہ محبت پیدا ہوجائے۔ اس محبت سے فراست پیدا ہوتی، اس سے نور ایمان پیدا ہوتا ہے اور اسی سے محبوبیت جنم لیتی ہے جس کی خوش خبری قرآن نے دی ہے: ''**قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونی يحببكم الله**''

درگاہ والے:

جب ہم وہاں سے واپس ہونے لگے تو دروازہ پر آواز دے کر بلایا گیا تو کوئی پردہ نشیں عورت دروازے تک آگئیں، ان کو کنجی حوالے کی گئی اور میں نے مسماۃ سے پوچھا کہ مولانا فضل الرحمان کہاں رہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ یہی ان کا گھر ہے پھر بتایا کہ وہ کسی تقریب میں سیتاپور گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آویں تو ان سے کہنا افضال صاحب آئے تھے، امروہہ میں آپ کو پڑھایا تھا، سلام کہہ گئے ہیں۔

میں نے اس لڑکے کو دارالعلوم چلہ امروہہ میں بخاری شریف کا درس دیا تھا۔ لڑکا بہت

ہونہار اور قابل قدر تھا۔ آج بھی اس نے وہاں علم وعمل کی روشنی پھیلا رکھی ہے، اس لیے دوسری درگاہوں کی طرح وہاں خرافات نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ماشاءاللہ

شانِ الٰہی:

آج درگاہ کا سناٹا دیکھ کر اور کل اس دربار کا ہجوم سن کر باور کرنا پڑتا ہے کہ علم، فن اور مہارت پر کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ کل انہیں بزرگ سے بڑا سے بڑا عالم بزرگ آکر فیض حاصل کرتا تھا، آج چڑیا پر نہیں مارتی۔ یہ خدا کی مرضی پر ہے جسے چاہے علم سے نوازے، جسے چاہے فن دیدے اور جس سے چاہے لے لے تو واپس نہ دے۔ **له الخلق و الامر**

حضرت مولانا کے تقدس، علمیت اور احتیاط اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ غیر مقلدین کے نواب صدیق حسن صاحب اور وحید الزماں حیدر آبادی جیسے علم وفن کے ستون اور تقلید کے دشمن بھی مولانا فضل الرحمان کی روحانیت، علم وعمل اور اخلاص ومحبت کو سرمایہ آخرت سمجھتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے کہ وہ حضرت مولانا سے بیعت ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیری جیسا عالم فاضل بھی ناز کرتا تھا کہ انہوں نے حضرت مولانا کی صحبت اٹھائی ہے۔

وسعت قلب:

مولانا کی وسعت قلبی کا یہ عالم تھا کہ اور نور ایمان اس قدر روشن تھا کہ ایک عالم سے فرمادیا کہ میاں! اذان دیدو۔ وہ جانے لگے تو کشمکش میں تھے کہ احناف کی طرح اذان دوں یا غیر مقلدین کی طرح۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ جیسی چاہے اذان دیدو، اذان ہوجائے گی۔ اس پر وہ بہت پشیمان ہوئے اور اس مسجد میں ہمیشہ جیسی اذان ہوتی تھی اسی طرح کی اذان دیدی۔

قدر گوہر:

دادا میاں کہتے تھے کہ حضرت مولانا کے یہاں ایک پنجابی عالم آئے اور بیعت ہوگئے۔ مولانا نے ان کو خلافت عطا کردی اور ان کے حالات سے اس قدر خوش اور مطمئن تھے کہ خود اپنی لخت جگر کی ان سے شادی کردی۔ سبحان اللہ! مگر یہ بات گھر والوں اور خاندان والوں کو بہت گراں ہوئی۔ اس لیے حضرت کے صاحبزادے احمد میاں بہت سخت سست کہا کرتے تھے کہ معلوم نہیں کون

ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ مگر حضرت نے اس کو خلافت دیدی۔ اس بے چارے کو معلوم نہیں کہ ''قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری'' چنانچہ مولانا کے وصال کے بعد دادا میاں بہت پریشان رہے اور سالوں پریشان رہے ۔آخر ان سے خواب میں بتایا گیا کہ تم حضرت مولانا کے خلیفہ مولانا عبدالکریم صاحب کے یہاں جاؤ۔ جدمحترم گنج مرادآباد پہونچے اور سالوں کے بعد پہونچے تو حضرت مولانا کا سارا خاندان مولانا عبدالکریم صاحب سے بیزار تھا مگر جدمحترم خواب کی بشارت کے مطابق مولانا عبدالکریم صاحب کے پاس پہونچے تو انہوں نے فرمایا'' آؤ عبدالرحیم تم نے بڑا انتظار کرایا۔''

چنانچہ کچھ مہینے ساتھ رکھا، تزکیہ قلب اور مراقبہ میں جو کمی رہ گئی تھی اس کی تکمیل کرائی پھر خلافت عطا کی اور رخصت کیا۔

نورایمان:

رخصت کرتے وقت مولانا نے دو باتیں فرمائیں۔ پہلی بات یہ کہ فیض آباد جا کر کام کرنا ہے۔ چنانچہ وہ حکم کے مطابق فیض آباد پہلی بار آئے اور غالباً ۱۹۱۴ء میں آئے اور پہلے سرائے کی مسجد میں قیام کیا پھر پولیس لائن کے پاس ایک ویران مسجد کو آباد کر کے وہاں مقیم ہو گئے اور ۵۲؍ برس وہیں رہ گئے۔فیض آباد، گونڈہ، بستی، بہرائچ، بارہ بنکی، سلطان پور، پرتاب گڑھ وغیرہ کے ہزاروں افراد کی اصلاح دین ہوتی رہی اور بڑے بڑے معرکے سر کرنے پڑے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ تم کو کام تو کرنا ہے فیض آباد لیکن تمہاری قبر پورب کے کسی ضلع میں ہے۔ چنانچہ جب ضعف زیادہ ہو گیا تو ہم لوگ اعظم گڑھ گھوسی کے قریب رگھولی اپنے وطن لے آئے اور ۱۹۵۷ء میں وہیں انتقال فرمایا۔اس طرح حضرت مولانا کے خلیفہ نے جو دو پیشین گوئیاں فرمائی تھیں وہ دونوں صحیح ثابت ہوئیں لیکن خاندان والوں کو کبھی اطمینان نہیں ہوا کہ یہ بھی کوئی ہستی ہے، قابل قدر ہستی۔ اور مولانا کو بھی شکایت نہیں ہوئی کہ شیخ زادے ہیں، ان کا احترام ضروری ہے۔ یہ تھی حضرت مولانا کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ باطنی کے نتائج اور نمونے۔

❑❑❑

موضوع حیات

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہرؔ قاسمی

صبح کی چائے کا دور چل رہا تھا، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے گول دسترخوان پر ملک کے مختلف حصوں کے مہمان بیٹھے خوشی خوشی باسی روٹی اور پوربی مرچوں کا ناشتہ کررہے تھے۔ حضرت شیخ خود چائے تقسیم فرمارہے تھے جب تک برآمدے میں زوردار سلام گونجا اور اندر تشریف لانے والے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان تھے۔ ہشاش بشاش۔

مجاہد ملت نے ہنستے ہوئے اطلاع دی کہ حکومت نے آپ کو ''پدم وبھوشن'' کا خطاب دیا ہے۔ حضرت نے فرمایا یہ کیا چیز ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ سنسکرت کا کوئی لفظ ہے۔ مطلب ہے ''عزت افزائی۔'' حضرت شیخ دلچسپ گفتگو کررہے تھے مگر اس اطلاع سے سنجیدہ ہوگئے تھے۔

ہم لوگوں کو انتظار تھا کہ شیخ نے کیا جواب دیا مگر فوراً معلوم نہیں ہوسکا لیکن حضرت شیخ نے دہلی جاکر حکومت کو جو شکریہ کا خط لکھا وہ جنگ آزادی کی تاریخی دستاویز ہے۔

حضرت شیخ نے حکومت کا خطاب شکریہ کے ساتھ واپس کردیا اور اس کی تین وجہیں لکھیں۔

☆ لکھا کہ مذہب کی آزادی، وطن کی آبرومندی اور انسانی برتری حاصل کرنے کے لیے میں نے جو کچھ کیا وہ میری زندگی کا موضوع ہے اور میرا مذہبی فریضہ تھا۔ اس کا کوئی معاوضہ قبول کرنا مذہبی غیرت اور خودداری کے خلاف ہے۔ میں نے جو کچھ کیا خدا کے لیے کیا، اسی سے اجر کا امید وار ہوں۔

☆ ایک وجہ اور بھی ہے کہ میرے اسلاف حکومت وقت سے خطاب حاصل کرنے کے

خلاف تھے۔اس لیے بھی واپس کرتا ہوں۔

☆ ایک تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ ملک کی تقسیم اور تقسیم کے بعد انسانوں کی عام تباہی اور مسلمانوں کو برباد کرنے کی سازشیں ثابت کرتی ہیں کہ حکومت نااہل ہے اور کانگریس کے اصولوں کے برخلاف چل رہی ہے۔ایسے میں مجھ کو خطاب دینا ایک مذاق سے زیادہ کچھ نہیں۔اور اس کا قبول کرنا بے غیرتی کی بات ہوگی۔اس لیے واپس کرتا ہو۔

حضرت شیخ کے اصل الفاظ معلوم نہیں مگر مختلف حضرات نے جو کچھ بتایا وہ اس سے بھی سخت تھا مگر جب تک الفاظ سامنے نہ ہوں، ان کو نقل کرنا مشکل ہے۔البتہ اندازہ لگانا آسان ہے۔ تعجب ہے کہ حضرت شیخ کے مکتوبات میں اس کا کوئی ذکر نہیں، صرف اس وجہ سے کہ وہ کانگریس سرکار کے خلاف تھا اور سرکار کی ناراضگی اب مصلحت کے خلاف ہوگی۔

تحریک آزادی میں قربانیاں ہزاروں نے دیں۔ ہر فرقے کے لوگ جیل گئے، گولیاں کھائیں، جائدادوں سے محروم ہوئے مگر ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد کسی نے صدارت، کسی نے وزارت، کسی نے گورنری، کسی نے سفارت کاری جیسے معاوضے ضرور حاصل کیے اور آج تک اس کی پینشن، اس کی وجہ سے سفر وغیرہ کی سہولتوں میں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔مگر حضرت شیخ کا دل گردہ تھا کہ گیارہ برس جیلوں کی مشکلیں کاٹنے کے باوجود کسی معاوضے، کسی انعام یا کسی خطاب تک کا تصور نہیں کیا۔صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے وطن کی خدمت، اسلام کی آزادی اور مسلمانوں کی آبرومندی کو اپنی زندگی کا موضوع بنا لیا تھا اور اس موضوع کو فرض سمجھ کر اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی تھی۔اور صرف اللہ کو خوش کرنا ان کی غرض تھی دوسری کوئی غرض نہیں تھی۔

ایسے آدمی کانگریس میں یا دوسری جماعتوں میں کتنے تھے؟ اور آج کون ہے جو ملک کی، قوم کی یا مذہب کی خدمت اس جد وجہد اور اتنے خلوص سے کرتا ہو؟ آج تو ایسے کاموں کا تصور ہی مشکل ہے۔اور کسی خدمت کو بطور فرض انجام دینا ایسا جذبہ ہے جو اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب یا ازم دے بھی نہیں سکتا۔اور اسلام صرف اس وجہ سے دیتا ہے کہ اس نے آخرت کو زندگی کا موضوع بنادیا ہے، مگر تصور کی حد تک ہم بھی اسے کر سکتے ہیں لیکن زندگی میں اسے ہنسی خوشی برتنے کا کارنامہ حضرت شیخ جیسے ہی انجام دیا کرتے ہیں:

ہر ہوس نا کے نہ داند جام وسنداں باختن

حضرت شیخ کے اس خلوص کو سمجھنے کے لیے گوتم بدھ کا تصور کیجیے۔اس شہزادے نے آج سے ہزاروں برس پہلے انسانوں کو خدا سے جوڑنا اپنا موضوع بنایا تو اس طرح بنایا کہ اگر خاندان رکاوٹ بنا تو چھوڑ کر بہرائچ سے گیا چلے گئے اور راج پاٹ نے دامن کھینچا تو تاج شاہی کو ٹھوکر مار کر الگ ہو گئے حتی کہ ہندوستان کے برہمنوں نے شنکرا چاریہ کے ساتھ مل کر انہیں روکنا چاہا تو وہ کام کی دھن میں دیش چھوڑ کر باہر چلے گئے ۔ چنانچہ چین کی ایک ارب آبادی آج تک ان کی مالا جپتی ہے اور آج خود پورا بھارت اس شہزادے کی پوجا کرتا ہے۔صرف اس وجہ سے کہ اس نے ایک روحانی جذبے کو اپنی زندگی کا موضوع بنالیا تھا اور اس کے لیے اپنے تن من دھن کو نچھاور کرنا اسے آ گیا تھا۔ایسی بلند تر ہستی ،خلوص اور روحانیت کا نام ہے مہاتما گوتم بدھ۔

حضرت شیخ کے حالات سے جو لوگ واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ وہ اپنے والد سید حبیب اللہ صاحب کے ساتھ دیو بند سے مدینہ طیبہ جانے لگے تو استاذ محترم مولانا محمود حسن صاحب نے فرمایا تھا کہ ''تم ہجرت کی نیت نہ کرنا ،تم کو اسی ملک میں کام کرنا ہے۔'' دوسری بات یہ فرمائی تھی کہ ''وہاں بھی علمی مشغلہ نہ چھوڑنا۔'' حضرت شیخ جب تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے ،ذریعہ معاش کے لیے کھجوروں کی تجارت اور کتابوں کی نقل کرتے رہے مگر خدمت علم کے لیے مسجد نبوی میں درس دیا کرتے تھے۔درس بھی ایسا کہ ۱۴؍اور ۱۸؍اسباق تک ہو جاتے تھے اور ۲۴؍گھنٹے میں صرف تین گھنٹے سوتے تھے مگر اس خدمت علم کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔جو کچھ کیا لوجہ اللہ کیا موضوع زندگی بنا کر اور خدمت علم کو بطور فرض انجام دیا۔

اسی طرح جب جنگ عظیم کے وقت مولانا محمود حسن عرب میں گرفتار کر لیے گئے تو صرف استاذ کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو گرفتار کرایا اور مالٹا کی سنگین جیلوں میں برسوں مصیبتیں جھیلیں مگر ہنسی خوشی۔اور جب ۱۹۲۰ء میں ہندوستان واپس آئے تو یہاں کی تحریک آزادی میں زور وشور سے لگ گئے ۔اس حد تک کہ کراچی میں برطانوی سنگینوں کے سامنے کھڑے ہو کر سامراج کی مخالفت میں اس وقت زبان کھولی جب تحریک خلافت کا کوئی لیڈر اس کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔مگر حضرت شیخ نے مجاہدانہ تقریر کر کے مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی جی کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔انہوں

نے قدم چوم لیے۔

حضرت شیخ نے لکھا بھی ہے اور فرمایا بھی کرتے تھے کہ ہندوستان کی غلامی تمام عربی ممالک کی غلامی ہے۔اس لیے انہوں نے استخلاص وطن کے لیے جو قربانیاں دیں اس میں ممالک اسلامیہ کا بھی درد شامل تھا۔اور الجزائر،افغانستان،چین اور سمرقند و بخارا میں ایسے بہت سے شاگرد یادگار چھوڑ گئے تھے جو اپنے ملک میں اسلام کی خدمت،مسلمانوں کی سربلندی اور وطن کی آبرو کے لیے کام کررہے تھے اور آج بھی کررہے ہیں مگر ہمارا ان سے کوئی رابطہ نہیں۔

میں ۱۹۳۹ء میں دارالعلوم دیوبند گیا تھا اور اسی سال حضرت شیخ ۱۹۲۰ء کے بعد پہلی مرتبہ حج کے لیے جارہے تھے۔وہاں سے واپسی کے بعد معلوم ہوا تھا کہ مصر کی حکومت نے شیخ سے پیشکش کی تھی کہ ازہر مصر آکر حدیث کی خدمت کریں مگر شیخ نے یہ کہہ کر معذرت کردی تھی کہ مجھے ہندوستان میں رہ کر کام کرنا ہے اور جب ہندوستان چھوڑوں گا تو مدینہ طیبہ چلا جاؤں گا۔

مصر جانے کی پیش کش اس شخصیت نے شکریے کے ساتھ مسترد کردی تھی جس کو دیوبند میں صرف ۵۰۰/روپے ملا کرتے تھے جو وسیع دسترخوان کے لیے بھی ناکافی ہوتے تھے۔اس لیے برابر مقروض رہا کرتے تھے۔اور اس دعوت کو ٹھکرا دیا تھا جس کے عوض ان کو ۶۰/ہزار روپے مل سکتے تھے۔ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس وجہ سے کہ ہندوستان کی ملکی اور علمی خدمت نیز مذہبی آزادی کو وہ اپنی زندگی کا موضوع بنا چکے تھے اور اس موضوع پر کام کرکے اپنا فرض پورا کررہے تھے مگر انتہائی سادگی،انکساری کے ساتھ۔

حضرت شیخ نے ہندوستان میں جس طرح کام کیا ہے اس پر ان لوگوں کو یقین نہیں آتا جنہوں نے ان کو دیکھا نہیں ہے۔مثلاً ملتان کی ایک کانفرنس سے دہلی جارہے تھے،صبح کوٹرین سے دیوبند اتر گئے،وہاں ترمذی اور بخاری کے اسباق بارہ بجے تک پڑھائے اور ظہر بعد ہی دہلی روانہ ہوگئے،جہاں رات میں جمعیۃ علما ہند کی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا اور مولانا آزاد،مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا احمد سعید جیسے شہسواروں کے ساتھ میدان سر کرنا تھا۔دوسرا ہوتا تو دیوبند میں اتر کر آرام کرتا اور ہم جیسا ہوتا تو سیدھے دہلی چلا جاتا اور سکون سے اجلاس میں شریک ہوتا مگر حسین احمد تھے جن کا موضوع زندگی ان کی عمر اور صلاحیتوں کا ایک محبوب تھا۔ایسا محبوب

جس کے لیے اصغر نے کہا:

ترا خیال ہے ترا جمال ہے تو ہے
مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ ہوں کیا میں

اور محبت بھی ایسی ویسی نہیں، ایسی تھی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ترمذی کا سبق پڑھا رہے تھے، حدیث پر تقریر کرتے کرتے خاموش ہو جاتے، کیوں کہ نیند کا غلبہ بولنے نہیں دیتا تھا۔ ایسا بار بار ہوا تو مجبور ہو کر فرمایا کہ ''آج ۱۴/دن ہو گئے سونے کو نہیں ملا ہے، اس لیے سبق پڑھانے کے قابل نہیں رہا۔'' سبق بند کر کے گھر تشریف لے گئے تو وہاں مہمانوں کا ہجوم تھا، اس ہجوم میں بھول گئے کہ مجھے سونا ہے۔

یہ تھے شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ۔ یہ تھا اپنے موضوع سے ان کا والہانہ تعلق اور مخلصانہ محبت۔

ظاہر ہے کہ ایسے عاشق کو اگر کوئی عشق کا معاوضہ دینے لگے تو اس کے منہ پر طمانچہ رسید کر دے گا۔ اس لیے شیخ نے کانگریس حکومت کا خطاب واپس کر دیا اور ایک سخت خط لکھ کر واپس کر دیا۔ سچ کہا تھا مولانا آزاد نے جب ٹنڈن جی کو جواب دے رہے تھے کہ ''بے غرض آدمی بے پناہ ہو جاتا ہے۔''

حرفِ آخر:

۱۹۳۷ء میں کانگریس کی پہلی وزارت قائم ہوئی تھی۔ پنتھ جی چیف منسٹر تھے۔ حضرت شیخ کو معلوم ہوا کہ حکومت نے مدح صحابہ پر پابندی لگا دی ہے تو دار العلوم سے چھٹی لے کر لکھنؤ آ گئے اور یہاں ٹیلے والی مسجد پر قیام کر کے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ پھر تقریباً ایک مہینے تک گرفتاریاں دلائیں اور تحریک چلاتے رہے۔ جب پنتھ حکومت نے تین دن کے لیے مدح صحابہ کا حق تسلیم کر لیا تو تحریک واپس لے لی اور دیوبند واپس آ کر تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

سوال یہ ہے کہ جس حکومت کو اتنی قربانیاں دے کر قائم کیا تھا اسی کے خلاف محاذ آرائی کیوں کی گئی؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اس لیے کہ اتر پردیش کی حکومت نے شیعہ راجدھانی لکھنؤ میں صحابہ کرام پر تبرا کرنے کی اجازت دے کر ایک غلطی کی تھی، پھر اس سے بڑی ناانصافی یہ کر ڈالی کہ سنی مسلمان سے مدح صحابہ کا حق بھی چھین لیا تھا۔ اور جب کانگریس کی پوری تحریک آزادی انصاف اور مساوات کی خاطر لڑی گئی تو پنتھ سرکار کو انصاف کا سبق پڑھانے کے لیے اسی قسم کی گوشمالی ضروری تھی۔ اور جمعیۃ علما کے سربراہ نے گوشمالی دے کر اپنا فرض انجام دیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی حق تسلیم کر لیا گیا حضرت شیخ دیوبند واپس آ گئے۔ اگر آج حضرت شیخ حیات ہوتے تو یقیناً جیل میں ہوتے یا سرکار کے ہوش ٹھکانے لگا دیتے۔ افسوس کہ:

''از قبیلہ مجنوں کسے نماند''

❑❑❑

تجھے نہ دیکھ سکے تیرا گھر تو دیکھ آئے

استاذ العلما حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

(۱)

شوال کے وسط میں عمرہ کر کے واپس آیا تھا کہ ذی قعدہ کے آخر میں پھر سفر حج کا پروگرام بن گیا اور ایسا بن گیا کہ ایک ہی ہفتہ کے اندر تیاری کر کے جدہ پہونچ گیا۔ ۴؍ذی الحجہ کی صبح ہوئی تو ہم حرم کے روبرو مکہ میں موجود تھے۔ میں نے ایک دفعہ سر جھٹک کر اپنے وجود سے پوچھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا واقعتاً تم اللہ کے حرم میں پھر آ گئے ہو؟ میرے ہوش وحواس نے جواب دیا کہ خواب نہیں، واقعہ ہے کہ تم حرم کے پاس باب عبدالعزیز کے سامنے ہو۔

سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کس طرح ظہور پذیر ہو گیا؟ جب کہ شوال میں عمرہ کر کے جانے والے کے خواب وخیال میں بھی یہ سفر نہیں تھا۔ دل نے جواب دیا کہ تقدیر بنانے والا کوئی اور ہے تم نہیں۔ جب قسام ازل نے اذان ابراہیم کا جواب بن کر آنے کی سعادت لکھ دی تھی تو اس کی قدرت نے اسباب بھی مہیا کر دیئے اور تم آ گئے۔ گھر والے اور دوست واحباب تماشہ دیکھتے رہ گئے۔

(۲)

عرفات ایک کھلا ہوا میدان ہے، اتنا بڑا کہ بیس بائیس لاکھ انسان اس میں پہونچ گئے تھے اور پھر بھی وہ بھر نہیں سکا۔ سب سے بڑی بھیڑ جبل رحمت پر تھی۔ اس کے بعد مسجد نمرہ میں۔ مگر اصل مجمع ان کے باہر تھا۔ سر برہنہ، ایک چادر اور ایک لنگی کے سوا بدن پر کوئی کپڑا نہیں تھا اور ہر شخص

مست تھا کہ عرفات میں حاضری کی سعادت مل گئی۔اور مجھے خوشی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لباس پہن کر ان کی نقل اتارنے اور حضرت محمدﷺ اوران کے صحابہ کی نقل اتارنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ظاہر ہے،ہم حضرت ابراہیم اوراسماعیل علیہما السلام نہیں بن سکتے مگران کی نقل تو اتار ہی سکتے ہیں۔اورہم اتارنے کے لیے آ گئے تھے اور لبیک لبیک اللّٰھم لبیک کہہ کر اپنی حاضری درج کرادی تھی۔

عرفات کا وہ میدان جہاں چالیس برس تک رونے اورمعافی مانگنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تھی اور ایسی قبول ہوئی تھی کہ اگر ۹رذی الحجہ کو ظہر سے مغرب تک کوئی اس میدان میں آ کر اب بھی توبہ کرے تو رب العالمین اسے آغوش قبولیت میں اٹھا لیتے ہیں اور ایسا پاک صاف کردیتے ہیں جیسے وہ آج ہی پیدا ہوا ہو۔چنانچہ چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور ڈیڑھ ہزار برس پہلے حضرت پیغمبر آخرالزماںﷺ نے اورتب سے لاکھوں لاکھ فرزندان توحید وہاں آتے ہیں اور کھڑے کھڑے سر برہنہ دعا کرتے ہیں،توبہ کرتے ہیں،عجز و انکسار کے ساتھ روتے ہیں گڑگڑاتے ہیں کہ بارالہا!

بردرآمد بندہ بگریختہ آبروئے خود بعصیاں ریختہ

حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ جس رحمت کا نزول حضرت آدم علیہ السلام کے وقت ہوا تھا اس رحمت خصوصی کا بادل تاقیامت برستا رہے گا۔ہم اس بارش میں خدا کا شکر ہے کہ پھر نہا نہا کر آرہے ہیں۔خدا اور توفیق دے کہ دوبارہ ہم نہا سکیں اور ہمارے تمام مخلصین،محبین،اولاد،تلامذہ بھی لبیک لبیک اللّٰھم لبیک لاشریک لے لبیک کہنے کی سعادت حاصل کرسکیں۔

(۳)

حرم میں داخل ہوئے تو سامنے خانہ کعبہ منتظر کھڑا تھا،لبیک کہہ کر اس کو سلام کیا۔طواف کرکے اس سے گویا معانقہ کیا کہ طواف ہی اس کی پوری ملاقات ہوتی ہے۔تو پہلے حجر اسود کے روبرو کھڑے ہو کر اسے براہ راست سلام کیا اور اللہ کی کبریائی کے کلمات کہے۔میں سن نہیں سکا کہ حجر اسود نے سلام کا جواب کیسے دیا مگر دیا ضرور ہوگا۔کیوں کہ سرور کائناتﷺ نے فرمایا کہ حجر اسود لوگوں کو پہچان کر خدا کے سامنے گواہی دے گا کہ یہ حاضر ہوئے تھے۔ویسے وہ ایک پتھر ہے

اور بقول پیغمبرﷺ جنت کا پتھر ہے جو تعمیر کعبہ کے وقت کرین کا کام دلانے کے لیے اتارا گیا تھا۔ اس لیے اس کی مدد سے کعبہ کی اتنی لمبی چوڑی، اس قدر سر بلند عمارت بن سکی۔ مگر وہ ہمالیہ کا ٹکڑا نہیں ہے بلکہ یاقوت جنت ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا ہے ''اس کی روشنی دور سے دور تک تھی لیکن یہاں آنے کے بعد وہ بجھ گیا۔''

فرمایا کہ ''**سودته خطايا بنى آدم.**'' کہ انسانی گناہوں کو جذب کرتے رہنے کی وجہ سے گناہوں کی سیاہی نے اس پتھر کو سیاہ کر دیا ہے۔ ایسی خبیث چیز ہے گناہ اور اتنی تیز ہے اس کی سیاہی۔ پھر حضورﷺ کا ارشاد ہے ''وہ ہر کام کو دیکھتا ہے، پہچانتا ہے، وہ خدا کے سامنے گواہ ہے۔'' واللہ اعلم، وہ کیسے یہ کام کرے گا؟ مگر اصدق الصادقین کا ارشاد ہے تو ہم یقین کرتے ہیں کہ اس میں کوئی روحانیت ہے اور وہ روحانیت آج ہماری تصویر اتارتی ہے، انہیں جذب کرتی ہے۔ اور کل ہمارا البم خدا کے سامنے پیش کر دی گی۔ جیسے حضورﷺ کو درخت سلام کرتے تھے، کنکر تسبیح پڑھتے تھے۔

فرمایا ہے ''کلمہ لا الہ الا اللہ'' خدا کے سامنے گواہی دے گا تو خدا اور اس کے رسول کے نزدیک ہر چیز میں روحانیت ہے، احساس ہے اور کہنے، سننے، یاد رکھنے اور دہرانے کی صلاحیت ہے تو اگر چہ آج میری نگاہیں نہیں دیکھتی مگر واللہ وہی صحیح ہے، جو رسول اللہﷺ نے فرمایا اور قرآن نے فرمایا اور جگہ جگہ فرمایا ہے۔ پڑھئے قرآن مجید:

قرآن کہتا ہے کہ تم جس پہاڑ کو جامد سمجھتے ہو، وہ جامد نہیں، رواں دواں ہے۔

(۱) **وترى الجبال تحسبها جامدة وهى تمر مر السحاب. صنع الله الذى اتقن كل شئى.** (النمل ۸۸)

اسی طرح کنکر، پتھر، درخت، پودے اور آگ اور ہوا سب کے لیے خدا کا اعلان ہے کہ وہ بے حس و بے شعور نہیں ہیں:

(۲) **وان من شئى الا يسبح بحمده ولكن لاتفقهون تسبيحهم.** (الاسراء ۴۴)

چنانچہ حضورﷺ فرماتے ہیں: ''**احد يحبنا و نحبه.**'' (بخاری)

اور فرماتے تھے۔ بخاری میں ہے کہ: ''کلمہ لا الہ الا اللہ'' خدا کے سامنے پیش ہوگا اور خدا

سے بات کرے گا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں اس کی ہر چیز باشعور، ذی حس اور ذی عقل سمجھتے ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ جب حشر کے میدان میں آؤ گے تو تم پر ہر بات کھل جائے گی کہ حقیقت کیا تھی؟ اس کا مطلب یہ بھی ہے ہم ظاہر حال میں جس کو دیکھتے اور استعمال کرتے ہیں وہ باطن حالات کے لحاظ سے کچھ اور ہے۔ چنانچہ لیبارٹری میں ڈال کر دیکھتے ہیں تو ہر چیز کے اندر بہت سے علاج، افادات، خصوصیات اور اثرات موجود رہتے ہیں۔ جنہیں استعمال کرنے سے کمپیوٹر اور سینکڑوں الیکٹرانک چیزیں بنتی چلی جاتی ہیں۔اس سے پیغمبر اعظم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "دابة الارض" پیدا ہوگا جو لوگوں سے باتیں کرے گا اور وہ زمانہ غالباً بہت قریب ہے۔ کیوں کہ کمپیوٹر تو آج بھی بات کرتا ہے مگر دابۃ الارض اس سے بہتر ہوگا۔ ہزاروں درود و سلام ہو رسول خدا پر۔ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلم

(۴)

طواف کے بعد حطیم کے اندر آئے تو یاد آیا کہ شب معراج کی صبح کو ابوجہل اور اہلیان مکہ نے یہیں بیٹھ کر معراج والے آقا سے پوچھنا شروع کیا تھا کہ بیت المقدس میں فلاں چیز کدھر ہے اور فلاں چیز کدھر ہے؟.....اور حضور ﷺ خاموش حیران اور شرمندگی سے بیٹھے ہوئے تھے، جب تک کعبہ کی دیوار پر بیت المقدس کا پورا سین آ گیا۔اس بروقت غیبی مدد سے حضور ﷺ باغ باغ ہوگئے مگر اہلیان مکہ کو کچھ خبر نہیں تھی۔ایک سے ایک سوال کیے جا رہے تھے۔ جب حضور ﷺ نے جواب دینا شروع کیا تو مکہ کے لوگ ششدر ہوگئے کہ ہر سوال کا بالکل صحیح جواب دے رہیں۔ عجیب وغریب آدمی ہیں۔

میرا دل رکوع اور سجدہ کر رہا تھا مگر دماغ عہد رسالت کے مناظر میں گم تھا۔ جب زمزم پر پہونچے تو وہاں ایک سنگ مرمر پر لکھا ہوا ہے "زمزم" اور پورا کنواں چھت سے ڈھک گیا ہے۔ اس کے نیچے پانی ہے، اتنا پانی ہے کہ کئی کئی مشینیں نکال رہی ہیں اور مکہ سے مدینہ تک حرم کے قدم قدم پر زمزم نظر آتا ہے۔ یہ مکہ کا واحد کنواں ہے مگر اس کا پانی سارے عالم میں لے جاتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ حکومت زمزم میں سادہ پانی ملا کر سپلائی کر رہی ہے مگر زمزم کے ایک انسپکٹر نے بتلایا کہ نہیں خالص زمزم ہے۔

زمزم پہونچے تو یاد آیا کہ بارہ بجے رات کو یہیں سے جبریل آپ کو ہمراہ لے کر بیت المقدس گئے تھے۔ وہاں انبیا کی امامت کی تھی، پھر آسمانوں پر گئے تھے تو وہاں بہت سے انبیا اور ان کی امتیں نظر آئیں پھر عرش تک گئے اور صبح صادق سے پہلے واپس آ گئے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

سفر نہ دیکھ سکے رہ گذر تو دیکھ آئے

مکہ سے عرفات تک قدم قدم پر انبیا، صحابہ کرام اور حضرت ہاجرہ کی یادگاریں ہیں اور لوگ ہر یادگار سے عقیدت، محبت اور سرگرمی سے فیض اٹھاتے ہیں۔ کہیں رمل کرتے ہیں کہ صحابہ نے عمرۃ القضا میں رمل کیا تھا۔ کہیں سعی کرتے ہیں کہ حضرت ہاجرہ توکل کے باوجود اپنی ممکن کوشش بھی کرتی رہیں حتی کہ زمزم سے اللہ نے کفالت کا انتظام کر دیا۔ کہیں مقام ابراہیم پر نفلیں پڑھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک پتھر پر نقش قدم ہے۔ ایسا نقش جو کعبہ بناتے وقت ان کی مشقت اور عزم وہمت کا یادگار ہے جس کا تذکرہ قرآن میں خود اللہ نے کیا ہے: ''**واتخذوا من مقام ابراهيم مصلی**'' (البقرہ) اس لیے طواف کرنے والے وہاں سجدہ کرنے کی جگہ ضرور تلاش کرتے ہیں مگر سعودی سپاہی لوگوں کو مسلسل منتشر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں'' **كلها سواء سواء**''، حالانکہ یہ قرآن کی صراحت کے خلاف ہے اور یادگار ابراہیم سے جہل بلکہ انحراف ہے۔

(۵)

منی میں داخل ہوئے تو رمی جمار کے قریب ترکوں کی بنائی مسجد ہے جہاں حضور ﷺ نے مدینہ والے حاجیوں سے سب سے پہلی بیعت لی تھی، اور وہی بیعت مدینہ میں اسلامی عمارت کی بنیاد بن گئی تھی۔ بیعت عقبہ منی میں سب سے عظیم چیز حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی یادگار منحر ہے جہاں ہر سال لاکھوں جانور خدا کے نام پر قربان کر دیئے جاتے ہیں اور اس میں نقل اتاری جاتی ہے حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی قربانی کی، ان کی تسلیم ورضا کی اور خواب کی تصدیق کی۔ حتی کہ اس راہ میں جہاں جہاں شیطان نے قربانی میں روڑے اٹکائے تھے وہاں وہاں پتھر برسانے کی نقل اتار کر ہم حج کی تکمیل کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''ان کنکریوں سے شیطان کو سخت اذیت ہوتی ہے'' اس لیے رمی جمار واجب ہے۔ منی سے عرفات کے لیے نکلئے تو وہ مقام بھی آتا ہے جہاں ''**الم تر كيف فعل ربك باصحاب**

الفیل" والا ابرہہ دفن ہے۔ جہاں ابابیل نے اس کو اور اس کے ہاتھی کو کنکریاں مار کر بھرکس بنا دیا تھا۔ **کعصف ماکول**

حکم ہے کہ وہاں لبیک نہ کہو، صرف گذر جاؤ، وہاں آج بھی لعنت برس رہی ہے۔ حضور ﷺ کی یادگاروں میں سب سے بڑی یادگار وہ خطبہ ہے جس میں آپ نے ساری دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا تھا "**کلکم من آدم و آدم من تراب**" پھر فرمایا تھا کہ عرب کو عجم پر، گورے کو کالے پر کوئی برتری نہیں۔ اگر ہے تو صرف تقوی کی ہے۔ اور دوسری یادگار وہ عنایت، مہربانی اور اپنے فضل وکرم کی تکمیل اور اس کے اعلان کی ہے جو خدا نے کہا ہے: "**الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی.**"

(۶)

۷/ذی الحجہ سے پورا ہفتہ محبت، عقیدت بلکہ والہانہ پن سے گذرتا ہے، کسی کو اپنے آرام کی نہیں وہاں کے ارکان کی فکر رہتی ہے کہ صحیح ادا ہو، چھوٹ نہ جائے، کوتاہی نہ ہو جائے، کسی کو تکلیف نہ پہونچ جائے، کہیں بال نہ ٹوٹ جائے، کسی سے گستاخی نہ ہو جائے۔ اسی لیے ہم جیسے آدمی تھک کر چور ہو جاتے ہیں مگر شکایت نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "**الحج التح**"، حج نام ہی تھک جانے کا۔ اس لیے جب تھک جاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالی اب اسے ضرور قبول فرمائیں گے۔

عزیزم صلاح الدین کو ایک عرب ملا جو اپنے علاقے کا سب سے بڑا رئیس تھا مگر مسجد خیف کے پاس ننگے سر، دھوپ میں مصلی بچھا کر بیٹھا ہوا تھا۔ سر سے پیر تک پسینے پسینے۔ اس نے پوچھا کہ شیخ! خیمہ نہیں، چھتری نہیں، آدمی نہیں۔ آپ اس طرح دھوپ میں پھر رہے ہیں؟ شیخ کا ایمان بولا کہ آج خدا کو یہی پسند ہے۔ یہ مقام منی ہے۔ خدا اس کا جذبہ عام کر دے۔

یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ فرماتے ہیں کہ حج سر سے پاؤں تک محبت، شیفتگی اور والہانہ پن ہے۔ چنانچہ پورا ہفتہ اسی والہانہ پن میں گذر جاتا ہے پھر بھی حق نہیں ادا ہوتا تو شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ شرمندگی اس وقت بڑھ جاتی ہے جب بہت سے غریبوں کو دیکھئے کہ اک اک یادگار پر جان لڑا دیتے ہیں، صرف اس لیے کہ قبول ہو جائے، خدا راضی ہو جائے، حق ادا ہو جائے، مغفرت مل جائے۔

(۷)

اگر گھر کی قیمت پڑوسیوں کی وجہ سے ہے تو سفر کی خوبی وخرابی ساتھیوں سے ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سفر میں مولانا فضیل احمد گورکھ پوری کے تعلقات، حکیم محمد احمد صاحب قاسمی گورکھ پوری کی جد وجہد، نفیس احمد بستوی سلمہ کی بے تکاتی خدمت، فرید احمد گورکھ پوری کی بھاگ دوڑ، شعیب احمد سلمہ کا نظم وضبط مکہ مکرمہ سے جدہ تک سہولتیں پیدا کرتا رہا۔ پھر مولانا محمد شمیم صاحب مدرسہ صولتیہ کا خلوص، ڈاکٹر ابوبکر صاحب کے رسوخ اور مولوی محمد فاروق سلمہ کی محبت نے بھی مشکلات حل کردیں۔ اور یہ سب اللہ کا فضل وکرم تھا، اللہ تعالی ان سب حضرات کو جزائے خیر دے اور حسن قبول کا مقام عطا کرے۔

اس سفر کی یادگار ملاقاتیں حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری، مولانا عبداللہ صاحب بستوی، قاری خلیق اللہ صاحب بستوی، ڈاکٹر مظہر بقا صاحب جامعہ ام القری، مولانا شمشاد صاحب عطر والے، مولانا فرید احمد فیض آبادی، محترم عمر نصیف صاحب سابق جنرل سکریٹری رابطہ اسلامی جیسے حضرات سے ہوئیں۔ اور بہت سی علمی بحثیں بھی ہوئیں جن سے سفر بحمدللہ بہت کامیاب رہا۔

❑❑❑

تذکار

استاذ العلما حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی

میں ۱۹۴۱ء میں دیوبند پہونچا تو قاری اصغر علی مرحوم کے پاس اسعد میاں نحو میر پڑھا کرتے تھے اور میرا موقوف علیہ کا سال تھا۔

جب وہ دیوبند سے فارغ ہوگئے تو جمعیۃ علما اتر پردیش کے ناظم بن گئے اور انہوں نے مدرسہ فرقانیہ گونڈہ سے مجھے بلا کر اپنی مجلس عاملہ میں شامل کرلیا۔ اس کے صدر مولانا شاہد فاخری آلہ آبادی تھے۔ پھر جلد ہی اسعد میاں صاحب صدر جمعیۃ علما اتر پردیش ہوگئے پھر مرکز کے ناظم بنے اور ۱۹۶۲ء کے بعد صدر مرکزی جمعیۃ بن گئے۔ وہ مجھے اپنی مجلس عاملہ میں صوبے سے مرکز تک مدعو خصوصی کے طور پر یاد کرتے رہے۔ وہاں مولانا عبدالرؤف بریلوی، مولانا اسحاق سنبھلی اور پھر مولانا وحیدالزماں کیرانوی کا ساتھ رہا۔ ان لوگوں کے ساتھ آنے سے مسائل پر بحث ومباحثہ کا ایک طویل سلسلہ چلتا رہتا تھا اور جب تک ہم سب لوگ مطمئن نہیں ہوتے تھے، تجویز مکمل نہیں مانی جاتی تھی۔

شروع شروع میں مولانا محمد میاں صاحب جیسے اکابر کے ساتھ کام سیکھنا پڑا مگر پھر ہم لوگ ہی کام کرنے لگے حتی کہ مرکزی تجاویز مرتب کرنے لگے۔ تو فرق یہ ہوا کہ دوسرے لوگ اعتراض کرتے تھے اور ہم جواب دہ رہتے تھے مگر اس میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا تھا۔

مولانا اسعد صاحب اپنی سوجھ بوجھ، اپنی گویائی اور تحمل میں ممتاز تھے۔ اس لیے نرم گرم اپنی مجلس عاملہ کو چلاتے رہے اور صوبے سے مرکز تک پہونچ گئے۔ وہاں بھی کئی سال ہم لوگ ان کے ساتھ رہے۔

جماعت کا نظام صدارتی قسم کا ہے۔اس لیے جوصدر بن گیا وہی ناظم اعلی بنا تا ہے، وہی مجلس عاملہ نامزد کرتا ہے۔اس لیے مجلس عاملہ سے ہم چاروں دھیرے دھیرے رخصت کر دیئے گئے اور مولانا فضیل احمد قاسمی جیسے لوگ نامزد کر لیے گئے۔تیسرے یا چوتھے ٹرم میں جب وہ بھی چھوٹ گئے تو ہمارح طرح خاموش نہیں بیٹھے بلکہ دوسری مرکزی جمعیۃ علما ہند بنا کر دہلی میں شان سے بیٹھ گئے اور اپنی جمعیۃ کو آج بھی چلا رہے ہیں۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ مولانا اسعد صاحب والی جمعیۃ کے انتخابات تیسرے سال ہوتے رہتے ہیں مگر فضیل احمد صاحب والی جمعیۃ مستحکم ہے۔اس کے مرکزی انتخاب نہیں ہوتے۔ دونوں جمعیۃ دہلی کی فضا میں کام کرتی رہتی ہیں، دونوں جمعیتوں کو باہر کے ضرورت مندوں سے فرصت نہیں ملتی کہ دوسرے کام کریں۔اور صحیح بات یہ ہے کہ انہیں اپنے موضوع کا پتہ نہیں کہ جمعیت کن مقاصد سے قائم ہوئی تھی۔اس کی غرض وغایت کیا کیا تھی؟ اس لیے وہ سیاسی لائن پر کام نہ کریں تو بے چارے کیا کریں؟۔

جمعیۃ علما نے ایک مرتبہ مولانا محمد میاں صاحب کے زمانے میں تعمیری پروگرام بنایا تھا۔ اسے مولانا اسعد صاحب پوری اہمیت سے بیان کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ جماعت اس لائن پر تعمیری کام کرے۔مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے اور جماعت سیاسی چٹخارے لے کر ادھر ادھر بھٹکتی چلی گئی۔حتی کہ آج اس کے ذمہ داروں کو بھی تعمیری کام کی فکر نہیں ہے، تعمیری کام ان کی یادداشت میں بھی نہیں رہ گیا۔جمعیۃ والوں کو یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے عہد کیا تھا کہ ’’مسلمانوں کی تعمیر کے لیے کام کرے گی۔‘‘ اور کوئی یاد دلانے والا بھی نہیں رہا۔افسوس صد افسوس!

❑❑❑

ٹاڈا صاحب

خواب وخیال کا عالم ٹی وی سے زیادہ دلچسپ بلکہ عجیب عالم ہے۔ میں ادھر سے گزرا تو ایک صاحب مل گئے۔ شکل دیکھی بھالی تھی اس لیے میں نے تعارف کے لیے پوچھا:

میں: آپ کا نام؟

وہ: میرے کو ٹاڈا کہتے ہیں۔

میں: اچھا! ٹاڈا آپ ہی ہیں؟

وہ: آپ کو اس قدر حیرت کیوں ہے؟

میں: میں سمجھتا تھا کہ ٹاڈا کوئی بن مانس ہوگا مگر آپ تو بھلے مانس سے نظر آتے ہیں، اندر سے کچھ بھی ہوں۔

آخر آپ رہتے کہاں ہیں؟

وہ: میں آزاد بھارت میں رہتا ہوں۔ جہاں سینگ سمائی چلا جاتا ہوں۔

میں: کیا عمر ہوگی آپ کی؟

وہ: میری عمر ہزاروں برس کی ہوگی۔

میں: پھر آپ تھے کہاں اب تک؟

وہ: اسی آزاد ملک میں تھا، میسا میرا چھوٹا بھائی تھا، ایمرجنسی میری بہن، نادر شاہ میرا چچا تھا، دُرگا میری پھوپھی۔

میں: یہ تو پڑھے لکھے لوگوں کے نام ہیں، آج کل آپ کا پریوار کہاں ہے؟

وہ: آر ایس ایس، مسجد ڈھانے والے کارسیوک اور گجرات ہی نہیں بلکہ ممبئی پولیس بھی۔

میں: ممبئی کے دادا اور احمد آباد کے دادا کون ہیں آپ کے؟

وہ: یہ لوگ کچھ نہیں، میں سب کا دادا ہوں۔

میں: آپ کے اتنے طاقتور پریوار کے ہوتے ہوئے میسا بھائی اور ایمرجنسی بہن کہاں غائب ہوگئیں؟

وہ: کیا بتاوں! جے پرکاش کو کیا کہوں! اس نے جیل میں بیٹھ کر ان کی چتا بنائی اور آگ لگادی۔ پھر اسی اگنی میں میرا جنم ہوا۔ اس لیے نہ میں بندر سے پیدا ہوا، نہ انسان سے، ہاں آگ سے پیدا ہوا ہوں آگ سے، وہ بھی چتا کی۔

میں: مگر آپ کا مجسمہ عجیب ہے، دانت بھیڑیئے کے، ہاتھ بندر کے، لات گدھے کے، آنکھ الو کی، زبان ناگ کی، چہرہ بن مانس کا ہے۔ یہی نہیں میں دیکھ رہا ہوں کہ دل پتھر کا ہے، دماغ لوہے کا اور عقل تو ناگ پھنی ہے۔ اسی لیے آپ جدھر سے گزرتے ہیں کہرام مچ جاتا ہے۔ جج حیران ہوتے ہیں، عدالت کانپ جاتی ہے اور ہمارا دستور اپنا سر پٹکنے لگتا ہے کہ اس کی کوکھ میں کس نسل کا جانور پیدا ہو گیا ٹاڈا۔ سپریم کورٹ پریشان ہے آپ سے۔

مہاراج! یہ بتایئے جب قانونی عدالت آپ کو گھور کر دیکھتی ہے تو آپ کو شرم بھی آتی ہے کہ نہیں؟

وہ: شرم ضرور آتی ہے مگر میرا پریوار مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ میرے بغیر اس کی آمدنی اس کا رعب داب کم ہو جاتا ہے۔

میں: یہ بتایئے کہ آپ کو کسی جے پرکاش کا خطرہ تو نہیں ہے؟

وہ: اب نہیں رہا، کیوں کہ جنتا دل کو راؤ سرکار نے چت کردیا اور وی پی سنگھ کو ان کے ساتھیوں نے۔ آگے راوی چین لکھتا ہے۔

میں: آخری سوال یہ ہے کہ آپ نے جنم کہاں لیا؟

وہ: میں نے بنگال میں جنم لیا، آسام میں آنکھیں کھولیں، پنجاب میں جوان ہوا، کشمیر میں پروان چڑھا، گجرات میں پکڑا گیا، ممبئی کمبخت نے عدالت میں پہونچادیا۔ اب دیکھنا ہے کہ شرد پوار بھائی کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے میری مٹی پلید کردی، دہائی ہے چوہان اور پائلٹ کی۔

میں: آپ کے بعد آپ کا وارث کون ہوگا؟

وہ: بھگوان جانے کون ہوگا۔ ویسے ممبئی پولیس اس کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ قاتلوں اور ڈاکووں پر ہاتھ نہیں ڈالتی اور بے گناہوں سے جیل بھر دیتی ہے۔

انتخابِ نغمات:

ہر اک سو تجلّی گہِ مصطفیٰ ہے

عبادت کی دھن ہے گناہوں کا ماتم
لرزتے ہیں دل اور آنکھیں ہیں پر نم
کھڑا ہوں ترے در پہ عفو مجسم!
یہ موسم تو ہے خانہ کعبہ کا موسم
یہ موسم منانے کو جی چاہتا ہے
شکستہ دلی کاش ہوتی میسر
ہیں آنسو جہاں موتیوں کے برابر
جھکے جاتے ہیں دل جھکاتے ہوئے سر
سرک جائے یارب! گناہوں کی چادر
اسی سمت جانے کو جی چاہتا ہے
اجابت کا در جیسے کھلنے لگا ہے
جسے دیکھئے سر جھکائے کھڑا ہے
مقام براہیم وقت دعا ہے
ہر اک سو تجلّی گہ مصطفیٰ ہے
یہیں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے

❑❑❑

خرد آج تک بال و پر ڈھونڈھتی ہے

نبوت دل باخبر ڈھونڈھتی ہے
محبت گل تازہ تر ڈھونڈھتی ہے

ہوس جلوہ گاہ نظر ڈھونڈھتی ہے
سیاست سر تاجور ڈھونڈھتی ہے

خدا تیری دیدہ وری کو بڑھائے
مقامات خیرالبشر ڈھونڈھتی ہے

وہ جا کر ہو آئے عرش بریں تک
خرد آج تک بال و پر ڈھونڈھتی ہے

جو سر اپنا ساحل سے ٹکرا رہی ہے
وہ موج اپنے اندر گہر ڈھونڈھتی ہے

زمیں پر ہی ہوتی ہے معراج مومن
بس اک سجدۂ معتبر ڈھونڈھتی ہے

جنہیں سب نے مکے مدینے میں دیکھا
رسالت انہیں عرش پر ڈھونڈھتی ہے

تمام آستانوں پہ خاک اڑ رہی ہے
نظر آپ کا سنگ در ڈھونڈھتی ہے

یہ کلیوں کی رنگت وہ پھولوں کی خوشبو
ہر اک آپ کی رہ گزر ڈھونڈھتی ہے

یہ دنیا کبھی حد سے بڑھنے نہ دے گی
جو فرعون کو دار پر ڈھونڈھتی ہے

یہ رنگین دنیا مرے ساتھ آئے
اگر جلوۂ معتبر ڈھونڈھتی ہے

یہ معلوم ہے وہ نہیں مل سکیں گے
تمنا مگر دربدر ڈھونڈھتی ہے

❑❑❑

خزاں کے دن تھے مگر گئے بنام بہار
مگر یہ آتش گل! وہ بھی جھیل لی میں نے
زہے نصیب گنوائی تو زندگی جوہرؔ
مگر تبسم پنہاں میں ڈھونڈھ لی میں

سراپائے شیخ الاسلام

خوش آمدید چوں از مالٹا شہ سوارے	شعور نبوت سر تاجدارے
قدم کوہسارے زباں جوئے بارے	بیاں آبشارے حیاتش بہارے
زہے علم و دانش خوشا روزگارے	چہ ہندی نژادے ز یثرب شمارے
رخ مہر ماں دیدہ غم گسارے	شبش مرغ زارے گلش عطر پارے
ز فکر غلامی دلش داغدارے	بآزادئ ہند غیبی اشارے
باوج ولایت یکے از ہزارے	بہماں سرایش یکے خاکسارے
دعا و مناجات شب زندہ دارے	بداماں عفوش چوں امیدوارے
بہ نور الٰہی جبیں ماہ پارے	محبّ نبی سوزش دل فگارے
چوں شد در ، دیارِ حرم جلوہ بارے	حدیث محمد ازو یادگارے
گل و غنچہ و بلبل و سبزہ زارے	بہ بوئے علومش ہمہ شرمسارے
سراپا تبسم غم روزگارے	بروں سادہ لوحے دروں شاہکارے
بزندانیان کراچی نگارے	بر آزادئ ملک و ملت نثارے
زدنیا گریزاں ، بدیں دوست دارے	منور ز بوس درش سنگ پارے
چو افتاد در دامنش نابکارے	ازو رفت دامن کشاں چوں غبارے

نگاہ محبت بمنت گزارے
بدرگاہت آمد الٰہی فرارے

چوں افتادہ جوہر سر رہگذارے	چہ ما شد چوں گذرد بروشہر یارے
طفیل حسین احمد و چار یارے	برو ابر رحمت شود جلوہ بارے

اردو کی آپ بیتی

دلی کی چاندنی میں تو پھولی پھلی ہوں میں
پہچان لو کہ آج وہی لاڈلی ہوں میں
بھیجے تھے میں نے ذوق کے ہاتھوں ظفر کو پھول
سہرے میں گوندھتے ہوئے غالب گئے تھے بھول
ہندی تو میری ماں ہے ، سہیلی ہے فارسی
تلگو میری بہن ہے تو پشتو میری چچی
حافظ کی بھانجی ہوں تو ہوں خیام کی بہو
میں بیربل کی چھیڑ ہوں ملا کی گفتگو
خسرو کو بھی سکھائی تھیں میں نے پہیلیاں
اب تک ہیں ہر زبان میں میری سہیلیاں
ڈھاکہ کی ململوں سے پشاور کی آن بان
میسور کی امنگ ہوں پنجابیوں کی شان
کلیاں ہر ایک باغ سے لاتی رہی ہوں میں
پھولوں کے رس سے شہد بناتی رہی ہوں میں

(۲)

تحریک حریت مری آغوش میں پلی
اور مادری زبان مجھے بولتی رہی

سکھلا گئی ہیں مجھ کو محمد علی کی ماں
نعرے ، ترانے ، گیت ، غزل ، نظم ، لوریاں
بانوئے لکھنؤ ہوں تو شہزادیٔ نظام
نہروں کا طنطنہ ہوں خطاب ابوالکلام
حسرتؔ کی فکر نغمہ بسملؔ زبان داغؔ
شبلیؔ کا فکر و فن ہوں سلیمانؔ کا دماغ
سیدؔ کی آرزو ہوں تو اکبرؔ کی چٹکیاں
سن لو بکاؤلی سے شررؔ کی کہانیاں
تصویرِ غم اتار کے دی ہے انیسؔ نے
چکبستؔ کی نشست ہوں ملاؔ کے حاشیے
میں گفتگو ہوں میرؔ کی غالبؔ کا بانکپن
اقبالؔ کا پیام ہوں اصغرؔ کا پیرہن
میں گھن گرج ہوں جوشؔ کی سرمستیٔ جگرؔ
برجستگی فراقؔ کی مجروحؔ کی نظر
گاندھی کا فلسفہ ہوں تو زندہ ہے انقلاب
کچھ لوگ میری شان سے کھاتے ہیں پیچ و تاب
بیدیؔ کا بال و پر ہوں تراشہ ہوں فیضؔ کا
احسانؔ کا شعور ہوں مومنؔ کا قافیہ
غزلوں نے مری لوٹ لی دنیائے شاعری
چلتی ہے آج بھی لب و لہجہ کی ساحری

(۳)

معلوم کیا تھا بھائی بہن بھول جائیں گے
وعدوں کا ذکر کیا ہے قسم بھول جائیں گے

گھر میں اگر رہوں گی تو آنکھیں دکھائیں گے
مجھ کو پچاس سال تک الو بنائیں گے
زندہ ہوں اور دفن کی تیاریاں بھی ہیں
سہرا بھی ہے کفن بھی ہے عیاریاں بھی ہیں
چرچا ہے آج میرے ہی نعروں کا ہر جگہ
رکھتی ہوں تازہ سب سے محبت کا سلسلہ
نعرے دیے شعور کو سمت سفر دیا
آزاد کیا ہوئے کہ سبھی کچھ بھلا دیا
رکھتی ہوں انگلیاں جو سیاست کی نبض پر
لندن سے بھیجتی ہوں زمانہ کو ہر خبر
اک مستقل زبان ہوں شیلی نہیں ہوں میں
اس گھر کی مالکہ ہوں طفیلی نہیں ہوں میں
پھر کیوں گلہ ہے مجھ سے کہ بوئے وفا نہیں
اک درد تو ضرور ہے لیکن فغاں نہیں
دل چیر کر دکھانے کو جی چاہتا نہیں

❑❑❑

تکلم بر محل ورنہ خموشی اصل فطرت ہے
ہوا جب تک نہ چھیڑے کوئی پتہ ہل نہیں سکتا

جنگ آزادی

تاحد نظر مجبور انسانوں کا جنگل ہے
ستم کس پر نہیں ہوتا مگر ان پر مسلسل ہے
لبوں پر مسکراہٹ ہے مگر سینوں میں ہلچل ہے
ابھی جینے کے دم خم ہیں ابھی بازو میں کس بل ہے

میرا احساس مجبوری نکل جاتا تو اچھا تھا
بدل جاتیں فضائیں دل بہل جاتا تو اچھا تھا
سرشک غم کسی سانچے میں ڈھل جاتا تو اچھا تھا
خزاں کا آتشیں موسم بدل جاتا تو اچھا تھا

مصاف زندگانی ہے یہاں ماتم نہیں ہوتا
کلیجہ منہ کو آئے بھی تو دامن نم نہیں ہوتا
یہاں ہر بات ممکن ہے مگر سر خم نہیں ہوتا
لہو سے سینچنے کا ایک ہی موسم نہیں ہوتا

مجاہد کی نظر تیغ و سناں کا کام دیتی ہے
سراپا درد ہے گرتے ہوئے کو تھام لیتی ہے
دہل جاتا ہے باطل جب کوئی پیغام دیتی ہے
کہیں الزام دیتی ہے کہیں انعام دیتی ہے

ہمیشہ اہل دل اپنا جہاں تعمیر کرتے ہیں
برستی بجلیوں میں آشیاں تعمیر کرتے ہیں
عنادل کو جگا کر گلستاں تعمیر کرتے ہیں
اسی دنیا میں وہ باغ جناں تعمیر کرتے ہیں

چمن والوں میں رہیے باغباں کی آرزو بن کر
کسی کی جستجو بن کر کسی کی آبرو بن کر
لب شیریں دل درد آشنا کی گفتگو بن کر
نسیم صبح بن کر بے نیاز رنگ و بو بن کر

❑❑❑

حسن کیا ہے دل کا ذوق انتخاب
عشق کیا ہے آرزو کا پیچ و تاب
حسن ہے یا خواب کی رعنائیاں
عشق ہے یا انتظار و اضطراب

....

شمع خاموشیٔ پروانہ کو کیا سمجھے گی
خاک پروانہ میں دیکھے کوئی جلوو کی بہار

سیاست کا بہت پر پیچ ہو جانا بغاوت ہے

چمن پر آگ برسانا غلامانہ بغاوت ہے
غلامی سے مری فطرت کو شاہانہ بغاوت ہے

پگھل جاتی تھیں مری گرم رفتاری سے زنجیریں
وہی زنجیر لیکن آج کٹوانا بغاوت ہے

تمہاری راجدھانی میں لہو کے اتنے فوارے
میں باغی ہوں اگر یہ راج ٹھکرانا بغاوت ہے

بہاریں تو سبھی کو پھولنا پھلنا سکھاتی ہیں
تمہاری باغبانی تو میں روز آنہ بغاوت ہے

کوئی حد بھی تو ہوگی تیر و خنجر آزمانے کی
جدھر سے پھر گزر جائے گا دیوانہ بغاوت ہے

نکل آئے وہی رندان آزادی نکل آئے
غلامی کی زباں میں جن کا اٹھ جانا بغاوت ہے

ترانے دار تک آزادیوں کے ہم نے گائے تھے
مگر آج ان ترانوں کا بھی دہرانا بغاوت ہے

سلائیں گی ہمیں جمہوریت کی لوریاں کب تک
غلاموں کا جہاں خود دار بن جانا بغاوت ہے

اہنسا کے پجاری آستیں پر خون کیسا ہے
سیاست کا بہت پر پیچ ہو جانا بغاوت ہے

جلیں بازار تڑپیں عصمتیں ہوں بے کفن لاشیں
مگر اس جشن کی تصویر کھنچوانا بغاوت ہے

وفاداروں کو پیہم آزمانا بے وفائی ہے
جفاکاروں پہ اتنے پھول برسانا بغاوت ہے

تمہارا فن تو ہے اہل چمن کو مشتعل رکھنا
عنادل کو مگر یہ راز سمجھانا بغاوت ہے

نئی نسلوں پہ خنجر آزمائیں تو وطن پرور
تہ خنجر مگر ان کا مچل جانا بغاوت ہے

اسی مٹی سے پیدا ہوں وطن کی آبرو ہوں میں
وطن کو خاک وخوں میں ڈال کر جانا بغاوت ہے

خدا نے مجھ کو جوہؔر فطرت آزاد بخشی ہے
میں باغی ہوں اگر آزاد رہ جانا بغاوت ہے

❑❑❑

رہا چمن میں جسے انتظار ابر بہار
کلی اگر وہ کھلی بھی تو سوکھ جائے گی
چمن میں رہیۓ مگر سرو کی طرح آزاد
کہ اس کی شاخ خزاں میں بھی لہلہائے گی

کہیں نغمہ سحر ہے کہیں نالہ شبانہ

کئی بار لے چکا ہے مرا امتحاں زمانہ
کہ اٹھی ہیں برق و باراں تو بنا ہے آشیانہ

مجھے باندھ کر نہ رکھے کوئی شاخ آشیاں سے
جو چمن یوں ہی رہے گا تو جنوں کا کیا ٹھکانہ

تری آرزو تو لائی تری جستجو نے کھویا
نہ ازل سے کوئی منزل نہ ابد تک آشیانہ

ہے قفس تو پھر غنیمت کہ طلسم آشیاں ہے
کہیں نغمہ سحر ہے کہیں نالہ شبانہ

شب غم میں ضو فشاں ہیں وہی بجلیاں تمہاری
جو قفس عطا ہوا تھا وہ بنا ہے آشیانہ

❑❑❑

پھولوں کی چوٹ کھانے کو جی چاہتا نہیں

ملتا نہیں جو سب سے یہ میری خطا نہیں
پھولوں کی چوٹ کھانے کو جی چاہتا نہیں

کچھ آنسوؤں کی بات ہے کچھ دھڑکنوں کا راز
مدت ہوئی کہ اور کوئی سلسلہ نہیں

پھولوں کا اعتبار نہ کانٹوں کا اعتبار
رہنے کو اس بہار میں جی چاہتا نہیں

دل کی تڑپ کہاں سے کہاں لے اڑی مجھے
اچھا ہوا کہ اہل خرد کو پتہ نہیں

وہ میرے روبرو ہیں میں ان کی نگاہ میں
باقی ہے اک حجاب مگر فاصلہ نہیں

اہل جنوں پہ لاکھ زمانہ ہنسا کرے
ان کے لیے تو سوز دروں بے مزہ نہیں

مجنوں کے جذب شوق نے چمکا دیا اسے
لیلیٰ کو ورنہ آج کوئی جانتا نہیں

اے جذب شوق بزم خرد میں تو کچھ نہیں
سب آشنا ہیں ایک بھی درد آشنا نہیں

جوہؔر نگاہ شوق نے ان کو سجا دیا
اتنا حسیں مزاج کوئی آئینہ نہیں

❑❑❑

تھی مشت خاک زمانہ پہ چھا گئی لیکن
جو دل کو مرکز عالم بنادیا تو نے

صبا کاندھوں پہ لے کر پھر رہی ہے
کوئی جوہؔر تو ہوگا بوئے گل میں

اپنی چالوں پہ نہ اترا صیاد!
پھول کانٹوں میں ہنسا کرتے ہیں

تھی مشک خاک زمانے پہ چھا گئی لیکن
جو دل کو مرکز عالم بنادیا تونے

ساقی نامہ

حکومت عقل کی عیاشیوں کا نام ہے ساقی
ارادہ عزم منصوبہ پلاننگ خام ہے ساقی
چمن رسوا ہوا ہے ہر کلی نیلام ہے ساقی
سیاست خواہشات نفس کا اک جام ہے ساقی
کہیں الزام نیتا پر کہیں بدنام ہے ساقی

غریبی مفلسی بے روزگاری کی جفاکاری
بڑھادی کالجوں نے عصمتوں کی چور بازاری
سکھاتا ہے الیکشن مافیا کی ناز برداری
چلاتی ہے حکومت رہزنوں سے کار سرکاری
تو پھر آوارگی بھی قابل انعام ہے ساقی

خدا سمجھے حکومت یا مداری کا تماشہ ہے
سیاست کیا ہے مکاری ہے عیاری ہے جھانسہ ہے
یہ چرکیں کی غزل ہے اور سودا کا تراشہ ہے
وزارت وعدہ معشوق ہے جھوٹا دلاسہ ہے
شرافت نزع کے عالم میں صبح وشام ہے ساقی

❑❑❑

تعارف مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرا، ضلع مئو۔ یوپی

مولانا ابرار الحق صاحب قاسمی
ناظم مدرسہ ہذا

نحمده و نصلی علی رسوله الكريم اما بعد

مدرسہ سراج العلوم چھپرہ مئو کو عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ سے شرف نسبت حاصل ہے۔۱۴۲۰ھ مطابق ۲۰۰۰ء میں حضرت مولانا اور دیگر علماء کرام کے مشورے سے یہ مدرسہ قائم ہوا۔ یہ مدرسہ جس علاقے میں واقع ہے وہاں ہندوؤں کی غالب اکثریت ہے، جس کے نتیجے میں ہندوانہ تہذیب اور رسوم ورواج کا مسلمانوں پر نمایاں اثر ہے۔اس لئے اس بات کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ ایک ادارہ اس منصوبہ کے تحت قائم کیا جائے کہ علاقہ کی مختلف بستیوں اور گاؤں سے مسلمان بچوں کو لاکر دارالاقامہ میں رکھا جائے اور دینی تعلیم اور اسلامی تہذیب سے بہرہ ور کیا جائے۔ چنانچہ اس نہج پر ۱۴رسال سے یہ ادارہ چل رہا تھا اور ایک ہلکے انداز پر شاہراہ ترقی پر گامزن تھا۔

نشأة ثانیه: ۱۴۳۴ھ میں اللہ تعالی کی خصوصی رحمت اور مہربانی اس ادارہ اور علاقے کی طرف متوجہ ہوئی۔ مدرسہ کے بانی ومؤسس عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ نے رمضان ۱۴۳۴ھ میں یعنی وفات سے چند ماہ قبل اس مدرسہ میں مستقل قیام فرمایا اور یہیں مکان تعمیر کرا کے رہائش اختیار کرلی۔حضرت کے قیام کے بعد قرب وجوار کے علاوہ دور دراز سے خاصے طلبہ آ گئے، اور دین کی خدمت کا جذبہ رکھنے والے لائق اساتذہ بھی فراہم ہو گئے۔

حضرت مولانا نے یہاں آنے کے بعد ایک رسالہ بنام ''سراج الاسلام'' جاری فرمایا، جس کا ایک شمارہ ملک کے مایہ ناز عالم دین حضرت مولانا زین العابدین صاحب معروفی نوراللہ مرقدہ پر خصوصی نمبر کی صورت میں منظر عام آچکا ہے۔ اوراس کا دوسرا خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

عزائم ومنصوبے:

فی الحال ہمارے مدرسہ کا تعلیمی مرحلہ پرائمری، حفظ اور فارسی تک محدود ہے۔ ارادہ ہے کہ ان شاء اللہ آئندہ عربی کی جماعتیں عربی سوم تک قائم کی جائیں اوراس کے لئے لائق اساتذہ کی تقرری عمل میں لائی جائے۔ اس منصوبے کو مرحلۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے آپ سے دعا اورتعاون کی درخواست ہے۔

شعبۂ نشر واشاعت:

امسال مدرسہ میں ایک نئے شعبے کا قیام عمل میں آیا ہے، یعنی شعبہ نشر واشاعت۔ اس شعبے کے قائم کرنے کا مقصد حضرت مولانا کی تصانیف کی اشاعت اور تصنیفی واشاعتی تعلق سے ان کے تشنہ رہ جانے والے عزائم کی تکمیل ہے۔ چنانچہ اسی شعبہ کے تحت سراپا اعجاز: حیات وخدمات عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی صاحب نوراللہ مرقدہ کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

حضرت مولانا نے سراج الاسلام کے اداریہ میں لکھا تھا کہ ''(اس کا) تیسرا شمارہ استاذ محترم حضرت مولانا افضال الحق جوہر قاسمی علیہ الرحمہ کی یادگار میں ہوگا''، ہم نے حضرت مولانا کے اسی عزم کو پورا کرنے کے لیے ''سراج الاسلام'' کا یہ خاص شمارہ حضرت مولانا کے محسن استاذ مولانا افضال الحق جوہر قاسمی علیہ الرحمہ کی یاد میں شائع کیا ہے۔

حضرت مولانا نے ''کاروان حرم'' کے نام سے سید المجاہدین حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے سفر حج کی داستان مرتب کرنی شروع کی تھی، جو علوم ونکات جلد دوم میں شائع بھی ہوئی ہے۔ افسوس کہ اس کے مکمل ہونے سے قبل ہی حضرت مولانا کا بلاواحق جل مجدہ کی طرف سے آگیا اور یہ کام تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ حضرت مولانا کے تشنہ تصنیفی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس

کتاب کو حضرت مولانا کے چھوٹے صاحبزادے مولانا محمد عرفات اعظمی صاحب نے مکمل کردیا ہے۔ اب اس کتاب کا محض اشاعتی مرحلہ سے گزرنا باقی ہے، ان شاءاللہ جلد ہی آپ حضرات کے تعاون سے یہ کتاب شائع ہوکر منظر عام پر آجائے گی۔

اس کے علاوہ حضرت مولانا کے خطبات پر بھی کام شروع ہوگیا۔ جلد اول تقریباً نصف تیار ہوگئی ہے۔ ان شاءاللہ سات آٹھ ماہ کے اندر خطبات کی پہلی جلد بھی منظر عام پر آکر آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ اگر کسی صاحب کے پاس حضرت مولانا کی تقریر تحریری صورت میں یا ریکارڈنگ کی صورت میں موجود ہوتو تو برائے کرم حضرت مولانا کے چھوٹے صاحبزادے مولانا محمد عرفات اعظمی صاحب سے رابطہ کرکے ان کو دیدیں۔ یا اگر آپ کے علم میں کوئی صاحب ہوں جن کے پاس تقریر ہوتو ان سے ہمارا رابطہ کرادیں۔

حضرت مولانا کی کتاب ''حدیث دوستاں'' جوکہ حضرت کے خطوط کا مجموعہ ہے، اس کی دوسری جلد کی اشاعت بھی ہمارے پروگرام میں شامل ہے۔ آپ حضرات سے گزارش ہے کہ جن صاحب کے پاس حضرت مولانا کا چھوٹا یا بڑا کوئی بھی خط ہو، وہ اس خط کی اصل یا فوٹو کاپی ہمیں دینے کی زحمت کریں۔ ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کام ہونے کے بعد اصل آپ کو لوٹا دیں گے۔ یا کسی ایسے صاحب کے بارے میں آپ کو علم ہو، جن کے پاس مولانا کے خطوط ہیں تو ان کا رابطہ نمبر ہمیں دیں یا ان سے ہمارا رابطہ کرادیں۔

حضرت مولانا کا ایک اہم اور بڑا کام تسہیل الجلالین (جلالین شریف کی شرح) کا ہے اس کی ایک جلد شائع ہوچکی ہے۔ یہ کام بھی ہمارے منصوبے میں شامل ہے۔ حضرت مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد عابد اعظمی صاحب نے اس کام کو کرنے کا حوصلہ وارادہ کیا ہے۔ ان شاءاللہ جلد ہی اس کی بھی ابتدا کردی جائے گی اور تدریجاً حضرت مولانا کے انداز ونہج پر اس کو بھی مرحلہ تکمیل تک پہونچایا جائے گا۔

شعبہ نشر واشاعت کے ذمہ داروں نے یہ بھی ارادہ کیا ہے کہ حضرت مولانا کی سوانح عمری کسی صاحب قلم سے لکھوائی جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ حضرت مولانا کے شاگردوں ہی میں سے ایک صاحب علم وقلم اس کام کے لئے تیار ہوگئے ہیں۔ ابھی اس کام کی ابتدا نہیں ہوئی ہے، جلد ہی

ان شاء اللہ سوانح عمری کا کام بھی شروع ہو جائے گا، اور امید ہے کہ دو سال کے عرصے میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہونچ جائے گا۔

مزید یہ کہ حضرت مولانا کے کتابوں کے ذخیرے کو زمانہ کے دستبرد سے بچانے اور ان کی تصنیفات کے شیوع اور اس کو پائیدار بنانے کے لئے حضرت مولانا کے نام سے ایک مستقل لائبریری قائم کرنے کا ارادہ ہے۔ جس کے لئے اچھا خاصا صرفہ درکار ہے۔ آپ حضرات سے اس کی طرف توجہ اور تعاون کی درخواست ہے۔

اللہ تعالی اخلاص نیت کے ساتھ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائیں اور ہمارے عزائم کو مکمل فرمائیں اور شرف قبولیت سے نوازیں۔ اس وقت مدرسہ میں ہر طرف ضروریات ہی ضروریات ہیں۔ اہل خیر حضرات توجہ فرمائیں اور دامے، درمے، قدمے سخنے ہر ممکنہ تعاون فرما کر اجر جزیل کے مستحق ہوں۔

❑❑❑

تأثرات

مدرسہ سراج العلوم سراج نگر چھپرا مئو میں پروگرام کے کامیاب انعقاد پر مبارک باد

مدرسہ سراج العلوم میں عارف باللہ استاذ العلما حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نور اللہ مرقدہ کی یاد اور ان کی نسبت مدرسہ کے ناظم حضرت مولانا ابرار الحق قاسمی صاحب اور حضرت مولانا کے صاحبزادگان گرامی قدر بالخصوص مولانا محمد راشد اعظمی اور مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی کی مشترکہ کوششوں سے ۶ / مارچ ۲۰۱۶ء کو ایک کامیاب پروگرام کا انعقاد ہوا۔ مولانا محمد راشد اعظمی اور مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی نے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے جہاں ملک کے مختلف مقامات کا دورہ فرمایا وہیں استاذ گرامی حضرت مولانا قاری سیف الدین صاحب مدظلہ استاذ مدرسہ سراج العلوم چھپرہ کی قیادت میں ان بھائیوں نے دربھنگہ اور مدھوبنی کو بھی اپنی آمد سے شرف بخشا۔ ان مخدوم زادوں کی جہد مسلسل سے حضرت مولانا کے تلامذہ، متعلقین ومحبین پر مشتمل خالص علمی شخصیتوں اور ربانی چہروں کا اجتماع اس وادی سنسان میں بڑا روح پرور منظر پیش کررہا تھا۔ پورے ملک اور بہار کے مختلف اضلاع بطور خاص مدھوبنی اور دربھنگہ سے حضرت مولانا کے تلامذہ کی بڑی تعداد نے شرکت فرما کر اپنے تعلق کا اظہار فرمایا۔ احقر نے بھی مخدوم زادوں کے حکم کی تعمیل میں سفر سے مانع مجبوریوں کے باوجود حاضری کو اپنی سعادت سمجھا۔ چنانچہ ہم پورے قافلہ کے ساتھ جس میں اس گنہ گار کے علاوہ جناب مولانا محمد خورشید صاحب پرول پوری، جناب مولانا نجم الہدیٰ صاحب قاسمی ڈارہ مدھے پور، جناب مولانا مفتی محمد امداداللہ صاحب قاسمی بھوارہ، جناب مولانا محمد مرتضیٰ صاحب قاسمی کوتوالی چوک، جناب مولانا عباداللہ صاحب قاسمی اجرا اور حافظ محمد شمیم (شاداب) اجرا موجود تھے، پا بہ رکاب ہوئے۔ حضرت مولانا کی قبر پر ایصال ثواب کے ساتھ قدیم احباب اور اہل علم شخصیات بالخصوص حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے

صاحبزادگان مولانا محمد عابد اعظمی، مولانا محمد عامر اعظمی اور عارف بھائی سے مل کر روحانی خوشی محسوس ہوئی۔احقر کے لیے یہ بات باعث سعادت رہی کہ حضرت مولانا کی حیات وخدمات پر مشتمل مجموعہ مضامین ’’سراپا اعجاز‘‘ کے تعارف واجرا کی ذمہ داری اس کے حصے میں آئی۔کوشش ہوئی کہ کتاب کے ساتھ صاحب کتاب (حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی نوراللہ مرقدہ) کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے ساتھ اپنی عقیدت ومحبت کے اظہار کے اس موقع کوغنیمت جاننا چاہیے، شاید کسی کی دعا مل جائے۔چنانچہ حضرت مولانا کے عقیدت مندوں کے اس مجمع میں اپنے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مافی الضمیر ادا کرنے کی کوشش کی گئی، جسے مجمع نے بنظر تحسین دیکھا اور مختلف اصحاب علم نے انفرادی ملاقاتوں میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی دعاؤں سے نوازا۔حضرت مولانا مفتی تبارک حسین قاسمی خلیفہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمی اور حضرت مولانا مفتی محمد لئیق صاحب مہتمم مدرسہ دارابرار جومانے بھی اس مجمع کو اپنے خطاب سے نوازا۔ حضرت ماسٹر محمد قاسم صاحب مدظلہ کی دعا پر اس پروگرام کا اختتام ہوا۔

اس طرح حضرت مولانا کی یاد کو اپنے دامن دل میں سمیٹتا ہوا یہ قافلہ بعافیت وسہولت اپنے گھر واپس ہوا۔اس پروگرام کے کامیاب انعقاد پر ہم ناظم مدرسہ مولانا ابرارالحق صاحب قاسمی سمیت مولانا محمد راشد اعظمی صاحب اور مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی صاحب کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ باری تعالی مدرسہ کو دن دونی رات چوگنی ترقیات سے نوازے، ’’سراپا اعجاز‘‘ کو قبولیت بخشتے ہوئے حضرت مولانا کے تذکرہ کو دور تک اور دیر تک باقی رکھے۔اوران بھائیوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے، ان کی ضرورتوں کا غیب سے انتظام فرمائے اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تمام تلامذہ ومسترشدین، متعلقین ومحبین کو ایک لڑی میں پروکر ان کی دعوت وپیغام کو پوری دنیا میں پہونچانے والا اوران کے نقش قدم پر چلنے والا بنائے۔آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

خاک پائے اعجاز محمد روح اللہ قاسمی

مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ مدھوبنی بہار

❑❑❑